

خلش
محمود احمد مودی

بار اوّل ــــــــ ۲۰۰۳ء
مطبع ــــــــ یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ــــ الحرم کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ــــــــ ۱۵۰ روپے

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

پیش لفظ

کافی طویل وقفے کے بعد علی میاں پبلشرز کے توسط سے میرا کوئی ناول پیشِ خدمت ہے لیکن "دیر آید درست آید" کے مصداق میرا یہ ناول بہرحال میری پسندیدہ ترین کہانیوں میں سے ایک ہے۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ میری کہانیاں زندگی سے قریب تر ہوں۔ حقائق کی دنیا میں رہ کر لکھی گئی ہوں۔ محض خیال و خواب کی باتیں نہ ہوں کیونکہ آج کی حقیقی زندگی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ فکشن FICTION یعنی تخیلاتی تحریروں اور افسانوی ادب سے کہیں زیادہ حیران کن اور ناقابلِ یقین ہے۔

"خلش" میرا ایک معاشرتی ناول ہے۔ اس کے کردار آپ کو شاید اپنے اردگرد کہیں نہ کہیں موجود نظر آ جائیں۔ میری بیشتر کہانیوں کے کردار آپ کو جیتے جاگتے محسوس ہوتے ہوں گے اور اگر آپ ذرا گہری نظر سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں تو شاید بہت سے لوگوں کے بارے میں آپ کو شبہ ہو کہ آپ میری کہانیوں میں ان سے مل چکے ہیں۔ میں نے اپنی کہانیوں میں مقصدیت کو بھی ہمیشہ ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کردار مجھے خاص طور پر بہت اپیل کرتے ہیں جو انتہائی نامساعد حالات میں بھی حوصلہ نہیں ہارتے اور زندگی کے طوفانِ بلاخیز میں ڈوب ڈوب کر ابھرتے ہیں۔ ان کرداروں کو دیکھ کر اور ان کی کہانیاں پڑھ کر شکست خوردہ انسانوں کو نیا حوصلہ ملتا ہے۔

مجھے خود کچھ زیادہ بلند حوصلہ انسان ہونے کا دعویٰ نہیں۔ شاید اسی لئے مجھے بلند حوصلہ انسان اچھے لگتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر کمزور لوگوں کو بھی اپنے اندر مضبوطی کا احساس ابھرتا محسوس ہوتا ہے۔ موافق اور مناسب حالات میں تو سبھی پودے پروان چڑھ جاتے ہیں لیکن وہ پودے زیادہ قابلِ قدر ہوتے ہیں جو نامناسب اور ناموافق حالات میں پروان چڑھتے ہیں اور پھر بھی اپنی خوبصورتی سے دنیا کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ دوسرے کو

چھاؤں فراہم کرتے ہیں۔ "خلش" بھی دو ایسی ہی لڑکیوں کی کہانی ہے جن کے لئے زندگی سازگار نہیں تھی مگر انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ ذاتی طور پر میں تقدیر کا بہت زیادہ قائل ہوں اور یہی سمجھتا ہوں کہ جو کچھ مقدر میں لکھ دیا گیا وہ ہونا ہے' جو قسمت میں ہے وہ ملنا ہے .... اس کے باوجود میں جدوجہد کو غیر ضروری نہیں سمجھتا۔ جدوجہد زندگی کا حسن ہے اور دنیا کی یہ ساری رونق' یہ ہما ہمی' یہ گہما گہمی' اچھے اور برے ہنگامے .... یہ سب کچھ جدوجہد ہی کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔

آپ کا

محمود احمد مودی

ماہم اپنی میز پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اندر بڑے ہال میں گارمنٹ کی مشینوں کا شور برپا تھا مگر اس سے کہیں زیادہ شور ماہم کی روح میں برپا تھا۔ کبھی کبھی اسے یوں لگتا تھا جیسے یہ شور اسے پاگل کردے گا لیکن جب اس کی اذیت نقطۂ عروج پر پہنچتی تو یک لخت ہی اس کی روح کے کھنڈر میں گہرا سناٹا چھا جاتا۔ بہت دیر سے اس کے محسوسات کی دنیا میں آنکھ مچولی چل رہی تھی۔

گارمنٹ کی سینکڑوں مشینیں گو کہ اندر ایک بہت بڑے ہال میں لگی ہوئی تھیں جو ایئرکنڈیشنڈ تھا اور اس کے دروازے بند رہتے تھے۔ اس کے باوجود شور باہر دوسرے ہال میں بھی سنائی دیتا تھا اور یہ فیکٹری کا صرف ایک حصہ تھا۔ فیکٹری ایسے کئی حصوں پر مشتمل تھی جہاں مختلف اقسام کے کپڑے تیار ہوتے تھے اور انہی کی مناسبت سے انہیں مختلف حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔

وہ ملک کی سب سے بڑی گارمنٹ فیکٹری تھی اور وہاں صرف ایکسپورٹ کوالٹی کا مال تیار ہوتا تھا۔ ملک کے وہ تمام بڑے بڑے ایکسپورٹرز جو مختلف مصلحتوں کی وجہ سے اپنی فیکٹری نہیں لگاتے تھے' اسی سے مال لیتے تھے۔ کم تعداد میں مال لینے والے چھوٹے ایکسپورٹرز کو وہاں سے مال مشکل سے ہی ملتا تھا۔ فیکٹری برسوں پرانی تھی اور وقت کے ساتھ ساتھ پھیلتی چلی گئی تھی۔

ماہم اس کے صرف ایک ہی حصے میں سپروائزر تھی جہاں وہ اس وقت بیٹھی خیالوں کے خار زاروں میں بھٹک رہی تھی۔ وہ فیصلہ نہیں کرپا رہی تھی کہ اسے روشن بابا کو اپنا ہاتھ دکھانے جانا چاہئے یا نہیں؟ روشن بابا ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتاتے تھے۔ سائل کے سامنے مستقبل کا نقشہ لے آتے تھے۔ بشرطیکہ ان کا موڈ ہوتا۔

ماہم کو فکر یہ نہیں تھی کہ روشن بابا اسے قسمت کا حال بتائیں گے یا نہیں؟ اصل سوال جو اس کے سامنے سانپ کی طرح پھن پھیلائے کھڑا تھا وہ یہ تھا کہ کیا وہ واقعی قسمت کا حال جاننا چاہتی تھی؟ کیا وہ واقعی اپنے مستقبل میں جھانکنا چاہتی تھی؟

شاید یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ زندگی میں پہلے کبھی جن چیزوں پر اسے اعتبار نہیں رہا تھا' یکے بعد دیگرے رفتہ رفتہ ان سب کا عمل دخل اس کی زندگی میں ہوگیا تھا۔ کم عمری' نوخیزی اور نوجوانی میں جب اس کی ساتھی لڑکیاں نجومیوں اور پامسٹوں کو اپنا ہاتھ دکھانے کے لئے بے تاب رہتی تھیں تب بھی ماہم نے اپنا مرمریں ہاتھ کسی کے سامنے نہیں پھیلایا تھا۔ اس نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اس کے ہاتھ کی لکیروں میں کیا بھید چھپے تھے؟

وہ سوچتی تھی کہ اگر ہاتھ دیکھنے والے نے اسے کوئی بُری بات بتائی تو اس کے روز و شب خواہ مخواہ اس خوف میں گزریں گے کہ نہ جانے کب وہ بُری بات سامنے آئے؟ کب وہ حادثہ رُونما ہو؟ بالکل صحیح وقت تو کوئی بھی نہیں بتاتا نا۔ بس یہ کہہ دیا جاتا ہے' زندگی کے فلاں سال میں فلاں فلاں مہینوں میں کچھ یوں ہو سکتا ہے۔ اب پورا سال......... یا پھر کئی ماہ صبر آزما انتظار کی سولی پر لٹکے رہو۔ دھڑکتے دل کے ساتھ امید اور خوف کے دھندلکوں میں بھٹکتے رہو۔

اور اگر کوئی اچھی بات معلوم ہوگئی' کوئی خوشخبری قبل از وقت مل گئی تو تجسس ہی ختم ہو جائے گا۔ اچانک خوشی ملنے پر جو احساس ہوتا ہے کہ زندگی نے انسان کو سرپرائز دیا تھا' وہ احساس ختم ہو جائے گا۔ اس لئے جو کچھ پردے میں چھپا ہے' اس کا چھپا رہنا ہی بہتر ہے۔

یہ فیصلہ اس نے عمر کے نہ جانے کون سے حصے میں کرلیا تھا اور اب تک اس نظریے پر قائم رہی تھی۔ شاید اس وقت تو اسے صحیح طور پر عقل بھی نہیں آئی تھی۔ ذہن عقل کی طرف بھٹکا تو اسے خیال آیا کہ عقل تو شاید اسے اب بھی نہیں آئی تھی۔ اگر اسے عقل ہوتی تو کیا وہ آج زندگی کے اس خطرناک دوراہے پر کھڑی ہوتی جہاں اس کے حواس اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے' جہاں کچھ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا'

جہاں وہ خود کو ایک ننھی بچی سے بھی زیادہ بے بس محسوس کر رہی تھی۔ ماہم کی عمر جب کچھ بڑھی تھی اور شعور میں کچھ پختگی آئی تھی تو اس نے مشاہدہ کیا' سنا اور محسوس کیا کہ ہاتھ دیکھنے والے سبھی کو خوشخبریاں سناتے تھے۔ کوئی بھی تباہی کی پیش گوئی نہیں کرتا تھا حتیٰ کہ دست شناس اس انسان کو بھی زیادہ بُری خبر نہیں سناتے تھے جسے خود اپنی تباہی صاف نظر آرہی ہوتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ "کچھ پریشانی" یا "غیر متوقع تبدیلیوں" کی خبر سنائی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا اعتقاد ہی نجومیوں اور پامسٹوں سے اٹھ گیا تھا۔

مگر اب......... جبکہ وہ اٹھائیس سال کی ایک سمجھ دار اور زندگی کا خاصا تجربہ رکھنے والی لڑکی تھی تو وہ غیر معروف سے ایک دست شناس بابا کو اپنا ہاتھ دکھانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اب وہ مستقبل کے پینڈورا بکس میں جھانکنا چاہتی تھی۔ اس پردۂ غیب تک رسائی حاصل کرنا چاہتی تھی جس کے پیچھے نہ جانے کیا بھید چھپے ہوئے تھے۔ ان بھیدوں کے بارے میں وہ کچھ اندازے لگانے کی کوشش کرتی تھی تو اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگتا تھا۔

اسے خود بھی اپنے اس تغیر پر حیرت تھی کہ آخر اس کے نظریات کی عمارت میں اتنی دراڑیں کیوں پڑ گئی تھیں؟ زندگی بھر سے اس کے جو اعتقادات چلے رہے تھے' پچھلے چند برسوں میں وہ ان کے خلاف بہت کچھ کر گزری تھی لیکن یہ اس کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا تھا کہ انسان بعض ایسے کام کس طرح کر گزرتا ہے جنہیں وہ دل سے اچھا نہیں سمجھتا۔ بس وہ یہی سوچ کر رہ جاتی تھی کہ شاید انسان کے اندر کوئی اور انسان چھپا ہوتا ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے انجانی' ان دیکھی راہوں پر لے جاتا ہے۔

اپنے خیالات کے بھنور میں وہ کچھ اس طرح چکرا رہی تھی کہ گردوپیش سے بے خبر ہوگئی تھی۔ وہ اس وقت چونکی جب باوردی آفس بوائے نے چائے کا کپ لاکر کھٹ سے اس کی میز پر رکھا اور آگے بڑھ گیا۔ ماہم نے سر اٹھا کر گہری سانس لی اور چور سی نظروں سے ارد گرد دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے اسے اندیشہ سا محسوس ہوا تھا جیسے آس پاس موجود کسی فرد نے اس کے ذہن میں جھانک کر اس کے خیالات کو پڑھ لیا ہو۔

اس سے ذرا ہی فاصلے پر بیٹھی عالیہ پُرخیال سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی

تھی۔ عالیہ اس شعبے میں چیکر تھی۔ اس کی میز در حقیقت میز نہیں‘ ایک قسم کا صاف ستھرا اور ہموار سا پلیٹ فارم تھا جس پر تیار شدہ گارمنٹس کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں وقفے وقفے سے آکر لگتی رہتی تھیں۔

عالیہ ایک ایک کپڑا اٹھا کر نہایت ماہرانہ انداز میں اُلٹ پلٹ کر ایک خاص ترتیب سے دیکھتی تھی اور اپنی قریبی بیلٹ پر پھینک دیتی تھی۔ چوڑی سی یہ بیلٹ در حقیقت ایئرپورٹ وغیرہ پر لگی ہوئی کنویئر بیلٹ سے مشابہ تھی جو سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے کام آتی تھی۔

عالیہ ایک ایک گارمنٹ چیک کر کے بیلٹ پر ڈالتی رہتی تھی۔ ایک مخصوص وقفے کے بعد بیلٹ حرکت میں آتی تھی اور چیک شدہ مال پیکنگ ڈیپارٹمنٹ میں پہنچ جاتا تھا جہاں لڑکیاں مشینوں اور ہاتھوں کی مدد سے کھٹا کھٹ اس کی پیکنگ شروع کر دیتی تھیں۔

عالیہ ایک ماہر چیکر نظر آتی تھی لیکن یہ مہارت اس نے یہیں آکر حاصل کی تھی۔ اس میں سیکھنے کا جذبہ بھی تھا اور صلاحیت بھی۔ وہ یہاں آکر ہیلپر کے طور پر ملازم ہوئی تھی لیکن چند دنوں میں اس نے چیکنگ کا کام خود بخود ہی بہت بہتر طور پر سیکھ لیا تھا اور اس کی درخواست پر اسے چیکر لگا دیا گیا تھا جس سے اس کی تنخواہ میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ چیکر کی ملازمت بھی اس کے شایانِ شان نہیں تھی۔ وہ ماہم سے زیادہ پڑھی لکھی تھی لیکن عہدے کے لحاظ سے اب بھی ماہم کی ماتحت تھی۔ ماہم نے لشتم پشتم بی‘ اے کیا تھا۔ وہ بھی صرف اپنے دل کے اطمینان کے لئے۔ ورنہ اس نوکری میں تو اسے اس ڈگری کی بھی ضرورت نہیں تھی چونکہ............ وہ بہت سینئر تھی‘ ہر شعبے کے کام کو بہت اچھی طرح سمجھتی تھی اس لئے سپروائزر بن چکی تھی۔ اس نے اسٹچنگ سے کام کا آغاز کیا تھا۔

ادھر عالیہ بیچاری ماس کمیونی کیشنز میں ایم‘ اے کر کے آئی تھی اور گارمنٹ فیکٹری میں چیکر لگی ہوئی تھی۔ اس کے اپنے محسوسات تو نہ جانے کیا تھے لیکن خود ماہم کو اس کے بارے میں سوچ کر شرم سی آتی تھی۔ اس سے زیادہ پڑھی لکھی لڑکی‘ ماسٹرز ڈگری رکھنے والی اس کی ماتحت کے طور پر کام کر رہی تھی۔

خود ماہم کو اپنی پوزیشن کچھ ایسی زیادہ قابلِ رشک نہیں لگتی تھی چہ جائیکہ وہ عالیہ کو چیکر کے طور پر کام کرتے دیکھتی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید احساسِ کمتری کا شکار ہو کر عالیہ پر زیادہ افسری جھاڑتی‘ اس کی ڈگری کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتی لیکن ماہم ایک کشادہ ذہن لڑکی تھی۔ اس کے ذہن کے کسی کونے کھدرے میں اس قسم کا احساسِ کمتری نہیں کلبلاتا تھا۔ اس نے عالیہ کو اس سے پہلے آنے والی چیکر لڑکیوں سے زیادہ عزت دی تھی۔

عالیہ کے ساتھ اس کا رویہ معذرت خواہانہ سا ہوتا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ پرسنل منیجر نے بھی عالیہ کو معذرت خواہانہ سے ہی انداز میں چند ماہ قبل یہاں رکھا تھا۔ عالیہ نے اشارتاً بتا دیا تھا کہ اس کی کوئی مجبوری تھی‘ کچھ گھریلو مسائل تھے اور اسے فوری ملازمت کی ضرورت تھی۔ وہ کچھ عرصہ بھی انتظار کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی اور فیکٹری میں ایسی کوئی جگہ خالی نہیں تھی جو اس کے لئے موزوں ہوتی۔

اس فیکٹری میں شاذ و نادر ہی جگہ خالی ہوتی تھی۔ بہت کم ہی کوئی نوکری چھوڑ کر جاتا تھا اور کافی عرصے سے اس میں مزید توسیع کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ پرسنل منیجر نے گویا ڈرتے ڈرتے عالیہ کو بتایا تھا کہ ان کے ہاں زیادہ سے زیادہ ایک ہیلپر لڑکی کو ایڈجسٹ کرنے کی گنجائش ہے لیکن اس کی بھی تنخواہ معقول ہے۔ عالیہ نے کچھ اس طرح بے تابی سے اس ملازمت کو قبول کیا تھا جیسے کسی ڈوبتے ہوئے انسان کو شکستہ جہاز کا کوئی تختہ میسر آ گیا ہو۔

وہ یقیناً ضرورت مند اور مجبور تھی لیکن ماہم نے اس سے بے تکلفی اور اچھی خاصی دوستی ہو جانے کے باوجود کبھی اسے اس سلسلے میں کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے احساس تھا کہ ہر انسان اپنی زندگی کے کچھ نہ کچھ گوشوں پر پردہ ہی ڈالے رکھنا پسند کرتا ہے۔ خواہ مخواہ ان پردوں کو اٹھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے............ ہاں اگر کوئی خود آپ کو اپنی ذاتیات میں شریک کرنا چاہے تو بات دوسری ہے۔

اسی لمحے اچانک اندر ہال میں مشینوں کا شور تھم گیا اور تب ماہم کو احساس ہوا کہ در حقیقت پندرہ منٹ کا ”ٹی بریک“ ہو چکا تھا۔ اندر مشینوں پر کام کرتے ہوئے کاریگروں

نے بھی چائے کے وقفے کے لئے مشینیں روک دی تھیں۔ اس کے اپنے ہال میں گو کہ چند ہی کارکن لڑکیاں اور دو تین مرد موجود ہوتے تھے مگر ٹی بریک ہوتے ہی باتوں کی بھنبھناہٹ شروع ہو چکی تھی۔

عالیہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک ایک سادہ سی لڑکی تھی۔ اس کے لباس، سراپا اور شخصیت.......... ہر چیز سے سادگی جھلکتی تھی۔ یہ سادگی کچھ اس قسم کی تھی جس کی وجہ سے شخصیت بے کیف سی دکھائی دیتی ہے۔ عمر میں وہ ماہم سے چھوٹی ہی تھی لیکن اس کے وجود پر گویا لمحوں کی برف باری کچھ زیادہ ہی ہوتی رہی تھی۔

ایک عجیب سی یخ بستگی تھی اُس کے سراپا میں..........!

شاید اسی ٹھہراؤ، اسی یخ بستگی کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کچھ بڑی بڑی سی دکھائی دیتی تھی۔ بیچ میں سے مانگ نکال کر، بالوں کو پیچھے کی طرف کھینچ کر سیدھی چٹیا بناتی تھی اور میک اپ کرنا تو درکنار کبھی لپ اسٹک تک نہیں لگاتی تھی۔ وہ یونیورسٹی سے نئی نئی نکلنے والی کسی لڑکی کے بجائے کوئی مفکر یا دانش ور دکھائی دیتی تھی جس کے بال شاید اس کی لاعلمی میں کسی نے سیاہ رنگ دیئے تھے۔

شروع شروع میں تو ماہم کو دل ہی دل میں اس پر ترس بھی آیا تھا۔ آج کل تو وہ خود اپنے آپ پر ترس کھانے میں مصروف تھی اس لئے اسے کسی اور پر ترس کھانے کا خیال نہیں آتا تھا لیکن جن دنوں عالیہ نئی نئی آئی تھی، ماہم اس کے مقابلے میں واقعی خود کو ملکۂ حُسن محسوس کرتی تھی۔ خود پرستی سے قطع نظر ماہم کا شمار خوبصورت لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ بچپن سے وہ اپنی شکل صورت کے بارے میں تعریفیں سنتی آئی تھی لیکن کبھی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوئی تھی۔

اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ محض خوبصورتی اس کی تقدیر بدل سکتی تھی۔ محض حُسن سے اس کے حالات تبدیل ہو سکتے تھے۔ اس نے خوبصورتی کو کبھی اپنا اثاثہ نہیں جانا تھا۔ بلکہ کچھ عرصے سے تو یہ عالم تھا کہ حُسن ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ رہ رہ کر اسے خیال آتا تھا کہ جس طرح گھر کی ترتیب و آرائش میں ہر چیز اپنی جگہ پر ہی اچھی لگتی

ہے اس طرح اس دنیا کے اسٹیج پر حسن بھی کچھ مخصوص جگہوں پر ہی اچھا لگتا ہے۔

اپنے خوبصورت ہونے پر اس نے بارہا شکر بھی ادا کیا تھا لیکن کبھی کبھی وہ حیرت سے سوچے بغیر نہیں رہ سکی تھی کہ آخر خدا نے اسے حُسن سے کیوں نوازا تھا؟ وہ ماڈل یا اداکارہ تو بن نہیں سکتی تھی۔ بننا تو دور کی بات، وہ اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ بہت سی لڑکیوں کے لئے شاید اس زندگی میں بہت کشش رہی ہو لیکن اسے اس زندگی کے تصور سے ہی خوف آتا تھا۔

عالیہ اب بھی ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ عالیہ کی شخصیت لاکھ سپاٹ اور سادہ سہی.......... لیکن اس میں کہیں نہ کہیں کشش کا کوئی خزانہ مدفون تھا۔ ماہم کئی بار اس کی لاعلمی میں چپکے چپکے اس کی طرف غور سے دیکھتی لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ کشش کا وہ خزانہ کہاں تھا؟

ایسے میں اگر کبھی اچانک عالیہ سر گھما کر اس کی طرف دیکھ لیتی تو ماہم گڑبڑا سی جاتی، گھبرا جاتی، نظر چُرا لیتی.......... اور دھڑکتے دل کے ساتھ کافی دیر تک سوچتی رہتی کہ عالیہ نہ جانے کیا سوچتی ہوگی کہ وہ کیوں اتنے غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ایسے میں ہی کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ شاید عالیہ کی ساری کشش یا پھر شاید اس کی کشش کا راز اس کی آنکھوں میں ہی پوشیدہ تھا۔ بظاہر وہ آنکھیں بھی نہایت عام، نہایت سپاٹ سی تھیں لیکن ماہم کو گمان گزرتا، اسے شبہ سا ہوتا کہ ان آنکھوں میں کوئی خاص بات تھی۔

کوئی بہت ہی خاص بات!

ان آنکھوں میں کوئی نامعلوم سی طاقت مقید تھی۔ شاید بہت کچھ کر گزرنے کی طاقت!

اگر بہت غور سے دیکھا جاتا تو شاید محسوس کیا جاسکتا کہ ان آنکھوں میں کوئی خاموش پیغام پنہاں تھا۔ شاید اس کا مفہوم کچھ اسی قسم کا تھا۔ "مجھے ایک غیر اہم ایک عام سی لڑکی سمجھ کر ٹریٹ مت کرو۔ مجھے راہ میں پڑے ہوئے کسی حقیر سنگریزے کی طرح دیکھ کر مت گزرو۔ میں بہت خاص ہوں۔ انتظار کرو اس دن کا جب مجھے دریافت کیا جائے گا۔ میں

اس کائنات کے سربستہ رازوں میں سے ایک ہوں۔"

ماہم کو ان آنکھوں سے خوف آنے لگتا۔ مگر بظاہر وہ عام سی آنکھیں' ان گنت عام سے انسانوں جیسی آنکھیں جن میں محرومیوں کی پرچھائیاں بھی تھیں اور شکستہ خوابوں کی کرچیاں بھی۔ بے عنوان اور بے مقصد رت جگوں کے مٹتے مٹتے نقوش بھی تھے اور تشنہ تکمیل خواہشوں کے کھنڈر بھی۔

کبھی کبھی وہ خود پر جھنجلا بھی اٹھتی۔ آخر وہ اسے اتنی اہمیت ہی کیوں دیتی تھی؟ فیکٹری میں اس جیسی نہ جانے کتنی لڑکیاں تھیں۔ اس کی انفرادیت بس یہ تھی کہ وہ ماس کمیونی کیشنز میں ایم اے تھی۔ اس ڈگری کے ساتھ وہ اس فیکٹری میں اس حیثیت سے کام کرنے والی پہلی لڑکی تھی۔

مگر یہ کوئی ایسی انہونی تو نہیں تھی۔ دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا تھا اور پھر اس کی تو دنیا ہی بڑی محدود سی تھی۔ اسے بھلا دنیا کے بارے میں علم ہی کتنا تھا؟ اس کی ماں نے ایک بار اسے بتایا تھا کہ اس نے اسی شہر لاہور میں ایک ایم اے پاس نوجوان کو تانگا چلاتے اور ایک بی اے پاس نوجوان کو ٹھیلے پر گنڈیریاں بیچتے دیکھا تھا۔

بے روزگاری اگر مردوں میں زیادہ تھی تو کیا عورتیں اس کے اثرات سے محفوظ تھیں؟ وہ لوگ یقیناً بہت زیادہ مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ جو یہ سوچتے ہیں کہ عورتوں کے لئے تو نوکری حاصل کرنا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ لڑکیوں کو تو نوکریاں پلیٹ میں رکھ کر پیش کی جاتی ہیں۔ لڑکی اگر کسی جاب کے لئے نااہل بھی ہوتی ہے تب بھی اگر وہ انٹرویو لینے والوں سے ذرا مسکرا مسکرا کر باتیں کرلیتی ہے تو وہ نوکری بھی اسے مل جاتی ہے۔

ماہم کے تجربے کے مطابق تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ لوگوں کی یہ غلط فہمی کیسے دور کرے۔ بے روزگاری کے عفریت سے نمٹنا لڑکیوں کے لئے مردوں سے کہیں زیادہ مشکل اور صبر آزما کام تھا۔ وہ جو مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے والی لڑکیاں تھیں' ان کا تو معاملہ ہی الگ تھا' وہ طبقہ ہی الگ تھا۔ انہیں تو اکثر نوکری کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو نوکری کے بغیر بھی کام چلا سکتی تھیں۔ معلوم نہیں یہ بات لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی تھی۔

ماہم نے دیکھا' عالیہ کچھ ایسی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے اس سے بات کرنا چاہتی ہو لیکن اسے خیالوں میں گم دیکھ کر اس کے قریب آنے سے ہچکچا رہی ہو۔ ٹی بریک میں عموماً وہ تھوڑی بہت گپ شپ کرلیا کرتی تھیں۔ ڈیپارٹمنٹ کی دوسری لڑکیاں دو دو تین تین کی ٹولیوں میں ہال کے ایک خالی حصے میں جا کھڑی ہوئی تھیں۔ چائے کے کپ ان کے ہاتھوں میں تھے۔

مجموعی طور پر فیکٹری میں مرد کارکنوں کی تعداد عورتوں سے کہیں زیادہ تھی لیکن ان کے شعبوں اور کاموں کی تقسیم کچھ اس طرح کردی گئی تھی کہ عورتیں اور مرد زیادہ تر الگ الگ ہی رہتے تھے یا پھر ایک دوسرے کے شعبوں میں ان کی تعداد برائے نام ہوتی تھی۔ ان کے ہال میں تین مرد کام کرتے تھے۔ وہ اپنے کپ اٹھائے باہر چلے گئے تھے۔

ماہم نے اپنا کپ اٹھایا اور اپنے وحشت انگیز خیالات کو جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے عالیہ کی لمبی سی پلیٹ فارم نما میز پر آگئی۔ اس نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا عالیہ کے سامنے بڑے سائز کا ایک میگزین کھلا رکھا تھا۔ ماہم کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کیا پڑھ رہی ہوگی۔ قریب آکر اس کے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ سامنے جو صفحہ کھلا نظر آرہا تھا اس کا عنوان تھا "آپ کا یہ ہفتہ کیسا گزرے گا؟"

عالیہ نے دیکھ لیا تھا کہ ماہم کی نظریں عنوان پر تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ اس قسم کی چیزوں کے بارے میں ماہم کے نظریات کیا تھے۔ اس نے قدرے شرمیلے سے انداز میں مسکراتے ہوئے میگزین بند کرنے کی کوشش کی لیکن ماہم نے اس پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بھئی تم میری وجہ سے میگزین بند مت کرو۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "ہر انسان کو یہ جاننے کا حق حاصل ہے کہ اس کا یہ ہفتہ' یہ مہینہ یا پوری زندگی کیسی گزرے گی۔ یہ اخبار اور رسالے والوں کی مہربانی ہے کہ وہ لاکھوں انسانوں کو اس سلسلے میں اہم معلومات فراہم کرتے رہتے ہیں۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں وہی پرانا طنزیہ اور استہزائیہ سا رنگ جھلک آیا۔ حالانکہ اندر ہی اندر اس کے محسوسات کی دنیا میں ایک انقلاب سا آچکا تھا۔ اس وقت تو خود اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ میگزین اٹھا کر نہ صرف اپنے لئے اس ہفتے کا احوال

جاننے کی کوشش کرے بلکہ کہیں سے جام جم اس کے ہاتھ لگ جائے جس میں جھانک کر وہ اپنی آئندہ زندگی کا نقشہ دیکھ سکے۔

مگر اس نے خود کو میگزین اٹھانے سے باز رکھا۔ مسئلہ جیسے انا کا آن پڑا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ رسالہ اٹھا کر دیکھے گی تو یہ اس کے نظریات میں تبدیلی یا لچک کا نہیں بلکہ ایک قسم کی کمزوری کا اظہار ہوگا۔ وہ گویا اپنی زندگی کے تاریک گوشوں میں کسی کو جھانکنے کا موقع فراہم کرے گی۔

عالیہ نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور چائے کا گھونٹ بھرنے لگی۔ ماہم بھی چائے کی چسکی لے کر بولی۔ "تو تم نے جان لیا کہ تمہارا یہ ہفتہ کیسا گزرے گا۔ مبارک ہو' اب تم ایک باخبر اور صاحبِ علم ہستی ہو۔ آنے والے حادثوں اور ناخوشگواریوں سے بچاؤ' سامان کر سکتی ہو۔"

"ہاں۔" عالیہ معصومیت سے بولی۔ "اس میں لکھا ہے اپنے چھوٹے بچوں کی صحت کا خیال رکھیں۔ بڑے بچے کو کوئی مشکل پیش آسکتی ہے۔"

"اب مسئلہ یہ ہے کہ تم چھوٹے بڑے' درمیانے یا کسی بھی عمر کے بچے کہاں سے لاؤ گی؟ تمہاری تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی۔" ماہم ذرا استہزائیہ سے انداز میں بولی۔ یہ کہتے ہوئے اسے اپنے ہاتھ پیروں میں کچھ سر سراہٹ سی محسوس ہوئی لیکن اس نے جلدی سے اس طرف سے اپنا دھیان ہٹا لیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے لہجے میں شاید لرزش بھی آئی تھی مگر اس نے خود ہی اسے اپنا وہم قرار دے دیا۔

عالیہ کا لہجہ فوراً ہی مدافعانہ سا ہوگیا۔ "بھئی یہ تو ایک عمومی سا تجزیہ ہوتا ہے نا۔ جنرل اپنا لائنس ہے۔ سب کے لئے ہے۔ مجھ جیسی لڑکیاں فرض کر لیتی ہیں کہ یہ بچوں والی بات ان کے لئے نہیں ہے۔"

"اس میں اور بھی کچھ ایسی باتیں ہوں گی جن کے بارے میں تمہیں فرض کرنا پڑے گا کہ وہ تمہارے لئے نہیں ہیں۔" ماہم ایک گھونٹ بھر کر بولی۔

"ہاں۔" عالیہ نے تسلیم کیا۔ "اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ کاروبار میں معاہدہ ہونے کا امکان ہے۔ میں نے فرض کر لیا ہے کہ یہاں کاروبار سے مراد میری نوکری ہے۔"

"دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔" ماہم مسکرائی۔

"ہاں......... بھئی سارا مسئلہ دل ہی کا تو ہے.......... دل کو کوئی نہ کوئی ڈھارس چاہئے ہوتی ہے.......... کوئی چھوٹا موٹا سہارا چاہئے ہوتا ہے۔ اس طرح دن ذرا آسانی سے گزر جاتے ہیں۔" عالیہ گہری سانس لے کر بولی۔

"اس کالم میں ہر فرد کے لئے مختصر سی ہی پیش گوئیاں ہوتی ہیں۔ بہت سی باتیں اس پر فٹ نہیں بیٹھتیں۔ جیسے یہ بچوں والی اور ذاتی کاروبار والی باتوں کا تم سے کوئی تعلق نہیں۔ تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے؟" ماہم نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ اب اس کا لہجہ طنزیہ یا استہزائیہ نہیں تھا۔ وہ گویا واقعی اپنی معلومات میں اضافے کے لئے سوالات کر رہی تھی۔

"بس ایک آدھ جملہ ہی بچتا ہے۔" عالیہ نے اعتراف کیا۔

"اور سال چھ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ایسا کوئی جملہ کسی حد تک ٹھیک ثابت ہو جاتا ہے تو وہ محض ایک اتفاق ہوتا ہے۔" ماہم بولی۔

"اتفاق ہی سہی لیکن بات پھر وہی ڈھارس کی آجاتی ہے۔ دل کو تھوڑا بہت سہارا تو مل جاتا ہے نا۔" عالیہ خوش دلی سے مسکرائی۔

"خلاصہ اس کا یہ ہوا کہ صنفِ نازک بہرحال اپنی ضعیف الاعتقادی نہیں چھوڑ سکتی۔" ماہم ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"بھئی آپ تو لڑکی ہو کر اپنی ہی صنف کو بدنام کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔" عالیہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپ کیا سمجھتی ہیں کہ مرد حضرات ان سلسلوں میں دلچسپی نہیں لیتے؟ آپ کبھی جائزہ تو لے کر دیکھیں۔ اس قسم کے کالموں کو پڑھنے والوں اور سوالات بھیجنے والوں میں آدھی تعداد مردوں کی ہوتی ہے اور کبھی آپ تعویذ گنڈے دینے والوں اور پیروں فقیروں کے پاس جا کر دیکھیں۔ ان کے ہاں آنے والوں میں آدھی تعداد مردوں کی ہوتی ہے.......... بلکہ بعض جگہ تو شاید مرد زیادہ آتے ہوں اور عورتیں کم۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ "مگر ہر معاملے میں بدنام بے چاری عورتیں ہی زیادہ ہوتی ہیں۔"

"بھئی میں عورتوں کی میر جعفر کا کردار ادا کرنے کی کوشش نہیں کر رہی ہوں لیکن

"سچی بات یہ ہے کہ میں نے عورتوں کو ان چکروں میں زیادہ دیکھا ہے۔" ماہم کپ خالی کر کے رکھتے ہوئے بولی۔ "میں نے دیکھا ہے لڑکیاں تو عام طور پر پہلی ملاقات میں ہی پوچھ لیتی ہیں۔ آپ کا اسٹار کیا ہے۔"

"حالانکہ انہیں پوچھنا چاہئے' آپ کا Zodiac Sign یا آپ کا برج کیا ہے۔ اسٹار الگ چیز ہے۔" عالیہ نے فوراً تصحیح کی۔

"ہاں' مجھے معلوم ہے۔" ماہم ملائمت سے بولی۔ "لیکن گفتگو میں عام طور پر لوگ اسٹار ہی بولتے ہیں اور پھر تجزیہ شروع کر دیتے ہیں کہ فلاں اسٹار میں یہ خصوصیت ہوتی ہے اور آپ کا فلاں مسئلہ تو آپ کے اسٹار کی وجہ سے ہے۔ یہ مسئلہ تو زندگی بھر ساتھ رہے گا۔ آپ کو اس کے ساتھ ہی زندگی گزارنی ہوگی اور فلاں اسٹار کا فلاں اسٹار کے ساتھ میل ملاپ اچھا رہتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ.......... اس قسم کی گفتگو میں خواتین سب سے زیادہ دلچسپی لیتی ہیں۔"

"اور آپ اس قسم کی باتوں سے بور ہوتی ہیں؟" عالیہ بھی کپ خالی کر کے میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں بھئی' سچی بات ہے۔ میں تو لڑکی ہوتے ہوئے بھی اس قسم کی باتوں سے بور ہوتی ہوں.......... اور یہ بات میں تمہیں کئی بار بتا چکی ہوں۔" ماہم بولی۔

چند دن پہلے تک شاید یہ بات سچ تھی لیکن اب سچ نہیں رہی تھی۔ اب وہ صرف بھرم رکھنے کے لئے اپنا یہ فلسفہ دہرا رہی تھی۔ حقیقت اب یہ تھی کہ اس کا یقین اتھل پتھل ہو چکا تھا۔ اب وہ بھی بہت سی عورتوں کی طرح اندر سے کھوکھلی اور کمزور تھی۔ اب اسے بھی سہاروں کی تلاش تھی۔ کمزور کھوکھلے اور غیر یقینی سہارے بھی اب اس کے لئے قابلِ قبول تھے۔ وہ روشن بابا کے پاس جانے کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن عالیہ کے سامنے کسی کے بھی سامنے وہ اس کا اعتراف کرنے کے لئے اب بھی تیار نہیں تھی۔

یہ سوچتے ہوئے ایک بار پھر اس کا دل ہولنے لگا۔ وہ اپنا دھیان بٹانے کے لئے جلدی سے بولی۔ "اور سناؤ' کام کیسا جا رہا ہے؟"

الفاظ غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکل تو گئے لیکن فوراً ہی اسے احساس ہوگیا

کہ اس کا سوال احمقانہ تھا۔ وہ خود عالیہ کی امیجیٹ باس تھی۔ اس ہال کے دوسرے تمام کارکنوں سمیت عالیہ کے کام پر بھی نظر رکھنا اور اس کی کارکردگی سے باخبر رہنا اس کی ذمے داری تھی۔ ویسے بھی عالیہ اس سے محض چند گز کے فاصلے پر بیٹھتی تھی۔ سب سے زیادہ تو اسے ہی علم ہونا چاہئے تھا کہ عالیہ کا کام کیسا جا رہا تھا۔

بہرحال اب تو الفاظ منہ سے نکل ہی چکے تھے اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح منہ سے نکلے ہوئے الفاظ بھی واپس نہیں آ سکتے تھے۔ اس نے یوں ظاہر کرنے کی کوشش کی جیسے اس نے محض رسمی طور پر بات برائے بات کی تھی۔ وہ قدرے بے نیازی سے عالیہ کی میز سے گارمنٹ کا ایک پیس اٹھا کر یونہی سرسری سے انداز میں دیکھنے لگی۔

اسے احساس تھا کہ عالیہ گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے کچھ یوں لگا جیسے عالیہ اس کی اندرونی کیفیات کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اس کے خیالوں کے خفیہ قلعے میں کہیں نقب لگانے کے لئے جگہ تلاش کر رہی تھی۔ ماہم اسے اس کا موقع نہیں دے سکتی تھی۔

اس نے تمام تر زندہ دلی سے مسکرا کر عالیہ کی طرف دیکھا اور اضافہ کیا۔ "یونہی گپ شپ کے طور پر پوچھ رہی ہوں۔ یہ مت سمجھنا کہ تمہاری باس کی حیثیت سے میں تم سے رپورٹ لینے کی کوشش کر رہی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے مجھے باس بننے کا کچھ زیادہ شوق نہیں ہے۔"

"تبھی تو میرا یہاں گزارا بھی ہو رہا ہے مس ماہم!" وہ سر جھکاتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔ "آپ بہت اچھی ہیں۔ آپ نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ میں آپ کے حُسنِ سلوک کو کبھی نہیں بھولوں گی۔" یک بیک ہی اس کے تاثرات بدل گئے تھے۔ گہری سنجیدگی نے اس کے چہرے کو گویا کچھ اور دھندلا دیا تھا۔

ماہم گفتگو کو ہلکا پھلکا اور ماحول کو پہلے ہی کی طرح شگفتہ رکھنے کے لئے لاپروائی سے بولی۔ "ارے بھئی' اب اتنا سیریس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہارے ساتھ خاص طور پر کوئی ایسا سلوک نہیں کیا جس کے لئے تمہیں اتنی ممنونیت ظاہر کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ میں تو سبھی کے ساتھ اسی طرح پیش آتی ہوں۔ رعب ڈالنا مجھے

بالکل اچھا نہیں لگتا۔ میں تو آفس بوائے تک کو اپنا ہم مرتبہ انسان سمجھ کر بات کرتی ہوں۔ میں اس وقت تک کسی کے ساتھ رویہ نہیں بدلتی جب تک کوئی سر پہ چڑھنے کی کوشش نہ کرے۔"

"اتنا ظرف بھی کسی کسی کا ہوتا ہے مس ماہم!" عالیہ کے لہجے کی سنجیدگی برقرار رہی۔

"تم تو ویسے بھی ہم سب کے اچھے سلوک کی مستحق ہو۔ اس ڈیپارٹمنٹ میں تم ہم سب سے زیادہ پڑھی لکھی ہو۔"

"ہاں لیکن یہ ایم اے کی ڈگری اب تو بوجھ محسوس ہونے لگی ہے۔ حالانکہ بڑے ذوق و شوق اور بڑی محنت سے حاصل کی تھی۔" عالیہ گہری سانس لے کر بولی۔

"مجھے معلوم ہے تم یہاں خوش نہیں ہو۔ یہ ملازمت تمہارے شایانِ شان نہیں ہے۔" ماہم بولی۔

"نہیں' نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" عالیہ جلدی سے بولی۔ "میں یہاں خوش تو ہوں۔ کہنے کو تو میں صرف چیکر ہوں لیکن یہاں مجھے بہت سے فائدے حاصل ہیں۔ تنخواہ اچھی ہے۔ فیکٹری کی گاڑی لینے آتی ہے۔ میڈیکل کی سہولتیں ہیں۔ ماحول بہت اچھا ہے۔ آڑے وقت میں انسان کو ایسی ملازمت بھی مل جائے تو لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہئے.......... لیکن بس.........." وہ کچھ الجھن آمیز سے انداز میں خاموش ہو گئی۔

"لیکن.........؟" ماہم نے اس کی پُراسرار سی آنکھوں میں جھانکا۔

"لیکن.......... بس۔ وہ.......... شاید اپنے شوق اور رجحان کی وجہ سے ایک خلش سی ہے۔" عالیہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ "ظاہر ہے میں نے گارمنٹ فیکٹری میں چیکر بننے کے لئے ماس کمیونی کیشنز میں ایم اے نہیں کیا تھا۔ میں میٹرک یا زیادہ سے زیادہ انٹر پاس بھی ہوتی تب بھی یہ کام کر سکتی تھی۔ بس یہی ایک خلش ستاتی ہے کہ مجھے اپنے ذوق' رجحان اور تعلیم کی مناسبت سے کسی اور جگہ ہونا چاہئے تھا۔"

"مثلاً.........؟"

"مثلاً کسی اخبار یا رسالے میں۔ کسی ایڈورٹائزنگ یا نیوز ایجنسی میں۔ کسی ادارے

کے پبلک ریلیشنگ ڈیپارٹمنٹ میں یا ان سے ملتی جلتی کسی جگہ پر۔"

"تم بتا رہی تھیں کہ تم نے کچھ اخباروں اور رسالوں میں اپلائی تو کیا تھا؟" ماہم کو یاد آیا۔

"ہاں' کئی نئے اخبار اور رسالے نکل تو رہے ہیں لیکن میری بدقسمتی تھی کہ جب یں نے ایم اے کیا تو ان سب کے دفتر کھچا کھچ بھر چکے تھے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے ملک میں ہر شعبے میں کس قدر بے روزگاری ہے اور پھر فریش ڈگری یافتہ کی جگہ تھوڑے بہت تجربے کار کو ہر شعبے میں ترجیح دی جاتی ہے۔ ایک دو جگہ چند دنوں کے لئے کام کرنے کا اتفاق ہوا تو وہاں کا ماحول مجھے پسند نہیں آیا۔ کچھ لوگوں کو اپنے ماحول میں' میں پسند نہیں آئی۔ یوں بات نہیں بنی۔"

وہ عجیب سے انداز میں ہنسی پھر بولی۔ "بہرحال' میں مناسب موقعے کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"یعنی اپنے مطلب کی ملازمت ملتے ہی تم ہمیں چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟ مطلبی کہیں کی..........!" ماہم نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔

عالیہ نے غیر ارادی سے انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "قسم سے آپ کو چھوڑ کر جانے کو جی تو نہیں چاہتا لیکن یہ فیکٹری' یہ گارمنٹس' یہ مشینوں کا شور' یہ تقریباً ان پڑھ سے کاریگروں سے ضد بحث' یہ سب کچھ دل کو نہیں جچتا۔ اندر کہیں ایک بے کلی سی رہتی ہے۔ روح گویا کچھ اور مانگتی ہے۔"

ماہم نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ وہ اس کے محسوسات کو سمجھ سکتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے ایک اچھی' پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی ساتھی کارکن کے جانے کا دکھ ہو گا لیکن اتنا بھی نہیں کہ وہ ابھی سے اس غم میں گھلنا شروع کر دیتی۔ ویسے بھی اس وقت اسے اندر ہی اندر کھنڈر کرنے کے لئے ایک اور غم چمٹا ہوا تھا۔

اچانک ہال کی ایک دیوار پر لگا ہوا بزر ہلکی سی آواز میں بج اٹھا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ ٹی بریک ختم ہو چکا تھا۔

"چلیں بھئی۔" ماہم ٹھنڈی سانس لے کر اٹھتے ہوئے بولی۔ "باتیں تو چلتی ہی رہیں

گی۔ فی الحال کام کیا جائے۔ تنخواہ حلال کی جائے۔"

عالیہ مسکرا دی اور اپنی میز پر لگے ہوئے ملبوسات کے انبار کی طرف متوجہ ہو گئی۔

ماہم اپنی میز پر لوٹ آئی۔ چند سیکنڈ بعد اندر ہال سے مشینوں کا گونج دار سا شور ایک بار پھر سنائی دینے لگا۔

☆==========☆==========☆

روشن بابا کو ہاتھ دکھا کر وہ ان کے جھونپڑی نما مکان سے نکلی تو اندر ہی اندر گویا تھر تھر کانپ رہی تھی۔

باہر آ کر ماہم نے خوف زدہ سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کسی نے اسے روشن بابا کی جھونپڑی سے نکلتے تو نہیں دیکھا؟ روزانہ بیسیوں عورتیں اور مرد روشن بابا کو ہاتھ دکھانے آتے تھے۔ یہ کوئی معیوب بات نہیں تھی مگر ماہم مجرموں کی طرح آئی تھی۔ شام کے دھندلکے میں' دوسروں کی نظر بچا کر۔

گویا وہ ہاتھ دکھانے پر مجبور ضرور تھی مگر اب بھی اس کی نظر میں کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ وہ اب بھی اپنے اس فعل پر شرمسار تھی یا پھر شاید یہ اس کے دل کا چور تھا۔

روشن بابا کوئی پیشہ ور نجومی یا پامسٹ نہیں تھے۔ وہ تو درویش صفت سے آدمی تھے۔ کبھی کبھی محنت مزدوری کر لیتے تھے۔ چار پیسے مل جاتے تھے تو اس وقت تک بیٹھ کر کھاتے رہتے تھے جب تک ختم نہ ہو جاتے۔ اس دوران میں ہی دست شناسی کا سلسلہ ذرا زیادہ چلتا تھا۔ لوگوں کو قسمت کا حال بتاتے تھے مگر کسی سے کوئی پیسہ دھیلا' نذر نذرانہ کچھ نہیں لیتے تھے۔ کوئی دینے کی کوشش کرتا تو خفا ہو جاتے۔ کسی کو ایسے وظیفے یا عملیات بھی نہیں بتاتے تھے جن پر زیادہ خرچ آتا ہو۔ کالا بکرا' کالی مرغی یا زعفران وغیرہ لانے کی فرمائش بھی نہیں کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ کبھی کبھار کسی کو بس یہ تاکید کر دیتے تھے کہ توفیق ہو تو کسی بھوکے کو کھانا کھلا دینا' کسی بے زبان جانور کا پیٹ بھر دینا۔

ماہم جس فیکٹری میں ملازم تھی وہ لاہور کے نواح میں شیخوپورہ روڈ پر صنعتی علاقے میں تھی۔ یہ صنعتی علاقہ لاہور سے شیخوپورہ تک سڑک کے دونوں طرف پھیلا ہوا تھا۔ بیچ بیچ میں کھیت بھی تھے' گاؤں بھی تھے اور قصبات بھی۔

گارمنٹ فیکٹری بہت پرانی تھی اور جس وقت قائم ہوئی تھی اس وقت اتنے بڑے پیمانے پر گارمنٹس کا کام کرنے کا تصور نہیں ابھرا تھا۔ صنعتی علاقہ بھی اس وقت زیادہ نہیں پھیلا تھا۔ کہیں کہیں کارخانہ دکھائی دیتا تھا۔ زیادہ تر سرسبز کھیت لہلہاتے تھے لیکن صنعت رفتہ رفتہ کھیتوں کی ہریالی کو نگل گئی تھی۔ بیشتر کھیتوں کی جگہ اب کارخانے سر اٹھائے کھڑے تھے اور دھواں اُگل رہے تھے یا اپنے اردگرد کیمیکلز پھیلا رہے تھے۔

روشن بابا کی جھونپڑی فیکٹری سے کچھ ہی دور ایک بستی کی حدود میں تھی۔ ماہم کی ماں نے بھی برسوں اسی فیکٹری میں کام کر کے بیوگی کے کٹھن دن گزارے تھے اور ماہم کو پالا تھا۔ انہوں نے اسے فیکٹری کے زیر انتظام چلنے والے اسکول میں تعلیم دلائی' پھر لاہور میں کالج میں بھی داخل کرایا۔ ماہم روزانہ بسوں میں میلوں کا سفر کر کے کالج جاتی۔ بی اے کے بعد اس کی ہمت جواب دے گئی' ورنہ اس کی بلند حوصلہ ماں تو اپنے کم وسائل کے باوجود اسے یونیورسٹی تک بھیجنے کے لئے تیار تھی لیکن ماہم نے خود ہی مزید پڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں اسے جگہ نہیں مل رہی تھی اور روزانہ یونیورسٹی آنے جانے کا مطلب تقریباً پورا دن سفر میں گزارنا تھا۔

فیکٹری کے قریب ہی فیکٹری کی اپنی رہائشی کالونی تھی۔ گارمنٹ انڈسٹری میں اس علاقے میں یہ واحد فیکٹری تھی جس کی اپنی رہائشی کالونی تھی۔ ضرورت کی ہر چیز وہاں میسر تھی۔ فیکٹری کے افسران سے لے کر بیشتر لیبرز تک کو وہاں رہائش میسر تھی۔ صرف ان کارکنوں کو رہائش نہیں دی جاتی تھی جنہیں کام کرتے ہوئے تین برس سے کم عرصہ گزرا تھا' یا جنہیں کنٹریکٹ پر رکھا گیا تھا۔

کالونی کے گرد بہت بڑی چار دیواری تھی۔ سستے وقتوں میں زمین خریدی گئی تھی۔ چاردیواری میں اب بھی بہت سی جگہ خالی پڑی ہوئی تھی لیکن فیکٹری کے مالک سہیل صاحب نے برسوں پہلے اس چاردیواری سے دو فرلانگ کے فاصلے پر کچھ اور زمین خرید کر اپنا عالیشان بنگلہ وہاں ایک الگ چاردیواری میں تعمیر کرایا تھا۔

پہلے وہ بھی کالونی ہی کے ایک بنگلے میں رہتے تھے۔ پھر نہ جانے کس مصلحت کے تحت انہوں نے وہ بنگلہ جنرل منیجر کو دے دیا تھا اور خود دو فرلانگ دور نئے بنگلے میں چلے

گئے تھے۔ سیٹھ سہیل اب بوڑھے اور نیم معذور ہو چکے تھے۔ دل کے مریض تھے۔

ماہم کی ماں کو برسوں پہلے سے کالونی میں کوارٹر ملا ہوا تھا۔ وہیں ماہم کا لڑکپن گزرا تھا اور اب جوانی گزر رہی تھی۔ ماہم کے بی اے کرنے تک اس کی ماں کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ ہمت تو بے شک ان میں بہت تھی لیکن جسم ساتھ نہیں دیتا تھا۔ کئی عارضے لاحق تھے۔ چنانچہ ماہم نے انہیں گھر بٹھایا اور خود معاش کی ذمے داری سنبھال لی۔ اسے ماں کی جگہ ایک ڈیپارٹمنٹ میں سپروائزر رکھ لیا گیا۔

یہاں تک زندگی کچھ زیادہ کٹھن نہیں رہی تھی۔

اور شاید یونہی گزرتی چلی جاتی بشرطیکہ.........

وہ ایک بار پھر جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔ روشن بابا کی جھونپڑی ایک پگڈنڈی کے کنارے تھی۔ آس پاس درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ کوئی دوسرا مکان نہیں تھا۔ علاقہ جنگل اور ویرانہ سا لگتا تھا حالانکہ آبادیاں اور سڑکیں دور نہیں تھیں۔ یہ پگڈنڈی بھی آگے جا کر ایک چھوٹی سڑک سے ملتی تھی۔

ماہم سڑک پر پہنچ کر بائیں طرف مڑتی تو فیکٹری کی کالونی میں پہنچ سکتی تھی اور دائیں طرف مڑتی تو سیٹھ سہیل کے بنگلے پر پہنچ سکتی تھی۔ یہاں آس پاس یا سڑک کے کنارے روشنیاں نہیں تھیں البتہ انڈسٹریل ایریا میں کچھ فاصلے پر کارخانوں اور ان کی کالونیوں میں روشنیاں نظر آرہی تھیں۔

ماہم سہمے سہمے سے انداز میں کچے راستے سے ہی سیٹھ سہیل کے بنگلے کی طرف چل دی۔ اس کے کانوں میں ابھی تک روشن بابا کے الفاظ گونج رہے تھے۔

پہلے تو انہوں نے اس کا ہاتھ دیکھنے سے ہی انکار کر دیا تھا اور ڈانٹ دیا تھا۔ "یہ کوئی وقت ہے ہاتھ دکھانے کا؟ جس کا دل چاہتا ہے منہ اٹھا کر چلا آتا ہے ہاتھ دکھانے۔"

اگر وہ اس نیم ویرانے میں نہ بیٹھے ہوتے تو یقیناً ان کے پاس ہاتھ دکھانے والوں کا تانتا بندھا رہتا اور ان کی ترش مزاجی کے باوجود ہجوم روز بہ روز بڑھتا ہی جاتا۔ اس بات کا ماہم کو یقین تھا۔ اس علاقے میں جہاں خال خال ہی آبادی تھی' یہاں بھی روشن بابا کے عقیدت مندوں کی کمی نہیں تھی۔ اکثر ہجوم ہی لگا رہتا تھا اور کوئی روشن بابا کی ترش مزاجی

کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

"لیکن اس وقت تو آپ کے پاس کوئی نہیں ہے بابا۔" ماہم نے کمزور اور فریادی سے لہجے میں کہا۔

"میں نے ہی بھگایا ہے سب کو۔" روشن بابا جھلائے ہوئے سے انداز میں ہاتھ ہلا کر بولے "نظر نہیں آتا تمہیں؟ اب اندھیرا پھیل چکا ہے اور میری کٹیا میں صرف ایک لالٹین ہے۔ لالٹین کی روشنی میں لکیریں صحیح دکھائی نہیں دیتیں۔ دن میں نہیں آسکتی تھیں؟ آج کل تو میں دن میں بھی زیادہ تر یہیں ہوتا ہوں۔"

اب ماہم انہیں کیسے بتاتی کہ اندھیرے میں ہی ان کے پاس آنے کے لئے تو اس نے شام ڈھلنے کا انتظار کیا تھا اور وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگتی آئی تھی کہ روشن بابا کے پاس کوئی نہ ہو۔ اندھیرے کی چادر میں چھپ کر' سب کی نظروں سے بچ کر ہی تو وہ ان کے پاس آنا چاہتی تھی۔ جیسے ہاتھ دکھانے نہیں' کوئی گھناؤنا جرم کرنے جا رہی ہو' بلکہ اب تو لوگ جرم بھی اس طرح منہ چھپا کر نہیں کرتے تھے۔

ماہم کو معلوم تھا کہ لوگ روشن بابا کی ڈانٹ پھٹکار بھی خوشی سے سنتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ان کی ڈانٹ پھٹکار میں بھی خلوص ہوتا تھا۔ وہ کسی کو برے دل سے نہیں ڈانٹتے تھے۔ ان کی ڈانٹ میں بھی ایک خاص بزرگانہ اور مشفقانہ سا پیار ہوتا تھا۔ ماہم کو بھی ان کی ڈانٹ بری نہیں لگی تھی۔ ان کے بارے میں باتیں سن سن کر اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اندر سے وہ دکھی انسانوں کے کتنے ہمدرد تھے۔

"میری کچھ مجبوری تھی بابا.........! میں دن میں نہیں آسکتی تھی۔" ماہم نہایت دھیمے لہجے میں بولی۔ "میں تو بڑی آس لے کر آئی تھی لیکن اگر آپ خفا ہو رہے ہیں تو میں چلی جاتی ہوں۔"

وہ مایوسی کے سے عالم میں جانے کے لئے مڑی تو روشن بابا فوراً چلائے۔ "جانے کے لئے کس نے کہا ہے تم سے؟ اب آگئی ہو تو بیٹھو' یہاں مرو۔" انہوں نے ایک موڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خود موڑھے کے قریب ہی جھلنگا سی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ "تمہارے چہرے پر پریشانی لکھی ہے۔ اب میں تمہیں کچھ بتائے بغیر کیسے بھیج سکتا ہوں۔ آؤ بیٹھو۔"

اور ماہم پلٹ کر جلدی سے موڑھے پر جا بیٹھی تھی۔ روشن بابا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے بعد ان کی آنکھیں کھلی رہیں لیکن وہ گویا مراقبے میں چلے گئے۔ جھونپڑے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ ماہم اپنے دل کی دھڑکنیں اور روشن بابا کی خر خراتی سی سانسیں سن رہی تھی۔

چند لمحے بعد لالٹین کی روشنی میں روشن بابا کی دھندلی آنکھیں کچھ اور دھندلا کر رہ گئیں۔ بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی سفید داڑھی میں پُر خیال انداز میں انگلیاں پھیرتے ہوئے انہوں نے ایک لمحے کے لئے خلا میں گھورا اور دوبارہ ہاتھ پر جھک گئے۔

"لڑکی.........!" آخر ان کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے سنائی دی۔ ماہم سراپا سماعت بن گئی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولے۔ "مجھے ان لکیروں میں تیرے لئے بربادی چھپی نظر آرہی ہے۔ تُو نے اپنے لئے کوئی راستہ نہیں چنا اور انجانے راستوں پر بھٹک رہی ہے۔ اب انہی راستوں پر کہیں منزل تلاش کر ورنہ واپس لوٹ جا۔ جس راستے پر چل رہی ہے اسے ترک کردے۔ بربادیاں تیری منتظر ہیں۔"

وہ یک دم ہی چپ ہوگئے اور گویا غنودگی میں چلے گئے۔ ان کی گردن جھک گئی اور داڑھی سینے سے جا لگی۔

ایک لمحے کے انتظار کے بعد ماہم بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی۔ "میں سمجھی نہیں بابا.........! کچھ وضاحت سے بتایئے۔"

"بس' میں تجھے اس سے زیادہ نہیں بتا سکتا۔"

اس دوران میں روشن بابا نے اس کے چہرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا اور اس کے بعد بس انہیں چپ لگ گئی تھی۔ ماہم کے حواس کچھ اور دھندلانے لگے۔ دل ڈوب سا گیا۔ اس نے روشن بابا کو کریدنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کی خاموشی کا قفل نہ ٹوٹا۔

"بابا.........پلیز! کھل کر کچھ بتایئے نا۔" اس نے منت کی۔

روشن بابا نے اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھا لیکن ان کے لہجے میں خفگی سی در

آئی۔ "اس سے زیادہ کھل کر کیا سننا چاہتی ہے؟ میں کسی دوسرے ملک کی زبان تو نہیں بول رہا اور تُو اتنی نادان بھی نہیں۔ تُو سب کچھ سمجھ رہی ہے۔ مگر جانتے بوجھتے انجان بن رہی ہے۔ زیادہ انجان بنے گی تو نقصان اٹھائے گی۔"

تب وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی ٹانگوں میں لرزش تھی اور وہ گویا اس کا وزن اٹھانے سے قاصر تھیں لیکن وہ اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی جھونپڑی سے نکل آئی تھی۔

وہ تو اپنی دانست میں منزل پر ہی تھی لیکن بے نام اندیشوں نے اسے ستا رکھا تھا۔ انہی اندیشوں سے مجبور ہو کر وہ روشن بابا کی طرف آئی تھی۔ اپنی افتادِ طبع اور اپنے نظریات سے بغاوت کرکے۔

کئی دنوں سے اس کا یہ عالم تھا کہ سوچ سوچ کر اس کا دل ڈوب جاتا تھا۔ اسے کسی بے عنوان سے سہارے کی ضرورت تھی۔ کسی شیریں بیاں کی ضرورت تھی جو اسے امید دلاتا۔ کسی خوش کلام کی ضرورت تھی جو اسے نئے خواب دکھاتا مگر روشن بابا نے تو نہایت کھردرے لہجے میں کہہ دیا تھا کہ منزل تلاش کر۔

تو کیا وہ جس مقام پر کھڑی تھی وہ اس کی منزل نہیں تھی؟

یہ سوچ کر اس کی رگ و پے میں سردی کی سی لہر دوڑ گئی۔ اس کے لاشعور کے اندھیروں میں ابھرنے والی کوئی غیبی سی آواز اسے پہلے ہی ڈرایا کرتی تھی مگر ماہم نے اسے اپنا وہم قرار دیا تھا۔ ہمیشہ اس مدھم سی آواز کو اَن سنی کرنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن اب تو روشن بابا نے بھی کہہ دیا تھا۔

اور جس انداز سے انہوں نے کہا تھا۔ جو کچھ کہا تھا' اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ واقعی ان کے پاس کچھ نہ کچھ روحانی قوت موجود تھی۔ شاید وہ کسی نہ کسی حد تک ماضی اور مستقبل میں جھانک سکتے تھے۔ شاید کچھ نہ کچھ علم انہیں حاصل تھا۔

وہ ایک بار پھر رات کی تاریکی میں اِدھر اُدھر دیکھ کر بنگلے کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ میلوں میں پھیلے ہوئے اس صنعتی علاقے میں جہاں کہیں زمین خالی تھی وہاں خواہ ویرانی یا تاریکی کا راج ہوتا لیکن اس علاقے میں رہنے والوں کو یہاں آمدورفت میں

کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔

شہری آبادیوں سے دور یہ علاقہ پھر بھی جرائم سے محفوظ تھا۔ آس پاس زیادہ تر جانے پہچانے، دیکھے بھالے لوگ ہی رہتے تھے۔ تنہا عورتوں کو بھی رات میں اِدھر اُدھر آتے جاتے خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ یہی لگتا تھا کہ پاس پڑوس میں ہی کہیں جا رہے ہیں۔

لیکن آج ماہم کا دل لرز رہا تھا۔ آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ گرد و پیش کے حالات سے تو خوف جنم لیتا ہی ہے لیکن خوف انسان کے اندر بھی ہوتا ہے اور وہ انسان کو زیادہ تیزی سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔

آخر وہ اپنے آپ کو سمجھانے لگی کہ اسے روشن بابا کے الفاظ کو دل پر نہیں لینا چاہئے۔ غیب کا حال کسے معلوم ہے؟ وہ تو پہلے ہی ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ خواہ مخواہ ہی اس نے روشن بابا کو ہاتھ دکھانے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ اب سیٹھ سہیل کے بنگلے کے قریب پہنچ چکی تھی لیکن وہ سامنے والے گیٹ کی طرف نہیں بلکہ پچھلی دیوار کی طرف جا رہی تھی۔ بنگلے کے تین گیٹ تھے۔ پیچھے کارنر پر ایک اور بہت چھوٹا سا گیٹ تھا جس سے ایک وقت میں ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا۔ وہ یونہی فاضل سا گیٹ تھا جو عام طور پر بند ہی رہتا تھا۔ شاذ و نادر ہی کوئی اس سے گزرتا تھا۔

ماہم اسی گیٹ پر پہنچی۔

گیٹ گویا کسی نے اس کے انتظار میں پہلے ہی اندر سے کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ نہایت خاموشی سے ماہم اندر پہنچی۔ چار دیواری کے ساتھ ساتھ وہ سرونٹ کوارٹر تک پہنچی جس کے آگے سبزے کی خاصی اونچی باڑھ تھی۔ بظاہر یہ کوارٹر خالی رہتا تھا لیکن درحقیقت خالی نہیں تھا۔ وہ باڑھ کے درمیان سے گزر کر دروازے پر پہنچی تو دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔

سامنے تاریکی میں ایک ہیولا کھڑا تھا۔

ماہم اس کے قریب سے گزر کر اندر جا پہنچی۔ ہیولے نے فوراً دروازہ بند کر دیا اور ماہم کے قریب آکر اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے جو برف کی طرح ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

ہیولے کے وجود سے کلون کی مخصوص مہک اٹھ رہی تھی جو کبھی ماہم کے حواس پر سحر

طاری کر دیتی تھی مگر آج وہ اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"بہت دیر لگا دی تم نے۔ آدھے گھنٹے سے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" ہیولے نے کہا۔

اس کے لہجے میں خاصی ناگواری تھی۔ ماہم کا دل پہلے ہی خراش خراش تھا۔ اس پر ایک خراش اور پڑ گئی۔ آج تو اگر وہ اپنے لہجے میں محبتوں کا تمام تر رسیلا پن سمو کر بھی ماہم سے بات کرتا تب بھی شاید اس کے حواس پر وہ سرور نہ چھاتا جس کے سہارے اس نے نہ جانے کتنے روز و شب گزار دیئے تھے۔

"جمیل! کیا اتنا ہی کافی نہیں کہ میں آ گئی ہوں؟" ماہم کے لہجے میں کاٹ تھی۔ "تم سے تو شاید اتنا بھی نہ ہو سکے کہ میری طرح......... مجھ جیسے حالات میں، مجھ جیسی پوزیشن میں ملاقات کا وعدہ نبھا سکو۔"

"کیا مطلب؟" جمیل الجھن زدہ سے لہجے میں بولا۔

"کبھی سچے دل سے میری پوزیشن کو سمجھنے کی کوشش کرو۔" ماہم سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ آواز نیچی تھی مگر اس کی تہہ میں گویا کرب چیخیں مار رہا تھا۔

"کیا ہوا تمہاری پوزیشن کو؟" جمیل تیکھے لہجے میں بولا۔

"شام ڈھلے اپنی سیدھی اور سچی ماں سے بہانے کر کے ایک ایسی لڑکی کا یہاں آنا جو اپنے آپ کو بہت باضمیر اور شریف سمجھتی ہے۔ کتنا مشکل کام ہے، اس کا اندازہ شاید تم کبھی نہ کر سکو۔"

"کیا بات ہے۔ آج تم خوش نظر نہیں آ رہی ہو؟" وہ دونوں کندھوں سے اسے تھام کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "تمہارے لہجے سے تلخی جھلک رہی ہے۔"

وہ جمیل کو بتانا چاہتی تھی کہ کئی دن سے ان گنت اندیشے اسے دہلا رہے تھے۔ دہشت زدہ کر رہے تھے۔ وہ حسین وعدے جو جمیل نے اس سے کئے تھے، وہ حسین مستقبل جس کے خواب ان دونوں نے مل کر دیکھے تھے۔ ان سب کی بنیادیں اسے لرزتی دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ اسے بتانا چاہ رہی تھی کہ وہ قسمت کا حال بتانے والے ایک درویش صفت آدمی

سے مل کر آ رہی ہے اور اس نے بھی اندیشوں کی تصدیق ہی کی تھی۔ کوئی خوشخبری سنائی تھی۔ کوئی امید نہیں دلائی تھی۔

مگر وہ اسے کچھ بھی نہ بتا سکی۔

وہ خود بھی صحیح طرح نہیں جانتی تھی کہ اس کے سامنے آ کر وہ سحر زدہ ہو جاتی مرعوب؟

کب سے وہ سوچ رہی تھی کہ اس سے کھل کر بات کرے گی۔ فیصلہ کر کرے گی مگر اس کے سامنے آ کر اسے نہ جانے کیا ہو جاتا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ محکو بن جاتی تھی۔ اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ اپنی پریشانیوں میں جمیل کو شریک کرے۔ و طرف سے اسے ہمیشہ صرف خوشیوں' لذتوں' راحتوں اور اچھے محسوسات کا نذرا پیش کرنا چاہتی تھی۔

کہیں وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی ہی قبر تو نہیں کھود رہی تھی؟

"بتاؤ نا' کیوں دیر سے آئی ہو؟" جمیل پوچھ رہا تھا۔

"امی نے چند کام بتا دیئے تھے وہ نمٹا رہی تھی۔" وہ بجھے بجھے سے لہجے میں بولی

"کام مجھ سے زیادہ اہم تھے؟" جمیل نے اپنے لہجے کے شکوے سے غالباً یہ کرنے کی کوشش کی کہ اسے اس پر بڑا مان تھا۔

"مسئلہ صرف کاموں کا نہیں تھا۔" وہ ہلکی سی ناگواری سے بولی۔ "باہر آنے لئے امی سے بہانہ کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ کالونی میں رہتے ہوئے ایک لڑکی روز رو بہانے کر کے گھر سے نکل سکتی ہے؟"

پھر اسے جیسے کچھ یاد آیا۔ "اور ہاں' بابر سے بھی نظر بچا کر نکلنا ہوتا ہے۔ اگر وہ پر ہو تو نکلنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ ڈر رہتا ہے کہ وہ میرے بہانے کے کھوکھلے پن محسوس نہ کر لے۔ کہیں میرے تعاقب میں نہ نکل آئے۔ وہ امی کی طرح سیدھا ساد نہیں ہے نا۔"

بابر رشتے میں ماہم کا کزن تھا۔ وہ دنیا میں تنہا تھا اور گارمنٹس فیکٹری میں ہی ملازم لیکن غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے اسے کوارٹر الاٹ نہیں کیا گیا تھا۔ کچھ عرصے سے

ہم اور اس کی امی کے کوارٹر میں ہی ایک کمرے میں تقریباً الگ تھلگ رہتا تھا مگر گھر رحال ایک ہی تھا۔ کھانا پینا ایک ہی جگہ تھا۔ ان حالات میں انسان کتنا ہی الگ تھلگ رہ لے لیکن وہ الگ تھلگ محسوس نہیں ہوتا۔

"مجھے وہ شخص بہت برا لگتا ہے۔" جمیل بے ساختہ بول اٹھا۔ "جب بھی تمہیں دیر باتی ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہیں تم اس کے ساتھ گپیں لڑانے تو نہیں بیٹھ گئیں۔ ہیں اس نے تمہیں کسی مشغلے میں تو نہیں الجھا لیا۔"

اس کے لہجے میں شک بول رہا تھا۔ ماہم کے دل پر ایک اور خراش سی پڑ گئی۔ مرد ر مرد ہی رہتا ہے۔ خود جہاں چاہے جائے۔ جس کے ساتھ چاہے پھرے۔ جہاں تک ا چلے وہاں تک مراسم استوار کرے مگر عورت انگشت نمائی نہیں کر سکتی۔ جواب طلب ں کر سکتی۔ وضاحت نہیں مانگ سکتی۔

عورت چاہے اپنے آپ کو وفاداریوں کے کتنے ہی مضبوط بندھنوں میں باندھ کر کھے لیکن اس کے پاس کوئی سایہ بھی منڈلا جائے تو شک کا اظہار..........!

یہ تضاد تو سراسر بے انصافی پر مبنی ہے۔ ماہم نے یہ سوچا مگر زبان سے نہ کہہ سکی۔

اس کے بجائے وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ "میں تو اس سے سیدھے منہ ن بھی نہیں کرتی۔ یہی تو اسے شکوہ رہتا ہے۔"

وہ جمیل کو کوئی بھی سخت یا کھردرا جواب دینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تو ویسے ہی لب اور بے چین سا آدمی تھا۔ جلد اشتعال میں آ جاتا تھا' ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا مزاج متلون اور فطرت سیمابی تھی مگر شروع میں ماہم کو ان خصوصیات کا اندازہ نہیں کا تھا۔

ان پہلی پہلی ملاقاتوں میں تو وہ جمیل کی طرح پرسکون نظر آتا تھا جب ماہم اس کی ہوئی تھی۔

وقت اپنے ساتھ آگہی کے بہت سے خزانے لے کر آتا ہے۔

جمیل اس کا ہاتھ تھامے اندر کمرے میں لے آیا۔ کمرے میں مدھم سی روشنی تھی۔ یوں پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف صاف ستھرا ڈبل بیڈ لگا ہوا تھا۔

بہت خاموشی، بہت سناٹا تھا وہاں، اور وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے
تاکہ باہر کسی کو ان کی موجودگی کا احساس نہ ہو۔ ویسے تو اس طرف کسی کا آنا جانا ہی نہ
ہوتا تھا۔ یہ ایک فاضل سرونٹ کوارٹر تھا۔ اس کی چابی صرف جمیل کے پاس تھی۔ بڑا
یہ کوارٹر خالی تھا۔

اس بار تنہائی میں ان کی ملاقات پورے ایک ہفتے بعد ہو رہی تھی۔ ماہم کو معلوم
کہ جمیل کو اس ایک ہفتے کی جدائی نے کچھ اور چڑ چڑا بنا دیا تھا۔ وہ خود بھی اس دور
میں مضطرب و ناآسودہ رہی تھی۔

دن میں، دفتر میں، لوگوں کے ہجوم میں وہ اسے کئی کئی بار دیکھتی تھی۔ کئی کئی بار
کے درمیان بات چیت ہوتی تھی مگر وہاں تو بیچ میں ایک نادیدہ سی خلیج رہتی تھی۔ وہ ا
کے لئے بالکل پرایا پرایا سا ہوتا تھا۔

آخر وہ فیکٹری کے مالک کا بیٹا تھا۔ سیٹھ سہیل کی اولاد تھا۔ ماہم کا باس تھا۔
والوں کی نظر میں ان کے درمیان صرف مالک اور نوکر ہی کا رشتہ تھا۔

وہ لرزتی سی آواز میں بولی۔ "جمی! شک کے زہر میں لپٹے ہوئے اس لہجے میں
سے بات مت کرو۔"

اس کے لہجے میں کوئی خاص بات تھی، کوئی خلافِ معمول بات۔ جمیل ایک
اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ اسی لرزاں آواز میں کہتی چلی گئی۔ "میں نے تمہاری خاطر اپنے آپ کو مصلو
کر رکھا ہے۔ ہر لمحہ ایک اذیت، ایک عذاب اور ایک خلش کے ساتھ گزارتی ہوں میر
صرف تمہاری خاطر اپنے آپ کو چور چور سی، مجرم سی بنائے پھرتی ہوں۔ تمہارے کہنے
چل رہی ہوں اور نہ جانے کس منزل کی طرف جا رہی ہوں مگر بس یہی سوچ کر مطمئن
جاتی ہوں کہ تم میرے شوہر ہو اور خود کو یہ تسلی دیتی رہتی ہوں کہ جلد ہی یہ حقیقة
لوگوں کے سامنے آجائے گی۔"

اس کی آواز ٹوٹ سی گئی۔ بمشکل اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "میرے دل
تمہارے سوا کون ہو سکتا ہے؟ میری نظر میں تمہارے سوا کون بچ سکتا ہے؟ میں تو اس

کے انتظار میں ایک ایک لمحہ گن گن کر گزار رہی ہوں جب ہم بھی عام جوڑوں کی طرح روز و شب گزار سکیں گے۔ ہمیں چوروں کی طرح نہیں ملنا پڑے گا۔"

ماہم کی آنکھیں جیسے دور کہیں بھولے بسرے، گم گشتہ خوابوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگیں۔ اس زندگی کی تلاش میں جو دھیرے دھیرے گویا خواب ہی ہوتی جا رہی تھی۔

اس نے اس شان دار بنگلے میں تمام تر رسوم کے ساتھ، دھوم دھام سے دلہن بن کر آنے کا خواب دیکھا تھا مگر اس کے حصے میں چوری چھپے کی شادی آئی تھی۔ اس کے دامن میں وصل کی تشنہ سی راتیں آئی تھیں۔ اس کے حصے میں یہ نیم تاریک سرونٹ کوارٹر آیا تھا۔

مگر پھر بھی وہ خوشی خوشی وقت گزار رہی تھی۔ محض جمیل کے وعدوں کے سہارے۔ وہ بہت خوش گمان تھی یا پھر شاید محبت نے اسے خوش گمان بنا دیا تھا۔ جس طرح وہ اکثر لوگوں کو بنا دیا کرتی ہے۔

انہوں نے لاہور جا کر خفیہ طور پر شادی کی تھی۔ تمام انتظامات جمیل نے ہی کئے تھے۔ نکاح خواں، دو گواہ اور دو تین دوسرے لوگ موجود تھے۔ ماہم ان میں سے کسی کو نہیں جانتی تھی۔

اس بات کو ایک سال گزر گیا تھا۔

ماہم اب سوچتی تھی تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ایک سال کیونکر گزر گیا تھا؟ بوجھ اور تناؤ سے اس کے اعصاب ٹوٹ پھوٹ کیوں نہیں گئے تھے؟ اس پر تو ایک ایک پل بہت بھاری گزرا تھا۔ وہ جب جمیل سے دور ہوتی تھی تب بھی گویا ایک آزمائش سے گزر رہی ہوتی تھی اور جب وہ دنیا کی نظر بچا کر قربتوں کے لمحے چراتے تھے تب بھی گویا اسے ایک امتحان درپیش ہوتا تھا۔ وہ اپنے آپ سے لڑ رہی ہوتی تھی۔ اپنے ضمیر سے لڑ رہی ہوتی تھی۔ اپنے اندیشوں سے لڑ رہی ہوتی تھی۔ ایسے میں بھلا کوئی قربت کے لمحوں سے لذتیں کیسے کشید کر سکتا ہے؟ بہت بھاری قیمت دے کر بہت بے کیف سا پھل پا رہی تھی وہ.........

جمیل سگریٹ سلگاتے ہوئے مضطربانہ لہجے میں بولا۔ "ابھی ہماری آزمائش کا ایک

اور سال باقی ہے۔ میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہمیں پورے دو سال تک اس شادی کو خفیہ رکھنا ہوگا۔"

ماہم کو سب کچھ یاد تھا۔ اس کی وہ دلیلیں' اس کے وہ جواز مگر پھر بھی جیسے وہ یاد دہانی کے طور پر دہرانے لگا۔

"ڈیڈی نے جو وصیت تیار کروا کے رکھی ہوئی ہے اس کی رُو سے فیکٹری' دوسری جائیداد اور بینک اکاؤنٹس وغیرہ پر میرا اختیار اس وقت شروع ہوگا جب میں پورے تیس سال کا ہو جاؤں گا۔ میں ہر چیز میں اپنے بڑے بھائی رمیز کے ساتھ آدھے کا حصے دار ہو جاؤں گا۔"

گہری سانس لے کر وہ ذرا ٹھہرے سے لہجے میں بات کرنے میں کامیاب ہونے لگا۔ "ویسے تو زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ ڈیڈی دل کے مریض ہیں۔ خدانخواستہ! خدانخواستہ آج انہیں کچھ ہو جائے تو میں خودبخود ہر چیز میں حصے دار ہو جاؤں گا کیونکہ ہم دو بھائیوں کے علاوہ ڈیڈی کا کوئی وارث نہیں ہے لیکن ظاہر ہے ایک سعادت مند اور محبت کرنے والے بیٹے کی حیثیت سے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ڈیڈی کو کچھ ہو۔"

اس نے ایک طویل کش لیا۔ اس کی گوری گوری مخروطی انگلیوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ جمیل کی انگلیاں بڑی آرٹسٹک تھیں مگر اس میں آرٹسٹوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ لاابالی پن' نازک مزاجی' زود حسی' کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ بڑا ہی حقیقت پسند آدمی تھا۔ خواب و خیال کا اس کی زندگی میں گزر نہیں تھا۔ افسانویت اور شاعرانہ تخیلوں کی اس کے روز و شب میں گنجائش نہیں تھی۔

سگریٹ کا دھواں اگلتے ہوئے اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "گو کہ اب بھی فیکٹری کا آدھے سے زیادہ نظام میں ہی چلاتا ہوں لیکن میری حیثیت تنخواہ پانے والے ایک ملازم سے زیادہ نہیں ہے۔ بس اتنا ضرور ہے کہ تنخواہ اچھی ہے جسے ڈیڈی نے الاؤنس کا نام دے رکھا ہے۔ میں ڈیڈی کے سامنے شادی کا انکشاف اس وقت کرنا چاہتا ہوں جب میرے حصے کی چیزیں میرے ہاتھ میں آجائیں۔ میری کچھ حیثیت ہو جائے۔ ابھی تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ ڈیڈی مجھے کبھی اپنی فیکٹری کی ایک ملازمہ سے شادی کی اجازت نہیں

دیں گے اور اگر انہیں پتا چلے گا کہ میں تو پہلے ہی ایک ایسی لڑکی سے شادی کر چکا ہوں تو وہ مجھے عاق کر دیں گے اور یہ بہت برا ہوگا۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔"

ماہم کا ذہن ایک بار پھر بیتے دنوں کی طرف رینگ گیا۔ بے شک یہ ساری باتیں وہ شادی سے پہلے ہی بتا چکا تھا مگر نہ جانے کیوں پہلے اور اب میں بہت فرق پڑ گیا تھا۔ پہلے ماہم کو اس کی ہر بات میں وزن محسوس ہوتا تھا مگر اب دل میں ایک اضطراب نے گھر کر لیا تھا۔ ایک احساسِ جرم نے اسے قیدی بنا لیا تھا اور اسے اس قید سے نجات چاہئے تھی۔ وہ اس بے نام بوجھ سے آزاد ہونا چاہتی تھی جو اس کی روح کو کچل رہا تھا۔

بیتے ہوئے دنوں کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ اس وقت تو محسوسات بادلوں کے سنگ سنگ پرواز کرتے تھے۔ بدن ہواؤں میں ہلکورے لیتا تھا اور رگ و پے میں نہ جانے کون سا خمار تیرا کرتا تھا۔ ہر مسامِ جاں سے گویا مسرت پھوٹتی تھی۔

شروع شروع کے وہ دن جب جمیل نے اس کے ڈیپارٹمنٹ میں آنا شروع کیا تھا۔ وہاں اور بھی کئی لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ اس شعبے میں زیادہ تر لڑکیاں ہی تھیں۔ جمیل چاہتا تو اسے اپنے آفس میں بھی طلب کر سکتا تھا' کوئی بھی ہدایت دینے کے لئے' کوئی بھی وضاحت طلب کرنے کے لئے بلا سکتا تھا مگر وہ خود اس کے چھوٹے سے کیبن میں چلا آتا تھا جس کی شیشے کی ایک دیوار سے وہ پورے ہال پر نظر رکھتی تھی۔ کبھی سیمپلز میں الجھی ہوتی تھی اور کبھی آفس ورک نمٹا رہی ہوتی تھی۔

کبھی کبھی وہ اس بڑے ہال میں بھی چلا آتا تھا جہاں پیکنگ ہوتی تھی۔ ماہم لڑکیوں کی نگرانی کرنے کے لئے وہاں بھی جا کر کھڑی ہوتی تھی۔ فیکٹری کا چونکہ سارا ہی مال ایکسپورٹ ہوتا تھا اس لئے ماہم کی ذمے داری کچھ زیادہ ہی اہم تھی۔ ذرا سی لاپروائی' ذرا سے نقص سے باہر والے خریداروں کا اعتبار اٹھ جانے کا اندیشہ رہتا تھا۔ ماہم کو بہت الرٹ رہنا پڑتا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ کام پر ہوتی تھی۔ مگر پھر دھیرے دھیرے وہ بے چین ہونے لگی تھی۔ ہر چیز سے اس کا دھیان ہٹنے لگا۔ ہر طرف سے اس کی توجہ ہٹنے لگی۔

صرف اس لئے کہ جمیل کی نظریں اس کا تعاقب کر رہی ہوتی تھیں۔

دن میں کئی بار ان کے درمیان بات ہوتی مگر جمیل کی نظریں کہتیں کہ وہ بات درحقیقت کچھ اور ہی ہے جو وہ اس سے کہنا چاہتا تھا۔ نظریں تو وہ بات کہتی بھی تھیں مگر یہ گویا جمیل کے لئے کافی نہیں تھا۔ وہ اس بات کو ہونٹوں تک بھی لانا چاہتا تھا۔ بلکہ وہ اس کے لئے بے قرار تھا۔

ماہم، کالونی کے محدود ماحول میں شہر کی تیز و طرار زندگی سے دور پلی بڑھی تھی مگر شہر سے بہرحال اتنی لاتعلق بھی نہیں رہی تھی۔ تعلیم کے سلسلے میں وہ شہر جاتی رہی تھی اور پھر وہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ خیالوں خوابوں کی دنیا میں رہنا اسے پسند تھا۔ کبھی کبھی وہ اس مشغلے کی آغوش میں پناہ بھی لیتی تھی لیکن خوابوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے کوئی زخم کھانا اسے ہرگز گوارا نہ تھا۔

اور اسے معلوم تھا جب انسان بہت اوپر دیکھتا ہے تو ٹھوکر ضرور کھاتا ہے۔ اسے زخم ضرور آتا ہے۔

جمیل کروڑ پتی باپ کا بیٹا تھا۔ نہایت اسمارٹ اور ہینڈسم تھا۔ پڑھا لکھا تھا۔ کئی سال لندن میں گزار کر آیا تھا۔ فیکٹری میں ایسی کئی لڑکیاں موجود تھیں جو اس کی صرف ایک نگاہ کرم کو ہی کافی سمجھتیں، اس سے کچھ بھی نہ مانگتیں اور اپنا کل زادِ راہ اس کی جھولی ڈال دیتیں۔ اپنی متاعِ حیات اس کے سپرد کردیتیں اور کوئی شکوہ بھی نہ کرتیں۔ تہی دست رہ جانے کا انہیں کوئی ملال بھی نہ ہوتا۔

ان کے علاوہ ماہم ایک اور لڑکی کو بھی بہت اچھی طرح دیکھ چکی تھی۔ اس کا نام رملہ تھا۔ بہت امیر باپ کی بیٹی تھی۔ اسی سڑک پر، اسی انڈسٹریل ایریا میں اس کے باپ کا شیشے کی مصنوعات کا بہت بڑا کارخانہ تھا۔ دوسرے کاروبار بھی تھے۔ رہائش فیکٹری میں بھی تھی اور لاہور میں بھی کوٹھی موجود تھی۔ لاہور ہی کی ایک کاروباری بلڈنگ میں ان کے دفاتر بھی تھے۔

وہ سرخ رنگ کی ایک اسپورٹس کار میں ہر تیسرے چوتھے دن جمیل کے آفس آتی تھی۔ وہ خود بھی خوبصورت اور بھڑکیلی تھی اور اس کی کار بھی۔ پہناوا، رکھ رکھاؤ، انداز و اطوار ویسے ہی تھے جیسے عام طور پر زیادہ دولتمند گھرانے کی لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔

ماہم کو معلوم تھا کہ صرف رملہ کا ہی نہیں، اس کے تمام گھر والوں کا بھی جمیل کے ہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان کے درمیان خاندانی مراسم تھے۔

ماہم اپنے بارے میں کبھی خوش فہمی کا شکار نہیں رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ خوبصورت ضرور تھی اور لوگ اس کی خوبصورتی کی تعریف بھی کرتے تھے مگر اپنے آپ کو بہت زیادہ خوبصورت اس نے کبھی شمار نہیں کیا تھا۔ وہ ڈرتی تھی کہ اس کا یہ سوچنا کہیں محض خود پرستی ہی نہ ہو۔ کہیں اس کے دل میں خوش فہمیاں اور اونچی توقعات نہ گھر کرنے لگیں۔

اوپر سے اس کی خوبصورتی کو سہارے بھی میسر نہیں تھے۔ فیکٹری میں اس کی ماں اس سے بھی کم تر درجے کی کارکن رہی تھی۔ وہ اس کی جگہ بھرتی ہوئی تھی لیکن پھر اس کی محنت، اس کے پس منظر اور اس کی تعلیم کی وجہ سے اسے کچھ ترقی مل گئی تھی لیکن بہرحال وہ اب بھی ایک معمولی کارکن ہی تھی۔ وہ زیادہ اونچے خواب دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس قسم کی باتیں قصے کہانیوں اور فلموں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ حقیقی زندگی میں ایسے خواب زخم ہی دیتے ہیں۔

مگر وہ جو زیادہ محتاط ہوتے ہیں، شاید وہی خوابوں کے زیادہ اسیر ہوتے ہیں۔ اس نے بہت مزاحمت کی مگر وہ اس کے خوابوں پر چھاتا چلا گیا۔

وہی دزدیدہ نظروں کے تصادم.......... وہی ادھوری مگر معنی خیز سی باتیں۔ وہی تشنہ سی ملاقاتیں اور پھر دھیرے دھیرے اقرار۔ وہی عہد و پیماں۔ وہی مستقبل کے خواب۔ سب کچھ وہی تھا۔ وہی محبت کی پرانی کہانی تھی جو ان گنت جگہوں پر، ان گنت صفحوں پر، ان گنت مرتبہ لکھی جاچکی تھی مگر پھر بھی سب کچھ نیا لگتا رہا۔

پھر ایک روز تنہائی کی ایک ملاقات میں جب بات کچھ اور آگے بڑھنے لگی تو وہ گویا کسی نشیلے خواب سے چونکی اور سنبھل کر بولی۔ "یہ نہیں ہوگا جمیل!"

اپنے حساب سے وہ پہلے ہی بہت سی حدیں پھلانگ آئی تھی۔ اب مزید کوئی حد پھلانگنا نہیں چاہتی تھی۔ ماہم کو بڑے گھر کی بہو بننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ دولت اس کی کمزوری نہیں تھی۔ اس نے کبھی اپنی حیثیت پر کڑھ کڑھ کر وقت نہیں گزارا تھا۔ وہ اگر

بہت خوش نہیں رہی تھی تو اپنے حال پر کبھی غمزدہ افسردہ بھی نہیں رہی تھی۔

مگر محبت پر اس کا اختیار نہیں تھا اور محبت اسے جس راستے پر لے آئی تھی اس کی منزل تک پہنچنے کے لئے شادی ضروری تھی۔ خصوصاً جمیل کی بے تابیوں کو دیکھتے ہوئے۔

ماہم کسی قیمت پر کھلونا بننا نہیں چاہتی تھی۔

اور شادی کے سوال نے جیسے جمیل کو ایک بڑی الجھن میں ڈال دیا۔ بہت دن تک وہ ماہم کو سمجھاتا رہا کہ اس میں کیا قباحتیں تھیں' کیا رکاوٹیں تھیں۔

"ڈیڈی کبھی اس شادی کی اجازت نہیں دیں گے۔ میں ان کا چھوٹا بیٹا ہوں۔ شاید اسی لئے میری شادی کے سلسلے میں بھی ان کا رویہ زیادہ سخت ہے۔ ویسے بھی مجموعی طور پر وہ ایک سخت گیر انسان ہی ہیں۔" ایک روز جمیل نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔

ماہم پُرامید سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹھوڑی مسلتے ہوئے بولا۔ "انہوں نے بہت عرصے سے صاف طور پر کہہ رکھا ہے کہ وہ میری شادی ہم پلہ یا اپنے سے بھی اونچے لوگوں میں کریں گے۔ وہ ایسی شادی پر کبھی آمادہ نہیں ہوں گے جس سے دولت و کاروبار میں اضافہ اور تعلقات میں وسعت نہ آئے۔"

پھر ہچکچاہٹ آمیز سے لہجے میں اس نے تصدیق کر دی۔ "ڈیڈی نے تو میرے لئے گلاس انڈسٹریز کے مالک ناصر صاحب کی لڑکی رملہ کو پسند کر رکھا ہے۔ گو کہ ابھی ان لوگوں کی طرف سے کوئی واضح اشارہ نہیں ملا ہے۔ کوئی بات نہیں ہوئی ہے لیکن انہیں معلوم ہے کہ ڈیڈی ایسا ارادہ رکھتے ہیں اور رملہ سمیت وہ سب لوگ اس بات پر بہت خوش ہیں۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" ماہم کے لہجے میں' نہ چاہتے ہوئے بھی ہلکی سی تلخی در آئی۔ "لیکن تمہارا اپنا بھی کوئی نظریہ ہے یا نہیں؟ میرا خیال ہے اب تم کافی بڑے ہو چکے ہو۔ اپنی کوئی رائے قائم کرنے کے قابل تو ہو ہی گئے ہوگے؟"

"طنز مت کرو۔" جمیل ملائمت سے بولا۔ "تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میرا نظریہ' میری محبت' میری طلب' سب کچھ تم ہو' لیکن میں فلمی اور افسانوی انداز میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔ اس قسم کی کہانیاں فلم کی اسکرین یا کتابوں کے صفحات پر بہت اچھی

لگتی ہیں لیکن حقیقی زندگی میں بڑا لہو رُلاتی ہیں۔ محبت کو بڑا بدصورت بنا دیتی ہیں۔"

"کن کہانیوں کی بات کر رہے ہو تم؟" ماہم نے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں پوچھا۔

"وہی جن میں دولت مند باپ کے بیٹے یا بیٹیاں چیخ چیخ کر باپ کے سامنے اعلان کرتے ہیں کہ وہ کسی غریب لڑکے یا لڑکی سے محبت کرتے ہیں اور باپ کی ساری دولت و جائیداد کو ٹھکرا کر اس سے شادی کرنے جا رہے ہیں۔" جمیل نے جواب دیا۔

پھر وہ محبت سے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "میں نہیں چاہتا کہ ہم ابھی ڈیڈی کو ناراض کر دیں۔ وہ مجھے عاق کر دیں' گھر سے نکال دیں اور ہم شادی کر کے در در دھکے کھاتے پھریں یا پھر تنگ و تاریک مکانوں میں اپنی محبت کے مدفن تیار کریں۔ یقین کرو اگر ایسا ہوا تو بہت جلد محبت کا بھوت اتر جائے گا۔ عشق بہت بدصورت دکھائی دینے لگے گا۔ میں ان خوبصورت جذبوں کی موت نہیں چاہتا۔"

"پھر تم کیا چاہتے ہو؟" ماہم نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

وہ گویا اپنی ہی دُھن میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ڈیڈی معذور ہیں۔ دل کے مریض ہیں۔ وہیل چیئر پر رہتے ہیں۔ ان کے فیصلوں سے بغاوت کرنا' انہیں غصہ دلانا.......... ان کے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ بھی میں نہیں چاہتا۔"

"میں خود بھی نہیں چاہوں گی کہ ہماری وجہ سے انہیں کوئی صدمہ یا گزند پہنچے۔" ماہم دھیمے لہجے میں بولی۔ "خدا ان کا سایہ تمہارے سر پر سلامت رکھے۔"

جمیل تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "انہوں نے ہم دونوں بھائیوں کے لئے بہت قربانیاں دی ہیں۔ وہ جوان ہی تھے جب ہماری ممی کا انتقال ہو گیا تھا لیکن محض ہماری بہتری کی خاطر انہوں نے دوسری شادی نہیں کی تھی کیونکہ ہم دونوں بھائیوں کے ذہن میں سوتیلی ماں کا تصور بہت خراب تھا۔ انہوں نے ہمارے تمام تر بچپنے کے باوجود ہماری خواہش کو مقدم رکھا۔ اس بات کا خیال رکھا کہ سوتیلی ماں گھر میں نہ آئے اور ہماری نفسیات نہ بگڑنے پائے۔"

سگریٹ کا ایک کش لے کر اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "وہ اتنے بڑے صنعت کار بھی نہیں تھے۔ یہ فیکٹری زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن انہوں نے صرف ہمارے مستقبل کی

خاطر دن رات شدید محنت کی اور اسے صوبے کی سب سے بڑی گارمنٹ فیکٹری بنا دیا۔ ایکسپورٹرز کے حلقوں میں اپنی زبردست ساکھ بنالی۔ میں ان کے اتنے بڑے ایثار اور قربانیوں کے جواب میں انہیں کوئی صدمہ پہنچا کر موت کا تحفہ دینا نہیں چاہتا۔"

"یہ تو تم وہ باتیں بتائے جا رہے ہو جو تم نہیں چاہتے۔" ماہم آہستگی سے بولی۔ "مجھے ایک بار پھر اپنا سوال دہرانا پڑے گا۔ یہ بھی تو بتاؤ کہ وہ باتیں کون سی ہیں جو تم چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ ہم شادی تو ضرور کرلیں۔ کیونکہ میں تمہارے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا لیکن فی الحال ہمیں اس شادی کو خفیہ رکھنا ہوگا۔ میں رفتہ رفتہ یہ بات ڈیڈی کے کان میں ڈالوں گا کہ رملہ اور اس کا گھرانا مجھے پسند نہیں ہے۔ دھیرے دھیرے میں انہیں ذہنی طور پر تیار کروں گا کہ میری پسند کیا ہے۔"

ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر اس نے ماہم کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر بولا۔ "جب میں دیکھوں گا کہ وہ دھچکا برداشت کرنے کے قابل ہیں تو پھر میں انکشاف کروں گا کہ میں شادی کرچکا ہوں۔ اس دوران میں دو سال بھی گزر چکے ہوں گے اور مجھے اختیارات مل چکے ہوں گے۔ روپے پیسے پر میرا اختیار ہوگا۔ میں تمہیں لاہور میں کہیں کوٹھی اور گاڑی وغیرہ لے دوں گا۔ تم اور آنٹی آرام و آسائش سے رہ سکو گی۔ میں زیادہ تر وہیں تم لوگوں کے ساتھ ہی رہا کروں گا۔ اگر ڈیڈی نے زیادہ ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو میں یہاں کی رہائش مکمل طور پر ہی چھوڑ دوں گا اور تمہارے ساتھ صحیح طور پر لاہور ہی شفٹ ہو جاؤں گا۔ فیکٹری اور ایکسپورٹ کے کام سے اپنا حصہ لے لوں گا اور لاہور میں کوئی بزنس یا انڈسٹری شروع کرلوں گا۔"

"لیکن بات تو تقریباً وہی رہے گی۔" ماہم الجھن سے بولی۔ "میرا مطلب ہے کہ تم جب بھی اپنے اس فیصلے کا اعلان کرو گے' ڈیڈی کو صدمہ تو ہوگا۔"

"نہیں' میرا نکتہ شاید تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔" جمیل پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "کسی انسان کو رفتہ رفتہ ذہنی طور پر کسی بات کے لئے تیار کرنے کے بعد اس کے اظہار سے اتنا دھچکا نہیں لگتا۔ دوسرے اگر میں یہ کہوں کہ میں فلاں لڑکی سے شادی کرنا چاہتا

ہوں تو یہ کچھ اور بات ہے لیکن اگر میں یہ کہوں کہ میں شادی کرچکا ہوں تو یہ کچھ اور بات ہوگی۔"

ان کے درمیان بہت دن اس موضوع پر بات چلی تھی اور آخر کار جمیل نے اسے قائل کرلیا تھا۔ تیار کرلیا تھا۔

اب وہ سوچتی تھی تو فیصلہ نہیں کرپاتی تھی کہ اس میں زیادہ دخل یا زیادہ کمال کس کا تھا؟ اس کی اپنی کم عقلی کا؟ اس کی اپنی محبت کا؟ جمیل کی چرب زبانی کا؟ کمزور لمحوں کا؟ جلتی بجھتی خواہشوں کا؟ نا آسودہ تمناؤں کا.......... یا بس محض تقدیر کا..........؟

کیا وہ یہ کہہ کر بری الذمہ ہوسکتی تھی کہ بس.......... اس کی قسمت میں یہی لکھا تھا؟

ماہم کے ذہن میں سارے امکانات گڈمڈ ہو جاتے تھے اور وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتی تھی۔ اب نکتوں اور زاویوں میں الجھنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا۔ بلکہ اب تو اسے ہوئے ایک سال بھی بیت چکا تھا۔ ایک سال سے چوری چھپے کی شادی نبھ رہی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس شادی کا کوئی ثمر اس کی کوکھ میں پلنے نہیں لگا تھا ورنہ حالات نہ جانے کیا ہوتے۔ یہ بھی جمیل ہی کی احتیاط تھی۔

لیکن اب چند دنوں سے یہ سب کچھ نہ جانے کیوں ماہم کی برداشت سے باہر ہوگیا تھا۔ یہ رازداری' یہ چوری چھپے کی ملاقاتیں' یہ جرم کا احساس' سب کچھ ماہم کے لئے ناقابلِ برداشت سا ہوگیا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ اس کی فطرت عود کر آئی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے بارے میں اس طرح چھپ چھپ کر کوئی قدم اٹھانے کی درحقیقت قائل نہیں تھی یا پھر شاید یہ پچھتاوا تھا جو اب زیادہ شدت سے عود کر آیا تھا۔

ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی کہ وہ رملہ کو اب بھی ہمیشہ کی طرح جمیل کے آفس میں دیکھتی تھی۔ وہاں سے وہ دونوں اکٹھے ایک دوسرے کے گھر بھی جاتے دکھائی دیتے تھے۔ ماہم کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ دونوں اکٹھے لاہور کی تقریبات میں بھی جاتے تھے۔ گو کہ لاہور اس صنعتی علاقے سے آٹھ دس میل ہی دور تھا لیکن ان تقریبات سے وہ رات گئے ہی واپس آتے تھے۔

ماہم نے اس سلسلے میں جمیل سے کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا لیکن اس کے اند ہی اندر ٹوٹ پھوٹ سی ہوتی رہتی تھی۔ وہ......... جو بیوی نہیں تھی' اس کے ساتھ جمیل علی الاعلان ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پھرتا تھا اور جو بیوی تھی' اس سے دوسروں کے سامنے نظر ملا کر بات بھی نہیں کرتا تھا۔

اب تمام مصلحتیں ماہم کے سامنے ہیچ ہو کر رہ گئی تھیں۔ اعصاب تھک گئے تھے۔ دل اکتا سا گیا تھا۔ رواں رواں پکار رہا تھا کہ بات کو اِدھر یا اُدھر ہو جانا چاہیے تھا۔ یکسوئی مل جانی چاہیے تھی۔ یہ کوئی زندگی نہیں تھی۔

اور آج اس نیم تاریک کوارٹر میں اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک گیا تھا۔ یہ در و دیوار جو نہ جانے کتنی راتوں تک اس کی خلوتوں کے امین رہے تھے۔ یکایک ہی اسے بہت بُرے لگنے لگے تھے۔ وہ جیسے اس کے گناہوں کے تماشائی تھے۔ اسے اپنا آپ برا لگنے لگا تھا۔

جمیل نے اس کا ہاتھ تھام کر آہستگی سے بیڈ کی طرف کھینچا مگر وہ اپنی جگہ زمین پر گڑا ہوا بت بن گئی تھی۔

"آج تم بدلی بدلی سی لگ رہی ہو۔" جمیل بیڈ کے کنارے پر ٹکتے ہوئے سگریٹ سلگا کر بولا۔

"ہاں' تم نے ٹھیک محسوس کیا ہے۔ میں آج بدلی بدلی سی ہوں۔ بڑی کوشش سے میں نے اپنے آپ کو بدلا ہے۔" ماہم نے دھیمی سی آواز میں کہا اور جمیل کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں بس دھند ہی دھند تھی۔

وہ ٹھہرے ٹھہرے سے انداز میں بولی۔ "جمی! میرے خیال میں آج فیصلے کی رات ہے۔ میرے لئے اب اس احساسِ جرم کے بوجھ کو اٹھا کر مزید ایک قدم چلنا بھی ناممکن ہو گیا ہے۔ آؤ' آج ہم دونوں تمہارے ڈیڈی کے سامنے چلتے ہیں اور انہیں بتا دیتے ہیں کہ ہم ایک سال پہلے شادی کر چکے ہیں۔"

شاید ماہم کے فیصلہ کن انداز اور اس کے لہجے کی مضبوطی کو محسوس کرتے ہوئے جمیل کو جھٹکا سا لگا۔ سگریٹ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ اس کے چہرے پر ایک

رنگ آیا اور گزر گیا۔ اس نے ماہم کی آنکھوں میں جھانکا۔ آج ماہم نے اپنے مخصوص شرمیلے انداز میں نظریں نہیں جھکائیں۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ وہ آج اس کے دل کی بات پڑھنے کی کوشش کرنا چاہتی تھی جس میں شاید اس سے پہلے وہ ناکام ہی رہی تھی۔

اس نے رسالوں میں......... کتابوں میں بہت مرتبہ پڑھا تھا کہ آنکھیں دل کی ترجمان ہوتی ہیں۔ زبان چاہے کچھ بھی کہے لیکن آنکھیں دل کا بھید بتا دیتی ہیں مگر شاید جمیل کے معاملے میں یہ غلط تھا یا پھر وہ خود بہت اناڑی تھی' سادہ لوح تھی۔ اسے آنکھوں کے دریچوں سے دل کے آنگن میں جھانکنا نہیں آتا تھا۔ دل کا بھید پڑھنا نہیں آتا تھا۔

یا پھر شاید جمیل بہت مشاق تھا۔ اس کے لئے یہ کھیل نیا نہیں تھا......... اور صیاد جب تجربے کار ہو جائے تو وہ بھلا صید کو یہ جاننے کا موقع کب دیتا ہے کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ پنچھی کو اگر یہ پتا چل جائے تو وہ اس کے دام میں ہی کیوں آئے۔

مگر آج پنچھی کے تیور کچھ اور تھے!

جمیل اپنے مخصوص مضطربانہ انداز میں ہنسا اور بولا۔ "کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔"

"بچوں جیسی باتیں تو میں آج سے پہلے کرتی رہی ہوں' بچوں جیسا رویہ تو میرا آج سے پہلے تک رہا ہے۔ میں نے تو آج پہلی بار خود کو عقل مند محسوس کیا ہے۔ میری آنکھوں سے یک دم جیسے کوئی پردہ ہٹ گیا ہے۔ میرا تو خیال ہے مجھے عقل ہی آج آئی ہے۔" ماہم دھیمے لہجے میں کہتی چلی گئی۔

وہ شاید اپنے اضطراب کو چھپانے کے لئے ایک بار پھر دھیرے سے ہنسا اور بولا۔ "عقل کوئی وائرس نہیں کہ ایک دم انسان پر حملہ آور ہو۔ عقل دھیرے دھیرے آتی ہے۔"

"شاید دھیرے دھیرے ہی آئی ہے لیکن مجھے اس کا پتا آج چلا ہے۔" وہ بولی۔

"میرے خیال میں تو تم پہلے بھی بے وقوف نہیں تھیں۔ اچھی خاصی عقل مند ہو۔ کوئی کام اچانک نہیں کرتیں۔ ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھاتی ہو' لیکن آج تمہیں یکایک

کوئی وہم سا ہو گیا ہے۔ تم کچھ بدگمان سی نظر آرہی ہو۔" وہ کچھ مجروح سے لہجے میں بولا جیسے اس کا مان ٹوٹنے لگا ہو' اس کے اعتماد کو دھچکا لگا ہو۔

شاید اسے ماہم کی کمزوری یاد آگئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ماہم اس کا ایسا لہجہ برداشت نہیں کر سکتی تھی' اگر اسے ذرا بھی احساس ہوتا تھا کہ اس نے کسی بات سے جمیل کا دل دکھایا ہے تو وہ تڑپ اٹھتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی تلافی کیسے کرے۔

.... لیکن آج ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔

شاید اس لئے کہ آج تو خود اس کا اپنا دل مجروح تھا۔ سینے میں جیسے ان گنت زخموں کے منہ کھل گئے تھے۔ وہ کسی کا مان کیا رکھتی' اس کی اپنی روح کسی سہارے کی متلاشی تھی۔ کہنے کو اسے ایک مضبوط مرد کا سہارا میسر تھا۔ ایک باعزت اور باحیثیت مرد کا سہارا.......... لیکن کیا وہ اسے سہارا کہہ سکتی تھی؟ اسی سوال نے تو اس کا دل مجروح کر رکھا تھا۔

وہ جمیل کے لہجے سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر اسی مضبوط انداز میں' اسی غیر متزلزل لہجے میں بولی۔ "کیا تم میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ ڈیڈی کے سامنے جا کر اس حقیقت کا اعتراف کر سکو؟"

وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "تم اسی علاقے میں پلی بڑھی ہو' فیکٹری میں ایک عرصے سے کام کر رہی ہو۔ کیا تم میرے ڈیڈی کو نہیں جانتیں؟ ان کی شہرت سے واقف نہیں ہو؟"

"واقف تو ہوں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"تو کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ خبر سنتے ہی وہ ہم دونوں کو وہیں گولی مار دیں گے۔" جمیل بولا۔

ماہم نے سیٹھ سہیل کو دیکھا تو کم ہی تھا لیکن ان کی سخت گیری اور غصے کے واقعی بہت سے قصے سنے تھے۔ بہت تند مزاج اور جاگیردارانہ سی طبیعت کے مالک تھے.......... اب بھی.......... جبکہ وہ ایک عرصے سے وہیل چیئر اور بیڈ تک محدود ہو کر رہ گئے تھے اور

ڈاکٹروں نے انہیں غصے یا اشتعال میں آنے سے سخت منع کیا ہوا تھا' اس کے باوجود ان کے غیظ و غضب کے افسانے سننے میں آتے رہتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ علاقہ ان کی چھوٹی سے سلطنت ہے اور یہاں سبھی ان کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔

لیکن جب جمیل نے ماہم کو شادی کے لئے منایا تھا تو اس نے اپنے ڈیڈی کا جو نقشہ کھینچا تھا اس سے لاشعوری طور پر ذہن میں ایک بیمار' کمزور اور قابلِ رحم آدمی کا تصور ابھرتا تھا۔

عجیب بات تھی کہ اس وقت ماہم کو وہ تصور بھی حقیقت محسوس ہوا تھا۔ اس وقت وہ بھول گئی تھی کہ فیکٹری میں کام کرنے والے لوگ ابھی تک سیٹھ سہیل کے نام سے ڈرتے ہیں حالانکہ ایک عرصے سے انہوں نے فیکٹری آنا چھوڑا ہوا تھا۔ ماہم کو حیرت تھی کہ اسے ان کے تصور سے کیوں خوف محسوس نہیں ہوا تھا؟ ایک بار پھر وہی الجھن سامنے آتی تھی کہ یہ محبت کا کرشمہ تھا یا جمیل کی چرب زبانی کا؟ اس کسی کمزور لمحے نے حقیقت سے آنکھیں چرانے پر مجبور کیا تھا یا جلتی بجھتی خواہشوں نے' ناآسودہ تمناؤں نے یا پھر بس محض تقدیر نے؟

وہ کسی بھی فیصلے پر نہ پہنچ سکی۔ اس کے حواس گویا شل سے ہوئے جا رہے تھے۔

جمیل اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "ڈیڈی نے اگر ہمیں گولی نہ ماری تب بھی کھڑے پیروں مجھے عاق تو ضرور کر دیں گے۔ ہم کوڑی کوڑی کے محتاج ہو جائیں گے۔ تمہیں دھکے دے کر فیکٹری سے نکال دیا جائے گا۔"

ماہم جب بولی تو اسے خود اپنے لہجے کی بے خوفی اور مضبوطی پر حیرت ہوئی۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ نہایت ٹھہرے انداز میں بولی۔ "ہم میاں بیوی کی طرح تو رہ سکیں گے۔ دنیا کے سامنے سر اٹھا کر تو چل سکیں گے۔ ہماری خلوتیں ہماری اپنی ہوں گی۔ ہمیں قربت کے لئے یہ لمحے چرانے تو نہیں پڑیں گے۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں خوابوں کا رنگ لہرایا۔ بہت بڑے بنگلے میں.......... عالی شان گھر میں بہو بن کر جانے کا اسے کبھی ارمان نہیں رہا تھا۔ اسے تو بس کوئی چھوٹا سا مسکن چاہیے تھا جہاں وہ بے خوفی سے جمیل کو اپنا کہہ سکتی' اس کے ہاتھ

میں ہاتھ ڈال کر یوں کھڑی ہو سکتی کہ کوئی ان پر انگلی نہ اٹھاتا۔

"ہمارے خوابوں کو تعبیر ملنے میں کون سی دیر ہے؟ ایک سال ہی کی تو بات ہے۔ جس طرح ایک سال پلک جھپکتے میں گزرا ہے اسی طرح ایک سال اور گزر جائے گا" جمیل نے ایک بار پھر اسے تسلی دی۔

ماہم کے دل کو ٹھیس سی لگی۔ ایک نیا چرکا لگا۔ شاید جمیل کے لئے واقعی ایک سال پلک جھپکتے میں گزر گیا تھا.......... لیکن ماہم کے لئے وہ ایک سال کس طرح گزرا تھا' یہ خوب جانتی تھی۔ اس کے اعصاب پر کتنا بوجھ رہا تھا۔ کتنی راتیں اس نے جاگتے گزار تھیں۔ کتنی کتنی دیر اندیشوں' واہموں اور وسوسوں کے سانپ اسے ڈستے رہے تھے' یہ وہی جانتی تھی۔ سارا حساب جیسے اس کے دل پہ لکھا تھا۔ وہ تو کبھی صحیح طور پر جان نہیں سکی تھی کہ سہاگن ہونے کی لذت کیا ہوتی ہے۔

"یہ صرف تمہارا خیال ہے کہ ایک سال پلک جھپکتے میں گزر گیا ہے۔" وہ مجروح سے لہجے میں بولی۔ "شاید اسی لئے اس پورے سال کے دوران میں تم نے اشارتاً بھی اپنے ڈیڈی کو یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ رملہ تمہاری پسند نہیں ہے بلکہ.........."

جمیل نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تمہیں کیا معلوم کہ میں ڈیڈی سے کیا بات کرتا ہوں اور کیا نہیں۔" اس کے لہجے میں ذرا تیزی آگئی تھی۔ شاید خواہشوں کی تکمیل کے خوب صورت اور لذت انگیز سفر پر نکلنے کے بجائے بحث و تمحیص کے خارزار میں الجھ کر رہ جانا اسے دھیرے دھیرے چڑچڑاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

ماہم پھر بھی رسان سے بولی۔ "تم نے اس سلسلے میں کم از کم مجھے تو کبھی کچھ نہیں بتایا کہ تم نے ڈیڈی کو کوئی اشارہ دیا یا نہیں۔ تم تو ہمیشہ اس موضوع کو گول ہی کرتے رہے ہو اور ایسے کوئی آثار بھی دکھائی نہیں دے رہے کہ تم ڈیڈی سے کم از کم اشاروں کنایوں میں ہی بات کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔"

وہ کہنا چاہتی تھی کہ ہر دوسرے تیسرے دن تو تم رملہ کے ساتھ نہ جانے کہاں کہاں جاتے نظر آتے ہو۔ تم ذرا بھی گلٹی فیل نہیں کرتے؟ تمہیں میرا کوئی خیال نہیں آتا؟ لیکن وہ یہ سب کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ بیوی تھی' اسے اعتراض کرنے کا حق تھا مگر وہ

نہ کہہ سکی۔ اسے یہ بہت ہی چھوٹی بات لگی اور اس کی انا نے گوارا نہ کیا کہ وہ اتنی چھوٹی بات کرے۔ مگر اندر ہی اندر جو زہر پھیل رہا تھا اسے روکنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

جمیل نے شاید اسے کچھ اور سمجھانے کے لئے منہ کھولا مگر وہ اس سے پہلے ہی بول اٹھی۔ "جمی! نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ اگلا سال بھی یونہی گزر جائے گا۔ اس کے دامن میں بھی میرے لئے کوئی خوش خبری نہیں ہو گی۔" اس کے لہجے میں بلا کا دکھ تھا مگر جمیل نے اسے شاید ایک لمحے کے لئے بھی محسوس نہیں کیا۔

"تم بداعتمادی کا شکار ہو رہی ہو جبکہ ہمارے درمیان تو رشتہ ہی صرف اعتماد کا ہے۔" جمیل کے لہجے میں صاف طور پر چڑچڑاہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ "تم صرف بداعتمادی کا ہی نہیں بلکہ جلد بازی کا بھی مظاہرہ کر رہی ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بداعتمادی اور جلد بازی کی وجہ سے بنے بنائے کام بھی خراب ہو جاتے ہیں۔ ابھی وقت بالکل مناسب نہیں ہے۔ میں اس وقت ان کے سامنے یہ بات کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ میں نے فیکٹری کی ایک معمولی ورکر سے شادی کر لی ہے۔"

ماہم کے دل میں ایک بار پھر ٹیس سی اٹھی۔

"فیکٹری کی معمولی ورکر.........!" یہ الفاظ اس کی سماعت پر گویا انگارے بکھیرتے ہوئے گزر گئے۔

اسے وہ وقت یاد آیا جب جمیل نے اسے شادی پر آمادہ کرنے کے لئے گھنٹوں اس کی منتیں کی تھیں۔ کون سا بہلاوا تھا جو اس نے نہیں دیا تھا۔ کون سا خواب تھا جو اس نے نہیں دکھایا........... اور کتنا عاجزانہ تھا اس کا انداز.........! بس پاؤں چھونے کی کسر رہ گئی تھی۔

وہ زہر کا یہ گھونٹ بھی پی گئی اور بدستور ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں بولی۔ "بعض اوقات دل کو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اچانک ہی فیصلے کا لمحہ آن پہنچا ہے۔ میں اب ایک دن بھی انتظار نہیں کر سکتی۔ یہ کام ہمیں ایک نہ ایک دن تو کرنا ہی ہے۔ چلو آج ہی کر لیتے ہیں اور اس کے جو نتائج بھی مقدر میں ہوں گے وہ سامنے آجائیں گے۔"

پھر اس کا لہجہ کچھ اور فیصلہ کن ہو گیا۔ "مجھے آج ہر حال میں تمہارے ساتھ : ہے اور تمہیں اس شادی کا اعلان کرنا ہے۔"

"وہ حکم دے رہی ہو مجھے؟" جمیل کی آنکھوں میں شعلہ سا ناچ اٹھا۔

"نہیں' اپنا حق مانگ رہی ہوں۔" وہ بدستور نرمی سے بولی۔

"میں اس موضوع پر اب کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔ تم وعدہ خلافی کی مرتکب ہو ر ہو' تم نے ایک سال اور خاموش رہنے کا وعدہ کیا تھا۔" جمیل نے گویا یاد دلایا۔

"میں محسوس کر رہی ہوں کہ مجھ سے نہ جانے کتنی وعدہ خلافیاں سرزد ہو رہی ہ اور عدم تحفظ کے احساس نے مجھے وقت سے پہلے بولنے پر مجبور کر دیا ہے۔ تہی دست میں پہلے ہی تھی۔ تم سے شادی کر کے کچھ اور تہی دست ہو گئی ہوں۔ مجھے لگتا ہے ا ایک سال اور گزر گیا تو میں شاید بالکل ہی لٹی پٹی سی ہو کر رہ جاؤں گی۔ شاید کوئی میر طرف پلٹ کر دیکھنے والا بھی نہ ہو۔ میں جو غلطی کر چکی ہوں اسے روز بروز سنگین تر بن نہیں چاہتی۔"

"گویا تم سمجھتی ہو کہ تم نے مجھ سے شادی کر کے غلطی کی؟" جمیل چیختے ہوئے لہ میں بولا۔

"شادی تو غلطی نہیں ہے.......... لیکن ہم نے اسے غلطی کی طرح کیا ہے۔" ا اٹک اٹک کر بولی۔ تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس نے گویا اس الزام کو تسلیم کر لیا۔

"تو ابھی تمہارے پاس اس غلطی کی تصحیح کا موقع موجود ہے۔ واپسی کا راستہ ک ہے۔ ابھی تو کچھ نہیں بگڑا' کسی کو کیا پتا چلے گا کہ تم کیا کر چکی ہو۔ اس بات کو یہیں ختم دیتے ہیں۔" وہ سپاٹ سے لہجے میں بولا۔

ماہم آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ ایک لمحے کے لئے تو اسے یہی ش ہوا کہ اس کی اپنی سماعت اسے دھوکا دے رہی تھی۔ اس کے کان شاید اسے کسی اور ک کی آوازیں سنا رہے تھے۔ جب اسے یقین آ گیا کہ الفاظ بلاشبہ جمیل ہی کے تھے اور وہ ہی زبان سے انہیں ادا کر رہا تھا' تو وہ چکرا کر گرتے گرتے بچی۔

"یہ تم کہہ رہے ہو جمی.......... تم؟" اس کے حلق سے سرسراتی سی آواز نکلی۔

"میں کوئی بُری بات تو نہیں کہہ رہا۔ تمہارے مسئلے کا حل پیش کر رہا ہوں۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"اور تمہارا خیال ہے کہ ابھی کچھ نہیں بگڑا؟" وہ بدستور سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔

"نہیں' میرے خیال میں تو کچھ نہیں بگڑا۔ زندگی میں یہ سب تو چلتا ہی رہتا ہے۔" اس نے قدرے لاپروائی سے سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔

"تو.......... تو وہ محبتوں کے دعوے' وہ جینے مرنے کی باتیں' وہ ہجر و وصال کے قصے سب کچھ بس یونہی تھے؟ سب کچھ مٹا دو گے تم اپنے حافظے سے جیسے چاک سے بلیک بورڈ پر لکھا مٹایا جاتا ہے؟ کوئی دقت پیش نہیں آئے گی تمہیں؟ کوئی تکلیف نہیں ہو گی تمہیں؟"

یہ کہتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر عین جمیل کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے وجود پر ہلکا سا لرزہ طاری تھا۔ آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ اگر اسے کوئی خلافِ توقع جواب ملا تو وہ جان دے دے گی یا جمیل کے سر پر کچھ مار کر اسے ہلاک کر دے گی۔

جمیل گویا موقعے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے' کچھ سنبھل کر الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے بولا۔ "نہیں' یہ بات ہرگز نہیں ہے۔ مجھے تم سے اتنی ہی محبت ہے' جتنی اس روز تھی جب تم نے مجھے اپنایا تھا.......... لیکن میں تو تمہاری یہ بے رخی' تمہاری جلدی اور ہٹ دھرمی دیکھ کر ایک تجویز پیش کر رہا تھا۔ میں نے سوچا شاید تمہیں آزادی چاہئے' شاید تم اپنے آپ کو مقید محسوس کرتی ہو۔"

"ہاں' مجھے آزادی چاہیے۔" وہ نہایت دھیمے لہجے میں بولی۔ "مجھ کو آزادی چاہیے تمہیں اپنا شوہر کہنے کی' مجھے آزادی چاہیے تمہاری بیوی کہلانے کی۔ تمہارے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کی.......... اور کسی چیز کی مجھے نہ تو ضرورت ہے اور نہ ہی پروا۔"

"یہ محض تمہارا خیال ہے' دو دن میں یہ بھوت بھی اتر جائے گا۔ جس طرح فی الحال محبت کا بھوت اترا ہے اور یہ ازدواجیات کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔" وہ ناگواری سے بولا۔

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کا ہاتھ تھام کر دروازے کی طرف لے جاتے ہوئے بولا "ابھی تم غصے میں ہو' فی الحال گھر جاؤ کھانا کھاؤ اور بستر پر لیٹ کر ٹھنڈے دل سے......... میری باتوں پر غور کرو۔ اپنے آپ کو جذباتیت کے دھارے میں مت بہنے دو۔ ہم پھر کبھی سکون سے بیٹھ کر اس موضوع پر بات کریں گے۔"

وہ واقعی اس وقت اپنے آپ میں سکت بھی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اسے آج دھچکا لگا تھا اس نے گویا جسم سے جان ہی نکال کر رکھ دی تھی۔ اس کے وجود کے اندر کوئی سربہ فلک عمارت ریت کے گھروندے کی طرح زمیں بوس ہو گئی تھی۔

شاید وہ دل کا صنم خانہ تھا!

اس نے مشورہ قبول کر لیا۔ خاموشی سے وہ کوارٹر سے نکلی پھر چار دیواری سے باہر آئی اور تاروں کی چھاؤں میں پگڈنڈی پر یوں شکستہ قدموں سے چل دی جیسے اپنا سب کچھ پیچھے کہیں چھوڑ آئی ہو اور اب محض ایک موہوم امید کے سہارے کسی اجنبی سمت چلی رہی ہو۔ اپنے گھر کا تصور بھی اسے اجنبی لگ رہا تھا۔

اس نے جمیل کو خدا حافظ بھی نہیں کہا تھا۔ اس نے اسے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اس سے پہلے وہ تنہائی میں ملتے تھے تو ملاقات کے انداز بھی کچھ اور ہوتے تھے اور جدا ہوتے کے بھی۔ مگر آج تو جیسے سب کچھ ہی بدل گیا تھا۔

گھر پہنچ کر وہ جمیل کے مشورے کے مطابق کھانا تو صحیح طور پر نہ کھا سکی البتہ بستر پر لیٹ ضرور گئی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ٹھنڈے دل سے حالات پر غور کر رہی تھی یا تپتے ہوئے دل سے؟ مگر غور ضرور کر رہی تھی۔

اس کے وجود کے کھنڈر میں دور کہیں کوئی غیبی قوت سرگوشیاں کر رہی تھی۔ "ماہم ڈیئر! تم نے دھوکا کھایا ہے۔ ان بہت سی نادان اور سیدھی سادی لڑکیوں کی طرح جو خود کو بہت ذہین اور معاملہ فہم سمجھتی ہیں۔ تم کنوئیں کا مینڈک تھیں۔ ایک قصبے میں پیدا ہوئیں۔ بچپن وہاں گزارا۔ لڑکپن میں اس کالونی میں آ گئیں۔ تب سے اسی محدود دنیا میں ہو اور سمجھتی ہو کہ تم نے بہت کچھ دیکھ لیا۔ تم نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا لیکن اب نہ جانے کیا کچھ دیکھو گی۔ ابھی تک تو تمہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ دنیا کے کتنے

ہیں.........!"

وہ سوچتی رہی مگر موہوم سی امید کی کمزور سی ڈور ابھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ رات کے نہ جانے کس پہر اسے گویا سولی پر نیند آ گئی۔

☆======☆======☆

عالیہ کو بھی کبھی تو زندگی محض ایک خوابِ پریشان لگتی تھی۔ روز و شب کیا تھے' بس لمحوں کی بھول بھلیاں تھیں جن میں وہ بھٹکتی پھر رہی تھی اور گویا اپنا سراغ بھی کھو بیٹھی تھی۔ برسوں سے وہ گویا خود اپنی تلاش میں سرگرداں تھی مگر اسے اپنا نشان کہیں نہیں ملتا تھا۔

ملتا بھی کیسے؟

اس نے تو اپنی زندگی دوسروں کے لئے تج دی تھی۔ دوسروں کی زندگیوں میں پھول کھلانے کے لئے اس نے اپنے آپ کو مٹی میں ملا لیا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے اپنی تقدیر پر بھی غصہ آتا تھا۔ کیا ایسی ہوتی ہیں تقدیریں.........؟ وہ اپنے آپ سے پوچھتی۔

اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا' وہ کسی نہ کسی کی تیمار داری کرتی آ رہی تھی اور پھر ساتھ ساتھ زندگی کے دوسرے جھمیلے تھے۔ اپنی تعلیم جاری رکھنا' گھر کے تمام کام کاج کرنا اور ساتھ ساتھ ایک مستقل مریض کی نگہداشت اور دوا وغیرہ بھی کرنا ہمیشہ اس کے معمولات میں شامل تھا۔

یہ سارا بوجھ اس کے ناتواں کندھوں کے لئے بہت زیادہ تھا مگر کسی نہ کسی طرح وہ اسے اٹھاتی آئی تھی اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ذہن کو شل کر دینے والے ان تمام معمولات کے باوجود اس کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ پرائمری سکول سے یونیورسٹی تک— اس نے ہر امتحان باعزت طریقے سے پاس کیا۔

تیمارداری لڑکپن سے ہی اس کے ساتھ لگ گئی تھی۔

عالیہ ہائی اسکول میں تھی جب اس کی امی سیڑھیوں سے پھسل کر گر پڑیں اور ان کی ریڑھ کی ہڈی کا مہرہ کھسک گیا۔ ابتدا میں تو انہوں نے بہت ہی تکلیف اٹھائی۔ اسپتالوں' لیبارٹریوں اور ڈاکٹروں کے چکروں نے اس مختصر سے کنبے کے ہوش بھلا کر رکھ دیئے۔

کچھ عرصے بعد امی کی تکلیف میں تو کمی آگئی لیکن وہ مستقل بستر کی ہو کر رہ گئیں۔ چلنا پھرنا ان کے بس میں نہیں رہا تھا۔ ابتدا میں کچھ ڈاکٹروں نے امید دلائی تھی کہ سرجری سے ان کا علاج ممکن ہے لیکن بعد میں دو تین اسپیشلسٹ ڈاکٹروں نے یہ کہہ کر ڈرا دیا کہ اس آپریشن میں عمر بھر کے لئے کوما میں چلے جانے یا جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا امکان بھی موجود ہے۔ مسز عزیز کو بہرحال زندگی عزیز تھی۔ زندگی چیز ہی کچھ عجیب ہے۔ انسان کے دل میں ہر حال میں زندگی کی طلب زندہ رہتی ہے خواہ وہ زندگی بستر سے لگ کر ہی کیوں نہ گزارنی پڑے۔

عالیہ کی امی یعنی مسز عزیز نے بھی بستر کی ہو کر رہنا قبول کر لیا اور زندگی کا جوا نہیں کھیلا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی نرسنگ عالیہ کی ذمے داری ہو کر رہ گئی۔ اس کا کوئی بھائی یا بہن نہیں تھی۔ عزیز صاحب صبح ڈیوٹی پر جاتے تھے تو شام ڈھلے واپس آتے تھے۔

چنانچہ عالیہ کا یہ معمول بن گیا کہ وہ علی الصبح اٹھتی' اپنے اور اپنی امی کے تمام کام کرتی پھر انہیں ناشتا کراتی' آخر میں خود کرتی اور اسکول کی طرف دوڑتی۔ چھٹی ہوتے ہی اسکول سے گھر کی طرف دوڑنے والی وہ سب سے پہلی لڑکی ہوتی۔

وہ ہمیشہ پہلی بس پکڑتی خواہ اس کے لئے اسے پائیدان پر لٹکنا پڑتا جبکہ دوسری لڑکیاں کم از کم کھڑے ہونے کی جگہ میسر آنے کے انتظار میں کچھ دیر بس اسٹاپ پر کھڑی ہو لیتی تھیں مگر عالیہ کو آخری پیریڈ ختم ہونے سے پہلے ہی دھڑکا لگ جاتا تھا کہ امی گھر پہ اکیلی ہیں۔ اتنی دیر میں انہیں نہ جانے کیا کیا ضرورت پیش آئی ہو۔ نہ جانے ان کا کیا حال ہو' طبیعت کیسی ہو' کہیں انہیں کوئی ہنگامی ضرورت نہ پڑ گئی ہو۔ زندہ انسان کے سو مسائل ہوتے ہیں۔ انہی فکروں میں ہلکان وہ گرتی پڑتی گھر پہنچتی تھی۔

ان کے گھر میں خوش حالی نہیں تھی' اس کے باوجود عزیز صاحب نے کوشش کی کہ وہ بیوی کی دیکھ بھال اور گھر کے کام کاج کے لئے کوئی ملازم یا ملازمہ رکھ لیں مگر ایک معذور عورت کے ساتھ گھر میں چھوڑنے کے لئے کوئی بھروسے کا آدمی چاہیے تھا اور انہیں جو بھی امیدوار لڑکے یا عورتیں میسر آئیں ان کے بارے میں کسی نہ کسی اعتبار سے ان کا دل غیر مطمئن ہی رہا اور جن ایک دو امیدواروں کے بارے میں انہیں کچھ اطمینان

محسوس ہوا ان کے مطالبات پورے کرنا ان کی استطاعت سے باہر تھا۔ آخرکار انہوں نے اس سلسلے میں کوششیں ہی ترک کر دیں اور خود ہی مل جل کر زندگی کی گاڑی کو گھسیٹتے رہے۔

پھر رفتہ رفتہ وہ اپنے معمولات کے عادی ہو گئے۔ مسز شہناز عزیز کی معذوری بھی زندگی کا ایک حصہ بن گئی۔

.... مستقل بستر پر رہنے والے مریضوں کو جو زخم (BED SORES) ہو جاتے ہیں' ان زخموں نے مسز عزیز کی زندگی اور بھی اجیرن کر دی۔ ان کو سنبھالنے اور ان کی تکالیف کم کرنے کی کوشش میں عالیہ نڈھال ہو جاتی مگر ہر روز وہ ایک نئے عزم کے ساتھ معمولات کا آغاز کرتی۔

زندگی تو مسز عزیز کے لئے بھی گویا محض شرمندگی ہی بن کر رہ گئی تھی۔ شاید اسی لئے انہوں نے عالیہ کی ایثار پسندی سے زیادہ عرصے استفادہ حاصل نہیں کیا۔ ایک روز انہوں نے خاموشی سے بچے کھچے سانسوں کی پونجی لٹائی اور دبے پاؤں اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

عالیہ بہت روئی' تڑپی۔ ماں سے محروم ہونا تو ہر لڑکی کے لئے ہی ایک بہت بڑا سانحہ ہوتا ہے لیکن عالیہ کے غم میں تو ایک طرح کا پچھتاوا' ایک طرح کا تاسف' ایک طرح کی ندامت بھی شامل تھی۔ دل کو کاٹ ڈالنے والی ندامت..........!

اسے کئی ایسے لمحوں کا خیال آتا جب اس نے اپنی دانست میں ماں کی خدمت میں کوتاہی کی تھی۔ ان کی کسی خاموش ضرورت کو نظرانداز کیا تھا یا تھکن بہت زیادہ ہو جانے کی وجہ سے روزمرہ کے کسی چھوٹے موٹے معمول پر عمل نہیں کیا تھا۔

جب گھر میں کوئی مستقل مریض موجود ہو.......... خواہ وہ ماں ہی کیوں نہ ہو تو انسان کی زندگی میں کچھ نہ کچھ ایسے نظرانداز شدہ لمحے ضرور آتے ہیں جو بعد میں زندگی کا پچھتاوا بن جاتے ہیں۔ عالیہ کو افسوس تھا کہ امی نے تو اسے ان چھوٹی موٹی کوتاہیوں کی معافی مانگنے کی بھی مہلت نہیں دی تھی۔ وہ تو رات کے نہ جانے کون سے لمحے میں بغیر کچھ کہے' بغیر کچھ سنے اور بغیر کچھ مانگے اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔

لیکن رفتہ رفتہ ندامتوں کے زخم بھر ہی گئے
آتے آتے دل کی بے قراری کو قرار آہی گیا

اس وقت عالیہ بی اے فائنل میں تھی جب اس کے والد عزیز صاحب پر انکشاف ہوا کہ انہیں ٹی بی ہو چکی ہے۔ کافی عرصے سے انہیں اکثر و بیشتر ہلکی کھانسی اور پھر کبھی کبھار بخار آنے لگا تھا لیکن بظاہر چونکہ ان کی صحت کچھ ایسی تشویش ناک نہیں تھی اس لئے انہوں نے اسے کوئی اہم مسئلہ نہ سمجھا اور کبھی کمپنی کے پینل کے ڈاکٹروں سے اور کبھی گلی محلے کے ڈاکٹروں سے دوا لیتے رہے۔ انہوں نے بھی اس بات کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں دی کہ عزیز صاحب اکثر کھانسی بخار ہی کی شکایت لے کر آتے تھے۔

ویسے بھی ٹی بی کی طرف تو شاید کسی کا دھیان ہی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ ان دنوں بیشتر ڈاکٹر اس خوش فہمی میں مبتلا ہو چکے تھے کہ ٹی بی کا مرض ملک میں بہت کم رہ گیا ہے۔ کسی نے ان کے ٹیسٹ وغیرہ کرانے کی ضرورت نہ سمجھی اور یونہی روا داری میں دوا دیتے رہے۔ کبھی آرام آجاتا' تکلیف دب جاتی لیکن تھوڑے دنوں بعد دوبارہ شروع ہو جاتی۔

آخر انہوں نے کمپنی کے ڈاکٹروں کو چھوڑ کر پرائیویٹ طور پر ایک اسپیشلسٹ سے اپنا مکمل چیک اپ کرایا جس نے ان کے کئی تفصیلی ٹیسٹ کرائے کیونکہ اب انہیں مسلسل کھانسی اور حرارت رہنے لگی تھی۔ ٹیسٹوں کی رپورٹیں آئیں تو انکشاف ہوا کہ انہیں ٹی بی ہو چکی ہے۔

بیماری نے انہیں اتنا نقصان نہیں پہنچایا تھا جتنا بیماری کے انکشاف نے پہنچایا۔ ادھر دفتر والوں سے بھی یہ بات چھپی نہ رہ سکی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ دے دی گئی۔ اس چیز نے ان کے ذہن اور صحت پر اور بھی برا اثر ڈالا۔ انہوں نے اِدھر اُدھر کوئی دوسری ملازمت تلاش کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ جلد ہی وہ بستر سے لگ کر رہ گئے حالانکہ علاج چل رہا تھا۔

بستر پر انہیں بیماری کے علاوہ ناکامیوں اور ڈپریشن نے گرایا تھا۔ انہیں یہ احساس کچھ زیادہ ہی شدت سے ہونے لگا تھا کہ وہ عضو معطل ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس احساس نے ان

کی قوتِ ارادی ختم کر کے رکھ دی تھی۔ ٹی بی کا علاج ویسے بھی کسی کنوئیں کو پاٹنے کی کوششوں کے مترادف تھا۔ بس مریض کے جسم میں دوائیں اور خوراک انڈیلنے کا عمل جاری رہتا ہے لیکن کچھ پتا نہیں چلتا کہ کوئی چیز اثر بھی دکھا رہی ہے یا نہیں.........اور پھر ان کی تو زیادہ مہنگا علاج معالجہ کرانے کی حیثیت بھی نہیں تھی۔ ان کی کمزور قوتِ ارادی' مایوسی اور ڈپریشن بھی انہیں صحت یاب نہیں ہونے دے رہا تھا۔

چنانچہ ایم اے کے پہلے سال میں داخلہ لینے تک عالیہ کا ایک بار پھر وہی معمول بن چکا تھا۔ یعنی گھر سے باہر تعلیم اور زندگی کے دوسرے مسائل کے ساتھ ساتھ گھر میں ایک مستقل مریض کی تیمارداری۔

عزیز صاحب کی پنشن گھر چلانے کے لئے ناکافی تھی اور عالیہ ماس کمیونی کیشنز میں ایم اے کرنا چاہتی تھی جس کے لئے ریگولر اسٹوڈنٹ ہونا ضروری تھا۔ اگر وہ یونیورسٹی باقاعدگی سے اٹینڈ کرتی تو کوئی ڈھنگ کی ملازمت نہیں کر سکتی تھی۔ اگر ڈھنگ کی ملازمت ملنے کی امید رکھی جا سکتی تھی تو وہ ملازمت فل ٹائم ہی ہو سکتی تھی جبکہ اسے پارٹ ٹائم ملازمت سوٹ کرتی تھی۔

چنانچہ اس نے محض اپنے اخراجات خود اٹھانے اور تعلیم جاری رکھنے کے لئے گریجویٹ ہونے کے باوجود ایک گارمنٹ فیکٹری میں محض پیکنگ گرل کی حیثیت سے ملازمت کر لی کیونکہ فیکٹری میں دو شفٹیں چلتی تھیں اور وہ یونیورسٹی اٹینڈ کرنے کے بعد بھی سہولت سے دوسری شفٹ کے وقت پہنچ سکتی تھی۔ اس سے بہتر ملازمت تلاش کرنے میں وہ ناکام رہی تھی۔۔وہ یا عزیز صاحب ویسے بھی میل ملاقات یا اثر و رسوخ رکھنے والے لوگ تو تھے نہیں' ان کا تعلق تو ملک کے نچلے مگر سفید پوش طبقے سے تھا جو سمندر کی طرح ملک میں پھیلا ہوا تھا مگر اس کی کوئی اہمیت نظر نہیں آتی تھی۔ لگتا یہی تھا کہ اس طبقے کے لوگ کسی شمار قطار میں نہیں تھے۔

ریگولر اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے پڑھنے اور ساتھ ساتھ ایک تقریباً فل ٹائم ملازمت کرنے کے علاوہ گھر کے کام کاج اور ایک مستقل مریض کی دیکھ بھال سے اس پر مشقت کا بوجھ تو بہت بڑھ گیا لیکن اخراجات کچھ آسانی سے چلنے لگے۔ کبھی کبھی تو وہ حد سے زیادہ

ہی تھک جاتی تھی۔ رات کو سونے کے لئے بستر پر لیٹنے لگتی تو بے اختیار اس کی کراہیں نکل جاتیں۔

یونیورسٹی اور فیکٹری' دونوں ہی جگہوں پر وہ بے حد سمٹی سمٹی سی رہتی تھی۔ ذہن کے کچھ اندھیرے گوشوں میں ایک قسم کا احساسِ کمتری بھی رینگ آیا تھا۔ بظاہر تو اس کی نظریں جھکی رہتی تھیں لیکن کن انکھیوں سے تو وہ سب کچھ دیکھتی تھی۔ یونیورسٹی میں وہ اپنی کلاس فیلوز اور فیکٹری میں ساتھی لڑکیوں کو بے فکری سے قہقہے لگاتے دیکھتی' کسی کو کسی کا مرکزِ نگاہ بنتے دیکھتی' چاہنے اور چاہے جانے کے تماشے دیکھتی تو اپنا وجود اسے نہایت بے کار سا لگتا۔

اس کی طرف کوئی بھی تو نظر بھر کر نہیں دیکھتا تھا.......... اور اگر دیکھتا بھی تھا تو عالیہ کو وہم سا ہوتا کہ شاید دیکھنے والے کی نظریں اس کے لئے تمسخر تھا یا پھر ترحم۔ وہ اپنے آپ میں کچھ اور سکڑ سمٹ سی جاتی' محرومیوں کے زخم کچھ اور ٹیس دینے لگتے۔ اپنا سراپا' اپنا لباس اور اپنی صورت' سب کچھ بہت فضول سا لگتا۔

کبھی کبھی تو یہ احساسِ محرومی اور احساسِ کمتری اسے کچھ باغی بھی بنا دیتا تھا۔ کیا اس کے مقدر میں بس یہی لکھا تھا کہ وہ زندگی کا چراغ روشن رکھنے کے لئے دن بھر اپنی ہر رگِ جاں سے قطرہ قطرہ لہو نچوڑتی رہے اور راتوں کو اپنے خواب' تیمار داری کی بھینٹ چڑھاتی رہے؟ وہ اپنے آپ سے یہ سوال کرتی پھر یہ بھی سوچتی کہ اس آزمائش کی کوئی حد بھی ہو گی یا زندگی یونہی گزر جائے گی؟ کیا اس کی زندگی میں کبھی مسرت کا کوئی ننھا سا ستارہ بھی نہیں ٹمٹمائے گا؟ کیا وہ یونہی لمحوں کے اس صحرا میں برہنہ پا گھسٹتے گھسٹتے آخر ایک روز موت کی آغوش میں جا سوئے گی؟

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے یک لخت ہی اس کے اندر چھپی ہوئی ایک خالص مشرقی اور روایت پرست لڑکی انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی اور عالیہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے لگتی کہ وہ اس قسم کے سوالوں کو اپنے ذہن میں جگہ ہی کیوں دیتی ہے؟ اسے سوچ لینا چاہیے کہ اس کے مقدر میں جو کچھ لکھا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ مقدر کے لکھے کو تو کوئی نہیں بدل سکتا۔

دوسری بات یہ کہ اس نے تیمارداری اپنے والدین کی' کی ہے۔ خدا نے ہی اسے یہ توفیق دی ہے کہ وہ ان کی کوئی خدمت کر سکی.......... اور اس طرح اس نے خدا کا ہی فرمان پورا کیا ہے۔ جنت کمائی ہے' اپنی عاقبت سنواری ہے۔ اس کے والدین نے بھی تو اسی طرح نہ جانے کتنی راتیں کالی کر کے' کتنے برسوں کا سکھ برباد کر کے اسے پالا ہو گا۔ اگر ان کی خدمت میں یونہی زندگی تمام ہو بھی جائے تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں تھا اور پھر عالیہ کے سوا ان کا تھا بھی کون..........؟

یہ سب کچھ سوچ کر اسے قرار سا آجاتا۔ زندگی کا بوجھل پن کچھ کم ہو جاتا اور وہ نئے عزم سے اپنے معمولات کو نبھانے کے لئے نکل کھڑی ہوتی۔

انہی حالات میں اس نے فرسٹ ڈویژن میں ایم اے کر لیا۔ اپنے فرسٹ آنے پر اسے خود بھی حیرت ہوئی تھی کیونکہ گزشتہ دو برسوں میں اسے پڑھنے کے لئے بہت کم وقت ملا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اگر وہ کھینچ تان کر پاس ہی ہوئی تو یہ بڑی بات ہو گی۔

تاہم امیدیں زیادہ اونچی نہ رکھنے کے باوجود اس نے کچھ نہ کچھ خواب تو ضرور دیکھے تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ ماس کمیونی کیشنز میں ایم اے کرتے ہی اس کی زندگی میں کوئی بہت بڑا انقلاب آجائے گا۔ اس کی اصل دلچسپی تو ادب اور صحافت میں تھی۔ کم عمری سے ہی اسے اخبار' رسالے' کتابیں پڑھنے کا شوق تھا بلکہ اسے شوق سے زیادہ جنون کہنا چاہیے' جنون تھا تبھی تو وہ اپنی جان گسل مصروفیات میں بھی اس کے لئے کچھ نہ کچھ وقت نکال لیتی تھی۔

خرید کر پڑھنا وہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی اس لئے اخبارات تو فیکٹری میں یا یونیورسٹی کی لائبریری میں جو آسانی سے میسر آجاتے تھے' پڑھ لیتی تھی۔ رسالے اور کتابیں عوامی لائبریریوں سے کرائے پر لیتی رہتی تھی۔ شاید اس کے حالات کا رد عمل تھا کہ اسے ادب اور صحافت سے دلچسپی ہو گئی تھی۔

شاید یہ ایک راہِ فرار تھی۔ ایک الگ کوچہ تھا' ایک الگ دنیا تھی جہاں وہ اپنے حالات سے گھبرا کر پناہ حاصل کرتی تھی۔ وہ افسانے' ناول.......... حتیٰ کہ خبریں اور مضامین بھی پڑھتی تو خیال و خواب کی ایک نئی دنیا میں نکل جاتی۔ خیالوں اور خوابوں میں

ہر روز ہی ایک نئی دنیا اس کی منتظر ہوتی جہاں تمناؤں کی تکمیل کا مزہ......... یا پھر نئے زخموں کی کسک محسوس کرنے کی ایک انوکھی لذت سے واسطہ پڑتا۔ دوسروں کے قصے کہانیوں سے اپنے محسوسات تہہ و بالا ہونے کا تجربہ ہوتا۔

لیکن اس کا یہ شوق مطالعے کی حد تک ہی رہا۔ اس نے خود کبھی کچھ لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک تو وقت بھی میسر نہیں تھا۔ آخر وہ کیا کیا کرتی؟ اگر کبھی کسی طرح دو چار منٹ کی گنجائش نکل ہی آتی تو اس کی قلم کاری بس ڈائری تک ہی محدود رہتی۔ ایک آدھ صفحہ کالا کرکے اس کے دل کو قرار سا آجاتا۔

پہلے اس نے جرنلزم' اردو لٹریچر یا انگلش لٹریچر میں ایم اے کرنے کا سوچا تھا مگر خیال و خواب کی دنیا میں فکرِ معاش بھی ساتھ ساتھ چلتی رہتی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ ماس کمیونی کیشنز میں ایم اے کرلیتی ہے تو ادب ذ صحافت کی دنیا میں بھی اس کے لئے ملازمت کے مواقع موجود رہیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ ایڈورٹائزنگ کی دنیا میں بھی اس کے لئے زیادہ اسکوپ رہے گا......... اور وہ بھی بہرحال اسی دنیا سے جڑی ہوئی ایک دلچسپ اور رنگا رنگ دنیا تھی۔ اس دنیا میں جھانکنے بلکہ اس کی خاک چھاننے کا شوق بھی دل کے کسی گوشے میں موجود تھا۔

.... اور اب اس نے ایم اے کرلیا تھا۔

اس کے خیال میں اب خوابوں کو تعبیریں ملنے کا وقت آگیا تھا۔ انہی دنوں وہ فیکٹری بند ہوگئی' جس کی دوسری شفٹ میں وہ پیکنگ گرل کے طور پر کام کر رہی تھی۔

فیکٹری زیادہ بڑی نہیں تھی۔ کافی دنوں سے اس کے حالات خراب ہی چل رہے تھے۔ افواہیں سننے میں آرہی تھیں کہ بند ہو جائے گی۔ مالکان نے بینکوں سے کافی قرضے لئے ہوئے تھے اور ایکسپورٹ کے کئی بڑے آرڈر کینسل ہو گئے تھے۔ شاید کچھ اور وجوہات بھی رہی ہوں جن کا عالیہ کو علم نہیں تھا۔ بہرحال ایک دن فیکٹری پر تالا پڑ گیا۔

عالیہ کو فیکٹری بند ہونے کا دکھ ضرور ہوا کیونکہ اس سے بہت سے لوگوں کا روزگار وابستہ تھا لیکن اسے اپنی نوکری ختم ہونے کا کوئی افسوس نہیں ہوا کیونکہ وہ ویسے بھی کچھ عرصے تک نوکری چھوڑنے کا ارادہ کر چکی تھی خواہ اسے کوئی اچھی ملازمت ملتی یا نہ ملتی۔

ایم اے کرنے کے بعد اسے ایک چھوٹی سی فیکٹری میں پیکنگ گرل کہلاتے ہوئے زیادہ شرم محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کے ڈیپارٹمنٹ میں کوئی لڑکی مڈل سے زیادہ پڑھی ہوئی نہیں تھی۔ اگر نوکری اس کے اندازے سے کچھ پہلے ختم ہو گئی تھی تو اب یہ کچھ زیادہ تشویش کی بات نہیں تھی۔

اس نے جوش و خروش سے پہلے اخباروں اور رسالوں میں ملازمت تلاش کرنا شروع کی۔ یہ وہ دور تھا جب اخبارات و رسائل کا سیلاب نہیں آیا تھا اور اس کی آمد کے آثار بھی نمودار نہیں ہوئے تھے۔ گنتی کے چند ہی قابلِ ذکر اردو اخبارات تھے۔ عالیہ نے جب ان اخبارات کا رخ کیا تو اسے یوں لگا جیسے وہاں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ ایم اے کی وہ ڈگری جو اس نے بڑی جان جوکھوں سے حاصل کی تھی' اخبارات والوں کی نظر میں گویا اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ کئی جگہ تو اسے اتنی سرد مہری اور بے رخی سے ملازمت کے سلسلے میں جواب ملا کہ دفتر سے نکلتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اس نے رسالوں میں قسمت آزمائی کی۔ وہاں بھی کم و بیش وہی معاملہ رہا' بس ان کا رویہ ذرا بہتر تھا۔ ان میں سے ایک دو نے گویا اس پر احسانِ عظیم فرماتے ہوئے اسے جاب دینے پر آمادگی تو ظاہر کی لیکن یہ جاب محض پروف ریڈر کی تھی جو عالیہ کے خیال میں اس کی شایانِ شان نہیں تھی۔

اس نے دبے دبے لفظوں میں' خاصے محتاط اور مئودبانہ انداز میں اس طرف اشارہ کیا تو ایک ایڈیٹر صاحب نے تو خاصی ناگواری سے کہا۔ "بی بی! آپ کو ابھی آتا ہی کیا ہے؟ ماس کمیونی کیشنز میں ایم اے کرکے آپ سمجھ رہی ہیں کہ آپ ادب و صحافت میں ماسٹر ہو گئیں؟ اس ڈگری کی اہمیت ہمارے ہاں تو ردی کاغذ کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں۔ جو لڑکے لڑکیاں فریش ڈگری لے کر آتے ہیں انہیں تو کام کی الف ب کا پتہ نہیں ہوتا۔ کام سیکھنے کا عمل تو دفتر میں بیٹھنے کے بعد شروع ہوتا ہے اور اس کے لئے پروف ریڈر کے طور پر ہی آغاز کرنا پڑتا ہے بلکہ شروع میں تو آپ خود کو صحیح معنوں میں پروف ریڈر بھی نہ سمجھئے گا۔ ہم آپ کو کسی پروف ریڈر کے ساتھ اسسٹنٹ کے طور پر منتھی کریں گے۔ جب آپ کو صحیح معنوں میں پروف ریڈنگ آجائے گی تب آپ ہمارے لئے تھوڑی بہت

کار آمد ثابت ہو سکیں گی۔"

مزید کچھ عرصہ اس میدان میں دھکے کھانے کے بعد شاید وہ پروف ریڈر کے طور پر بھی ملازمت قبول کر لیتی' لیکن جب اس نے اس کام کی ابتدائی تنخواہ سنی تو اس کا یہ ارادہ بھی دم توڑ گیا۔ اس سے زیادہ تنخواہ گارمنٹ فیکٹری میں پیکنگ گرل کے طور پر لے رہی تھی۔ اس کے باوجود اس نے آزمائشی طور پر ایک جگہ کام کا آغاز کیا کہ شاید یہ ہمت شکن تجربہ آگے چل کر اس کے خوابوں کی تکمیل کا ذریعہ بن جائے........... لیکن اس کی یہ امید بھی پوری نہ ہو سکی۔ ان چند دنوں کے دوران میں ہی پروف ریڈنگ سکھانے والے سینئر پروف ریڈر اور ایڈیٹر صاحب کا رویہ اس کے ساتھ ایسا ہمت شکن اور کسی حد تک توہین آمیز رہا کہ ایک روز وہ دفتر کی سیڑھیاں اتری تو پھر پلٹ کر نہیں گئی۔ اس دفتر سے اس نے اپنی چند دن کی تنخواہ کا مطالبہ بھی نہیں کیا۔

خواب اس نے یہی دیکھے تھے کہ جونہی وہ ڈگری لے کر نکلے گی' اسے اخباروں اور رسالوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ کسی نہ کسی اخبار یا معروف رسالے میں وہ جلد ہی ایڈیٹر یا کم از کم اسسٹنٹ ایڈیٹر تو لگ ہی جائے گی۔ اس کا نہایت عمدہ سا دفتر ہو گا۔ بڑی سی میز ہو گی۔ دائیں بائیں دو ٹیلی فون ہوں گے۔ الماریوں میں مسودوں کی فائلیں سلیقے سے سجی ہوں گی۔

روزانہ نو آموز اور ناتجربہ کار........ مگر لکھنے لکھانے کے شوقین لڑکے اور لڑکیاں اس سے اپنے افسانوں اور مضامین کے بارے میں پوچھنے آیا کریں گے کہ وہ کب شائع ہو رہے ہیں۔ وہ ان میں سے بعض کو نہایت متانت اور بردباری سے لکھنے لکھانے کے اصول بھی سمجھانے کی کوشش کرے گی۔

لیکن جب وہ اپنی ڈگری لے کر عملی دنیا میں نکلی تو تھوڑے ہی عرصے میں اس کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ مختلف اداروں میں اسے جو بھی تجربہ ہوا اسے جو بھی جواب دیا گیا' اس سے قطع نظر اس نے اندازہ لگایا کہ زیادہ تر اداروں میں کوئی جگہ ہی خالی نہیں تھی۔ مستحکم اداروں میں زیادہ تر لوگ برسوں سے کام کر رہے تھے اور پوری پوری کوشش کی جاتی تھی کہ نئی جگہیں نہ نکلیں۔ مالکان کی کوشش تھی کہ کم سے کم اسٹاف

کے ساتھ کام چلتا رہے۔ اشد ضروری کاموں کے لئے مختصر ترین عملہ رکھا جاتا تھا۔

ادب اور صحافت سے مایوس ہو کر اس نے ایڈورٹائزنگ کی دنیا کا رخ کیا۔ وہاں بھی اس کے ساتھ کم و بیش وہی سلوک ہوا۔ یہاں مزید اضافہ یہ ہوا کہ اکثر ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں میں لوگوں نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے وہ کسی اور سیارے کی مخلوق ہو اور وہ حیران ہو رہے ہوں کہ وہ کس طرح ان کے دفتروں میں گھس آئی تھی۔

ادھر جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے' مالی حالات خراب تر ہوتے جا رہے تھے' نوکری کی ضرورت بڑھتی جا رہی تھی۔ احساس ہونے لگا تھا کہ باعزت ماحول رکھنے والی کسی فیکٹری میں پیکنگ گرل ہونا بھی کوئی ایسی بری بات نہیں تھی۔ مہینہ بھر جان کھپانے کے بعد ایک معقول رقم تنخواہ کی صورت میں مل جاتی تھی۔ بہت سے اخراجات اس سے کسی نہ کسی طرح چلتے ہی تھے۔

وہ حالات سے خاصی دل برداشتہ تھی' اسی دوران میں ریڈ روز گارمنٹس فیکٹری کا ایک اشتہار اس کی نظر سے گزرا۔ وہاں چند اسامیاں خالی ہوئی تھیں۔ عالیہ اس فیکٹری کی شہرت سے واقف تھی۔ کوئی سیٹھ سہیل صاحب اس کے مالک تھے اور یہ بہت بڑی فیکٹری تھی۔ ملک کے تمام بڑے بڑے ایکسپورٹرز اس سے مال خریدتے تھے اور فیکٹری خود بھی ایکسپورٹ کرتی تھی۔ عالیہ نے سن رکھا تھا کہ وہاں کا ماحول اور ورکنگ کنڈیشنز بہت اچھی تھیں' تنخواہ اور مراعات بڑی معقول تھیں۔

اشتہار میں جن اسامیوں کا ذکر تھا ان میں سے چیکر کی اسامی اسے اپنے لئے موزوں معلوم ہوئی۔ یہ کام وہ آسانی سے کر سکتی تھی۔ تنخواہ بھی معقول تھی۔ حالات سے گھبرا کر اس نے سر دست اپنے خوابوں کو بالائے طاق رکھا اور جلدی سے ایک درخواست لکھ کر روانہ کر دی۔ اس کی خوش قسمتی کہ کئی امیدوار لڑکیوں میں سے اس کا انتخاب کسی خاص ردوقدح کے بغیر ہو گیا۔

جب اس نے پہلے ماہ کی تنخواہ وصول کی تو گویا اسے سکون کی سانس آئی۔ ملازمت بری نہیں تھی۔ ورکنگ کنڈیشنز بھی اچھی تھیں۔ ابتدا میں اسے تین ماہ کی آزمائشی مدت کے لئے رکھا گیا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ ملازمت مستقل ہو جائے گی۔ ماحول بہت اچھا

تھا۔ کوئی تنگ کرنے والا یا اس کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنے و بھی آس پاس نہیں تھا۔ بہت سی جگہوں پر اس بات کا بھی دھڑکا لگا رہتا ہے اور یہ ایک بڑا دردِ سر ہوتا ہے۔ عالیہ کو یہ سوچ کر بھی خوف آتا تھا لیکن یہاں ایسا کوئی مسئ نہیں تھا۔

اس کی امیجیٹ باس بھی ایک لڑکی ہی تھی۔ ماہم اس کا نام تھا۔ اس کی صرف شکل صورت ہی نہیں، عادات بھی بہت پیاری تھیں۔ بہت خوش اخلاق اور نرم خُو تھی۔ ا کا رویہ عالیہ کے ساتھ شروع سے ہی بہت اچھا بلکہ کسی حد تک احترام آمیز رہا۔ شاید احترام اس کی تعلیم کی وجہ سے تھا۔ عالیہ کو زیادہ واسطہ اس سے ہی پڑتا تھا۔ جن دوسرے لوگوں سے کبھی کبھار واسطہ پڑتا تھا، عالیہ نے انہیں بھی اچھا ہی پایا۔

یعنی سب کچھ ٹھیک تھا........ مگر بس دل میں ایک خلش تھی۔

یہ مِس فٹ ہونے کی خلش تھی!

آئے دن اسے یہ احساس ستانے لگتا کہ ماس کمیونی کیشنز میں ایم اے اس نے اس لئے تو نہیں کیا تھا کہ وہ ایک گارمنٹ فیکٹری میں چیکر کے فرائض انجام دے۔ یہ کام کوئی آن پڑھ لڑکی بھی کر سکتی تھی۔ ادب، صحافت یا ایڈورٹائزنگ کی دنیا میں کوئی مقا بنانے کا جو ابال سا ذہن میں اٹھتا تھا وہ کبھی کبھی اسے خاصا بے چین کر دیتا اور اس کا دل چاہتا کہ اچھی تنخواہ اور ساری مراعات کو بھول بھال کر فیکٹری سے بھاگ نکلے لیکن پھ اسے یاد آجاتا کہ رسالوں، اخباروں اور اشتہاری ایجنسیوں میں اس کا استقبال کس طر ہوا تھا تو وہ کچھ دبک کر بیٹھ جاتی۔

لیکن ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال بہرحال موجود رہتا تھا کہ اسے یہ نوکری اس فیکٹری میں کوئی بھی نوکری ہمیشہ نہیں کرنی تھی۔ یہ تو ایک عارضی ٹھکانا تھا، ایک پڑا تھا، یہاں تو وہ صرف سنبھالا لینے کے لئے رکی تھی۔ یہ اس کی منزل نہیں تھی۔

ان محسوسات کے ساتھ دن گزارتے ہوئے ایک روز فیکٹری میں بیٹھے بیٹھے ہی و اشتہار اخبار میں اس کی نظر سے گزرا اور وہ ایک دم ہی یوں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی جیسے کرسی پر اچانک کرنٹ دوڑنے لگا ہو۔

اس روز وہ اتفاق سے ڈیوٹی ٹائم سے بھی کچھ پہلے فیکٹری پہنچ گئی تھی جبکہ اس کا کام ڈیوٹی ٹائم کے بھی کچھ دیر بعد ہی شروع ہوتا تھا۔ وقت گزاری کے لئے اس نے راستے میں ایک میز سے دو اخبار اٹھائے اور اپنی میز پر پہنچ کر ریلیکس ہونے کے انداز میں ایک اردو اخبار کھول کر بیٹھ گئی۔ فرصت میسر ہوتی تھی تو وہ سرسری انداز میں سارا اخبار دیکھنے کے بعد "ضرورت ہے" کے مختصر اشتہارات بھی دیکھتی تھی۔ اس کی نظر صرف اخباروں، رسالوں یا اشتہاری ایجنسیوں میں کسی اسامی کی تلاش میں بھٹکتی تھی۔ باقی اشتہاروں پر سے اس کی نظر تیزی سے پھسلتی چلی جاتی تھی۔

اس کی جاننے والی دو تین لڑکیوں نے اس کی توجہ ٹیچنگ کی طرف بھی مبذول کرانے کی کوشش کی تھی لیکن ایک تو اس کی ڈگری کی ٹیچنگ لائن میں کوئی خاص ڈیمانڈ نہیں تھی۔ دوسرے اسے خود بھی ٹیچنگ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اسے سال بہ سال ایک ہی طرح کے اسباق کو دہراتے رہنا اور چھوٹے بچوں یا نوخیز لڑکے لڑکیوں کے سامنے کھڑے ہو کر چیختے رہنا ایک مشکل کام محسوس ہوتا تھا۔ وہ تو کسی اچھی سی میز پر بیٹھ کر، کسی گوشۂ تنہائی میں پناہ گزین ہو کر کوئی تخلیقی کام کرنا چاہتی تھی۔

جب اس کی نظر چند سطروں پر مشتمل اس چھوٹے سے اشتہار پر پڑی تو اسے گویا گہری تاریکی میں امید کی ایک کرن دکھائی دی۔ شاید خوابوں کو تعبیر ملنے کا ابتدائی مرحلہ قریب ہی تھا۔ سنبھل کر بیٹھنے کے بعد اس نے دوبارہ ذرا زیادہ توجہ سے اس اشتہار کو پڑھا "ضرورت ہے" کے کالم میں چھپے ہوئے اس اشتہار کا مضمون کچھ یوں تھا۔

"بچوں کے ایک معروف اور برسوں سے شائع ہونے والے ماہنامے کے لئے مدیرہ کی ضرورت ہے۔ معقول تنخواہ کے ساتھ عمدہ ماحول میں کام کرنے کی ضمانت، تجربہ ضروری نہیں۔ جرنلزم میں یا ماس کمیونی کیشنز میں ایم اے کی ڈگری رکھنے والی امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔"

اشتہار میں ایڈریس پوسٹ بکس کا تھا۔

عالیہ اشتہار پر نظریں جمائے چند لمحے ساکت بیٹھی رہی۔ اس کے ڈیپارٹمنٹ کے دوسرے کارکنوں میں سے ابھی کوئی نہیں آیا تھا۔ اسے گویا یک سوئی سے خیالوں کے

گھوڑے دوڑانے کا موقع میسر تھا۔ رسالہ خواہ بچوں کا ہی تھا لیکن کسی رسالے کی مد بننے کا تصور ہی اس کے لئے بے حد سنسنی خیز تھا۔ اس کی کنپٹیاں پھڑکنے اور کانوں لویں یوں تپنے لگی تھیں جیسے اس کے رخساروں نے پہلی بار کسی کے مہرباں ہاتھوں کا لم محسوس کیا ہو۔ جیسے کسی نے اس کے کانوں کے قریب پہلی بار جذبات سے معمور کو سرگوشی کی ہو۔ جیسے.......... جیسے.......... نہ جانے کیا کچھ ہو گیا ہو۔

اس نے دزدیدہ سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ ا نے گھڑی دیکھی' ابھی لوگوں کی آمد شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ اس نے اپنی دراز کاغذ قلم نکالا اور درخواست کا ابتدائی خاکہ تیار کرنے لگی۔ وہ ایک بہت اچھی اور متا کن درخواست لکھنا چاہتی تھی جس پر نظر ڈالتے ہی پڑھنے والے کو اس کی اہلیت او قابلیت کا اندازہ ہو جائے۔

اس کی اپنی نظر میں تو اہلیت و قابلیت سے بھی زیادہ اہم اس کا جذبہ' اس کی لگ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی درخواست میں اس کے جذبے اور لگن کی جھلک بھ محسوس ہو۔

وہ سر جھکائے بڑی روانی اور انہماک سے لکھتی چلی گئی۔

☆=====☆======☆

ماہم دوسری صبح ناشتے کی میز پر سر جھکائے چند لقمے زہر مار کرنے کی کوشش کر رہ تھی۔ اسے احساس تھا کہ اس کی امی گہری نظروں سے بار بار اس کی طرف دیکھ رہی تھیں لیکن میز پر چونکہ بابر بھی موجود تھا' شاید اس لئے وہ کچھ کہنے سے گریز کر رہی تھیں۔ آخر کار وہ رہ نہ سکیں۔

"کیا بات ہے ماہم؟ کئی دن سے میں دیکھ رہی ہوں کہ کھانے پینے میں تمہارا دھیان بالکل نہیں ہوتا۔ تمہاری صحت بھی مجھے اچھی دکھائی نہیں دیتی۔ تم ٹھیک تو ہو؟" وہ تشویش زدہ سے لہجے میں بولیں۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں امی!" وہ جلدی سے سنبھل کر بولی۔ "آج کل کام بہت زیادہ ہے' دھیان اسی میں پھنسا رہتا ہے۔ کھانے کی طرف طبیعت راغب ہی نہیں

ہوتی۔"

"کام کو اپنی صحت سے زیادہ اہم مت سمجھو۔ مصروفیت تو سبھی کو رہتی ہے اور ہمیشہ رہتی ہے لیکن مصروفیات کی وجہ سے انسان کھانا پینا تو نہیں چھوڑ دیتا۔" امی نے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا۔

اس لمحے ماہم نے محسوس کیا کہ بابر بھی غور سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسے کام کی زیادتی کا بہانہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بابر بھی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ اس کا شعبہ گو کہ دوسرا تھا لیکن آج کل وہ زبردست مزدور لیڈر بنا ہوا تھا اس لئے اسے ہر شعبے کے بارے میں معلومات ہوتی تھیں۔ اسے یقیناً معلوم ہو گا کہ آج کل فیکٹری میں ایکسپورٹ کے مال کے زیادہ آرڈر نہیں تھے اس لئے کام روٹین سے بھی کچھ کم ہی ہو رہا تھا تاہم بابر نے خاموش رہنے پر ہی اکتفا کیا۔ البتہ اس نے دو ایک مرتبہ چبھتی ہوئی سی نظروں سے ماہم کی طرف دیکھا ضرور تھا۔

آخر ماہم ناشتہ تقریباً جوں کا توں چھوڑ کر اپنے کمرے میں جاتے ہوئے بولی۔ "جانے کے لئے تیار ہو جاؤں' آج مجھے دیر ہو گئی ہے۔"

کچھ دیر بعد وہ تیار ہو کر گھر سے نکلی تو بابر دروازے پر اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔ "میں تمہیں فیکٹری لئے چلتا ہوں' دیر ہو چکی ہے۔ پیدل جاؤ گی تو اور دیر ہو جائے گی۔"

کالونی سے فیکٹری تک کا فاصلہ چند منٹ کا تھا۔ دیر واقعی ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے دو تین مرتبہ دیر ہونے پر بابر کے ساتھ موٹر سائیکل پر گئی تھی۔ حالانکہ تاخیر سے آنے پر کوئی اس سے جواب طلبی نہیں کرتا تھا لیکن وہ اپنے احساسِ فرض سے مجبور ہو کر خود ہی ہمیشہ صحیح وقت پر پہنچنے کی کوشش کرتی تھی۔ بابر تو ویسے ہی مزدور لیڈر تھا۔ اس سے جواب طلبی کوئی مشکل سے ہی کر سکتا تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ ماہم آج اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا' امی دروازے پر کھڑی تھیں۔ وہ جلدی سے بولیں۔ "ہاں ہاں' ٹھیک ہے' تم بابر کے ساتھ چلی جاؤ۔"

امی کے دل کی بات ماہم خوب سمجھتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ماہم' بابر کو اپنے قریب آنے کا موقع دے۔ بظاہر بابر میں لیڈری کے جنون کے علاوہ کوئی خرابی بھی نہیں تھ لیکن نہ جانے کیوں ماہم نے کبھی اس میں کوئی کشش محسوس نہیں کی تھی۔ جمیل سے رسم و راہ بڑھنے سے پہلے بھی وہ اسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا......... اور اب تو بات ہی دوسری تھی۔

اب امی کے سامنے انکار کر کے وہ بات کو طول دینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ باد نخواستہ اپنے آپ کو خوب سنبھال سمیٹ کر بابر کے پیچھے بیٹھ گئی۔ گھر سے ذرا دور آتے ہی وہ بولا۔ "ماہم! کل رات تم فرح سے ملنے گئی تھیں نا؟"

فرح اس کی ایک دوست اور ساتھی کارکن کا نام تھا۔ وہ بھی اپنے والدین کے ساتھ کالونی میں ہی رہتی تھی۔ گزشتہ رات ماہم اس کے ہاں جانے کا بہانہ کر کے پہلے روشن با کے ہاں اور پھر جمیل سے ملنے گئی تھی۔

"ہاں۔" ماہم نے جواب دیا پھر اپنے لہجے کو ذرا تیکھا بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "کیوں......... کیا بات ہے؟ تمہیں پوچھنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟" یہ کہتے ہوئے اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔

"ضرورت تو کچھ ایسی خاص نہیں تھی۔" وہ بھی بظاہر سرسری لیکن درحقیقت ذرا چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "دراصل میں نے اتفاق سے تمہیں کالونی سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ سیٹھ صاحب کے بنگلے کی طرف"

ماہم کا دل بیٹھ سا گیا۔ اسے شبہ سا ہوا کہ اس وقت ضرور اس کے چہرے پر کوئی رنگ آکر گزر گیا ہو گا۔ غنیمت تھا کہ بابر کا منہ دوسری طرف تھا۔ اس نے کسی حد تک سچ بولنا بہتر سمجھا۔

وہ قدرے رکھائی سے بولی۔ "فرح کے ہاں جانے سے پہلے میں ذرا روشن بابا کے پاس گئی تھی' ہاتھ دکھانے........."

"عجیب اتفاق ہے کہ کل شام ہی میں نے فرح کو فیکٹری کی بس میں بیٹھ کر جاتے دیکھا تھا۔ وہ یقیناً شہر جا رہی تھی۔" بابر اب بھی سرسری سے لہجے میں بولا۔

کالونی میں مقررہ اوقات پر شٹل سروس چلتی تھی۔ اگر کوئی قریبی شہر یعنی لاہور جانا چاہتا تو اس بس کے ذریعے چلا جاتا تھا۔ قریب کی دوسری کالونیوں یا چھوٹے موٹے قصبوں اور دیہات وغیرہ سے بھی لوگوں کی آمدورفت جاری رہتی تھی۔ بابر نے یقیناً اسی بس کے ذریعے فرح کو جاتے دیکھا ہو گا۔ یہ تجربہ ماہم کو بھی کئی بار ہو چکا تھا کہ انسان جب جھوٹ بولتا ہے تو کوئی نہ کوئی ایسا اتفاق ہو جاتا ہے جس سے اس کا جھوٹ پکڑے جانے کی کوئی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

"تمہیں دھوکا ہوا ہو گا۔ وہ فرح نہیں' کوئی اور ہو گی۔ تمہارا خیال ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" وہ ذرا تیز لہجے میں بولی۔ کچھ عرصے سے اس میں جھوٹ بولنے کی جرأت پیدا ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے اپنی دیدہ دلیری پر حیرت ہوتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے تک اس نے......... اپنے آپ کو اس قسم کی لڑکیوں میں شمار کرنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا جو اس طرح روانی سے جھوٹ بول سکتی تھیں۔ کوئی معمولی سا بہانہ کرتے ہوئے بھی اس کی زبان لڑکھڑانے لگتی تھی۔

"ہو سکتا ہے مجھے دھوکا ہوا ہو۔" بابر ملائمت سے بولا۔ "اس کے باوجود میں ایک بات ضرور کہنا چاہوں گا ماہم.........!"

موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ کے باوجود اس کا ایک ایک لفظ صاف سنائی دے رہا تھا اور خنجر کی طرح ماہم کی سماعت میں پیوست ہوا جا رہا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ میں تمہیں اچھا لگتا ہوں یا برا' لیکن تم سے رشتے داری تو بہرحال ہے۔ اسے نہ تو تم ختم کر سکتی ہو اور نہ ہی میں۔ ہمارا خاندان ایک ہے اور میں کبھی پسند نہیں کروں گا کہ تمہاری وجہ سے خاندان کے نام پر حرف آئے۔"

ماہم کی کنپٹیاں کچھ اور سنسنانے لگیں۔ وہ اسے سختی سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس میں جرأت نہیں تھی۔ موٹر سائیکل پر وہ تھوڑا سا فاصلہ جلد ہی طے ہو گیا اور چند لمحے بعد وہ فیکٹری میں داخل ہو گئے۔ گیٹ پر کھڑے ہونے والے گارڈ انہیں اچھی طرح پہچانتے تھے اس لئے انہیں رسمی طور پر بھی کسی نے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ بابر نے موٹر

سائیکل' اسٹینڈ پر لے جا کر روکی اور ماہم اتر کر ایک لفظ کہے بغیر' اس کی طرف دیکھے تیزی سے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف چل دی۔

وہ ہال میں پہنچی تو اس نے دیکھا' عالیہ اپنی میز پر جھکی کچھ لکھ رہی تھی۔ ابھی کا کام شروع نہیں ہوا تھا۔ مال تیار ہو کر اس کی میز پر نہیں پہنچا تھا اور کل کا کام شایا کل ہی نمٹا گئی تھی۔ دوسرے لوگ آ کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو چکے تھے۔ کی آمد کا احساس ہونے پر عالیہ نے سر اٹھا کر دیکھا اور مسکرا کر سلام کرتے ہو غیرارادی سے انداز میں بازو رائٹنگ پیڈ پر رکھ لیا۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ جو کچھ لکھ رہی تھی اسے ماہم پڑھے۔

ماہم کو اس بات کا نہایت خفیف سا احساس ہوا لیکن اس وقت اسے ان باتوں پر تو دینے کی فرصت نہیں تھی۔ عام حالات میں بھی اسے کسی کی ذاتیات میں الجھنے اور تا جھانک کرنے کی عادت نہیں تھی۔ اسی طرح اس کا دل چاہتا تھا کہ کوئی اور بھی اس کی زندگی میں تاک جھانک نہ کرے۔

اس وقت اس کا ذہن اور بھی کئی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ عالیہ سے رسمی سے اند میں......... اور کسی حد تک مصنوعی سی گرم جوشی سے سلام دعا کر کے وہ آگے بڑھتی چ گئی۔ سب سے پہلے اسے پیکنگ ہال میں جا کر اپنی نگرانی میں پیکنگ شروع کرانی تھی اسے دیر ہو چکی تھی اور اسے معلوم تھا کہ پیکر لڑکیاں اس کے انتظار میں بیٹھی ہوں گی۔

پیکنگ ہال میں پہنچ کر اس نے پیکنگ شروع تو کرا دی لیکن اسے صحیح طور پر معلو نہیں تھا کہ کون سی لڑکی کیا کر رہی تھی۔ پیکنگ صحیح ہو بھی رہی تھی یا نہیں؟

وہ میزوں کے درمیان ٹہل رہی تھی لیکن اس کا ذہن نہ جانے کہاں بھٹک رہا تھا۔ وہ لڑکیوں کے پھرتی سے حرکت کرتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہ تھی۔ کچھ کام مشینوں سے ہو رہا تھا اور کچھ ہاتھوں سے......... اور ماہم بس الجھا ہوا ذہ لئے اِدھر سے اُدھر پھر رہی تھی۔

"ٹیبل نمبر سات اور آٹھ کی لڑکیاں صحیح پیکنگ نہیں کر رہی ہیں مس ماہم!" اچانک ماہم کے عقب میں یہ بوجھل سی آواز ابھری اور ماہم بری طرح چونک اٹھی۔

ہڑبڑائے ہوئے سے انداز میں اس نے مڑ کر دیکھا۔ نیوی بلیو سوٹ میں جمیل کا بڑا بھائی رمیز اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں تھے۔ قدرے چوڑے سے سرخ و سفید چہرے پر وہی گہری سنجیدگی تھی جو اس کی پہچان تھی۔ نہ جانے کس وقت وہ ہال میں آ گیا تھا۔ ماہم کو پتا ہی نہیں چلا تھا۔ شاید وہ آیا ہی اتنی خاموشی سے تھا' یا پھر ماہم ہی اپنے خیالوں میں کچھ زیادہ الجھی ہوئی تھی۔

رمیز اپنے چھوٹے بھائی جمیل کی طرح ہی دراز قد مگر اس سے ذرا بھاری جسامت کا تھا۔ وہ جمیل جیسا خوب صورت نہیں تھا اور نہ ہی اس کی شخصیت میں جمیل والی نزاکت و نفاست تھی۔ اس کے باوجود اس میں ایک الگ ہی قسم کی کشش تھی جس میں رعب اور دبدبے کی آمیزش بھی تھی۔

فیکٹری میں مشہور تھا کہ شخصیت کے اعتبار سے وہ اپنے باپ پر گیا تھا جبکہ جمیل ماں پر گیا تھا جو جوانی میں خوب صورت ترین عورتوں میں شمار ہوتی تھی جبکہ رمیز کو اس کے باپ کی جوانی کی تصویر سمجھا جاتا تھا۔ پُرسکون' مضبوط اور بارعب شخصیت کا مالک.........! وہ اگر غصے میں بھی ہوتا تو اس کے غصے کو صرف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس کے چہرے سے کبھی اس کے تاثرات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

اس کی شخصیت کسی چٹان سے مشابہ محسوس ہوتی تھی۔ چہرہ ہمیشہ پُرسکون اور بڑی بڑی آنکھیں کسی بے عنوان سوچ میں ڈوبی دکھائی دیتی تھیں۔ گویا بیشتر باتوں میں وہ اپنے بھائی کے بالکل متضاد تھا۔ وہ دونوں اگر قریب قریب کھڑے ہوتے تب بھی ان کے سگے بھائی ہونے کا تاثر مشکل سے ہی ابھرتا تھا۔

رمیز کسی ڈیپارٹمنٹ کی کارکردگی چیک کرنے کے لئے بہت کم آتا تھا۔ ماہم یوں تو روزانہ اپنی ڈیوٹی بڑی توجہ اور دیانت داری سے انجام دیتی تھی لیکن آج اپنے نجی معاملات اور اپنی ذہنی کیفیت کی وجہ سے اس کا دھیان کام میں نہیں تھا اور آج ہی رمیز راؤنڈ پر آ نکلا تھا۔ ماہم کو بڑی شرمندگی محسوس ہوئی۔

تاہم رمیز کے لہجے میں نہ تنبیہہ تھی اور نہ ہی ناراضی یا برہمی۔ اس بات سے ماہم کو ذرا حوصلہ ملا' لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا ردِ عمل ظاہر کرے؟ شرمندگی اور

ندامت کا اظہار کرے، معذرت کرے یا بس یونہی بات گول کرنے کی کوشش کرے؟

سچی بات تو یہ تھی کہ اس وقت وہ صحیح طور پر اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں رہی تھی۔ وہ بس ایک ٹک رمیز کی طرف دیکھتی رہ گئی اور اس لمحے ایک عجیب سا خیال اس کے ذہن میں آیا جس کا کم از کم اس صورتِ حال سے کوئی تعلق نہیں تھا جو اس وقت اسے درپیش تھی۔

وہ خیال یہ تھا کہ اگر جمیل کی جگہ رمیز ہوتا تو کبھی اپنے باپ سے چوری چھپے شادی نہ کرتا۔ شاید وہ کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ اس کی شخصیت میں خوف کا عنصر نہیں تھا۔ وہ بے شک پتھر کی طرح کھردرا معلوم ہوتا تھا لیکن پتھر ہی کی طرح اس کی ساخت میں کوئی پیچیدگی، کوئی فریب نہیں تھا۔ وہ جیسا باہر سے نظر آتا تھا، یقیناً اندر سے بھی ویسا ہی تھا۔

ماہم نے جھرجھری سی لے کر ان خیالات کو ذہن سے جھٹکا۔ یہ بھلا کون سا موقع تھا ایسی بات سوچنے کا..........؟

اس نے جلدی سے ٹیبل نمبر سات اور آٹھ کی طرف دیکھا اور دوبارہ رمیز کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔ "آئی ایم سوری سر! میں ذرا چُوک گئی تھی۔ میں ابھی ری پیک کراتی ہوں۔"

غنیمت تھا کہ غلطی جلد پکڑی گئی تھی۔ ابھی زیادہ کام نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں میزوں پر جا کر اس نے ڈبے دوبارہ کھلوائے، لڑکیوں کو ہدایات دیں اور واپس آ گئی۔

رمیز اپنی جگہ چٹان کی طرح جما کھڑا تھا مگر اس کی عقابی نظریں گویا ایک ایک میز کا جائزہ لے چکی تھیں اور ایک ایک لڑکی کی کارکردگی کو پرکھ چکی تھیں۔

اس نے گہری نظر سے ماہم کی طرف دیکھا اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "جمیل آج فیکٹری نہیں آیا ہے.......... اور شاید وہ آئے گا بھی نہیں۔ میں نے ابھی ابھی دیکھا ہے کہ اس نے پچھلے دو دن کی اسٹاک رپورٹ آپ کی رپورٹ سے ٹیلی نہیں کی ہے۔ کم از کم ایکسپورٹ کے معاملے میں یہ لاپروائی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ میں اس سے بات کروں گا فی الحال آپ اسٹاک کی فائل لے کر میرے کمرے میں آجائیے۔"

جواب کا انتظار کئے بغیر وہ مڑ گیا۔

ماہم نے اپنے کیوبیکل میں آ کر اسٹاک رپورٹ کی فائل نکالی اور احتیاطاً ایک بار خود چیک کر لی کہ کہیں اس سے تو کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔ مطمئن ہو کر وہ فائل لے کر رمیز کے آفس میں پہنچی۔ اسے بہت کم اس آفس میں آنے کا اتفاق ہوا تھا.......... اور اگر وہ آئی بھی تھی تو اس نے گرد و پیش پر غور نہیں کیا تھا۔

دونوں بھائیوں کی شخصیتوں کی طرح ان کے دفتروں کی آرائش میں بھی فرق تھا۔ جمیل کے آفس میں قالین، پردے اور صوفے وغیرہ شوخ رنگوں میں تھے۔ دیوار پر ایک غیر ملکی اداکارہ کا پوسٹر بھی آویزاں تھا جس کی ایک فیکٹری کے ڈائریکٹر کے آفس میں موجودگی کی کوئی تک نہیں تھی۔ اس کی میز پر ایش ٹرے سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھری رہتی تھی۔

رمیز کے آفس میں قالین، پردے اور صوفے وغیرہ گہرے رنگوں کے تھے۔ ہر چیز شیشے کی طرح صاف ستھری، چمکتی دمکتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سگریٹ کے بجائے سگار پیتا تھا لیکن بہت کم، ماہم نے شاذونادر ہی اسے تمباکو نوشی کرتے دیکھا تھا۔ اس کی ریوالونگ چیئر کے عقب میں دیوار پر چغتائی، صادقین اور شاکر علی کی ایک ایک چھوٹی چھوٹی پینٹنگ آویزاں تھی۔

اس نے آج پہلی بار ماہم کا سر تا پا جائزہ لیا اور اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے بعد خاموشی سے اس کی اسٹاک رپورٹ اپنی آفس فائل سے ٹیلی کرنے لگا۔ یہ موازنہ اس لئے کیا جاتا تھا کہ کسی راستے سے مال چوری ہونے کا کوئی امکان پیدا نہ ہو۔

رپورٹ کے اندراجات پر بال پوائنٹ سے نشان لگاتے ہوئے وہ سر اٹھائے بغیر سرسری سے لہجے میں بولا۔ "مس ماہم! میں نے کئی بار آپ کو جمیل کے ساتھ ایسی جگہوں پر دیکھا ہے جہاں میرے خیال میں آپ کو تو کیا.......... خود جمیل کو بھی نہیں ہونا چاہیے تھا.........."

ماہم اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گئی۔ آج تک وہ اور جمیل اس خوش فہمی میں رہے تھے کہ انہیں کوئی نہیں دیکھتا۔ آج اسے پہلی بار احساس ہوا کہ شاید اکثر محبت کرنے والے، چھپ چھپ کر ملنے والے، اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ انہیں کوئی نہیں

دیکھنا...... مگر زمانے کی آنکھ بڑی ظالم ہے۔ کسی نہ کسی جھری سے، کسی نہ کسی روزن سے انہیں دیکھ ہی لیتی تھی۔

نہ جانے کیوں ماہم کو ایک عجیب سی شرم...... ایک عجیب سی ندامت محسوس ہوئی۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو سمجھایا کہ شوہر سے کہیں بھی ملنا کوئی معیوب بات نہیں تھی لیکن یہ دلیل نہ جانے کیوں اسے کچھ زیادہ متاثر نہیں کر سکی۔ اس کا جی چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

رمیز نے اس کی طرف دیکھے بغیر بات جاری رکھی۔ شاید وہ اس کے چہرے پر خجالت کا رنگ دیکھنا نہیں چاہتا تھا اس لئے بدستور فائل پر نظر جمائے ہوئے تھا۔

اسی دھیمے اور ٹھہرے لہجے میں وہ بولا۔ ''مس ماہم! آپ خوب صورت ہیں...... اور خوب صورتی بیشتر مردوں کی طرح جمیل کی بھی کمزوری ہے۔ میں بڑا بھائی ہوتے ہوئے یہاں آفس میں بیٹھ کر فیکٹری کی ایک لڑکی کے سامنے، چھوٹے بھائی کے بارے میں اس طرح کی باتیں کرتا اچھا تو نہیں لگوں گا لیکن مجبوراً کر رہا ہوں......''

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا تو کمرے میں اتنا گہرا سکوت پھیل گیا کہ ماہم کو اپنے دل کی دھڑکنیں اپنی کنپٹیوں میں دھمک کی طرح سنائی دینے لگیں۔ وہ عجیب اعصاب شکن سا سکوت تھا۔ ماہم کو اپنی سانسیں رکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ آخر رمیز کیا کہنا چاہتا ہے؟ کیا کہنے جا رہا ہے؟ یہ سوال گویا ہتھوڑے کی طرح اس کے سر پہ برس رہے تھے۔

رمیز نے گہری سانس لے کر سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''آپ کا خیال ہو گا کہ میں آپ کو بالکل نہیں جانتا کیونکہ ہمارے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں کہ ایک دوسرے کو بہتر طور پر جاننے کا موقع ملے۔ میں ویسے بھی فیکٹری کے معاملات میں کم سے کم دخل دیتا ہوں، کم سے کم لوگوں سے ملتا ہوں۔ اس لئے زیادہ تر لوگوں کو یہی گمان گزرتا ہے کہ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن میں دیکھنے والی نظر اور سوچنے والا ذہن رکھتا ہوں۔ میں جسے بھی چند ایک مرتبہ دیکھ لیتا ہوں، تھوڑی بہت بات چیت کر لیتا ہوں تو اس کے بارے میں میری ایک رائے ہوتی ہے، آپ کے بارے میں بھی میری ایک رائے ہے......''

ماہم کے دل کی دھڑکنیں کچھ اور کہنے لگیں۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ

رمیز کی بھی اس کے بارے میں کوئی رائے ہو گی۔ اسے تو یہ بھی یقین نہیں تھا کہ رمیز صحیح طور پر فیکٹری میں اس کی موجودگی سے آگاہ بھی رہتا ہے یا نہیں؟ مگر وہ تو رائے کی بات کر رہا تھا۔ نہ جانے وہ رائے کیا تھی؟

''یوں سمجھئے کہ میں آپ کو کافی حد تک جانتا ہوں۔'' رمیز نے یہ کہہ کر اس کی کنپٹیوں کی سنسناہٹ کچھ اور بڑھا دی۔ ''یا پھر یوں سمجھئے کہ میں آپ کے بارے میں ایک رائے رکھتا ہوں، میرے خیال میں آپ ایک مضبوط شخصیت کی مالک تھیں۔ شاید اب بھی ہوں۔ سنجیدہ طبیعت کی مالک، پُروقار، اسی لئے مجھے آپ کی بھلائی مطلوب ہے۔ میں آپ کو وعظ یا نصیحت نہیں کر رہا اور نہ ہی آپ پر اپنا فیصلہ ٹھونسنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ہر انسان کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا اختیار حاصل ہے۔ میں تو صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میرا بھائی کوئی مستقل مزاج آدمی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ توقعات مت رکھیے گا۔''

ماہم کا دل چاہا کہ اس لمحے میز پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اسے بتائے کہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہا ہے، بہت تاخیر سے کہہ رہا ہے۔ ایک ثانئے کے لئے اس کا یہ بھی جی چاہا کہ اس کی باتوں کو جھٹلائے۔ کوئی جارحانہ سوال کرے...... مگر پھر یکایک ہی شکست خوردگی نے اس پر غلبہ پا لیا۔ یک دم ہی جیسے اس میں جھوٹ بولنے یا رمیز کو جھٹلانے کی جرأت دم توڑ گئی۔

اس کی سوچ کا پانسا پلٹا۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔ ''آخر مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میں صاف کیوں نہیں کہہ دیتی کہ وہ میرا شوہر ہے۔ میں جہاں چاہوں اس سے مل سکتی ہوں۔''

...... اور شاید وہ یہ کہہ بھی گزرتی مگر اسی لمحے رمیز نے فائل بند کر کے اس کی طرف بڑھا دی۔ اسے گویا بس اتنا ہی کہنا تھا، بات ختم ہو چکی تھی تب ماہم کا دل چاہا کہ وہ کوئی صفائی پیش کرے، حقیقت بیان کرے یا کچھ اور کہے...... مگر پھر اس کا کچھ بھی کہنے کو جی نہ چاہا، اس کا بس رونے کو جی چاہ رہا تھا، پھوٹ پھوٹ کر رونے کو، دل جیسے آئینہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔

اس نے فائل اٹھائی اور خاموشی سے اپنی کیوبیکل میں لوٹ آئی۔

☆=====☆=====☆

عالیہ کو بچوں کے رسالے کی طرف سے انٹرویو کے لئے کال آگئی۔

کال اس کے اندازے سے کچھ جلدی ہی آگئی تھی۔ رسالے کا نام بھی اسے تعجب خیز معلوم ہوا۔ رسالے کے لیٹر پیڈ پر اسے انگریزی میں ٹائپ شدہ ایک خط ملا تھا۔ رسالے کا نام تو کافی جانا پہچانا تھا لیکن عالیہ کا خیال تھا کہ شاید وہ برسوں پہلے بند ہو چکا تھا۔ وہ خود اپنے بچپن میں وہ رسالہ پڑھتی رہی تھی لیکن عمر کے ساتھ ساتھ خود اس کی اپنی دلچسپیاں اور ترجیحات بھی بدلتی چلی گئی تھیں اور کچھ وہ رسالہ بھی غیر مقبول ہوتے ہوتے آخر کار آنا بند ہو گیا تھا۔

عالیہ تو یہی فرض کر چکی تھی کہ شاید وہ رسالہ بند ہو گیا تھا لیکن اب اسے انٹرویو کے لئے خط ملا تو معلوم ہوا کہ وہ اب بھی چھپتا ہے لیکن شاید اس کی مقبولیت اتنی کم ہو چکی تھی کہ ہر جگہ بک اسٹالوں پر نظر نہیں آتا تھا۔ شاید مخصوص اور گنے چنے اسٹالوں پر دکھائی دیتا ہو۔

عالیہ کو قدرے مایوسی بھی ہوئی کہ اسے انٹرویو کے لئے بلاوا آیا۔ ابھی تو بچوں کے ایک ایسے رسالے کی طرف سے جو اب کہیں نظر ہی نہیں آتا تھا لیکن پھر اس نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ کم از کم رسالے کا نام اب بھی بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ تھا اور شاید بہت سے نوجوانوں.......... بلکہ اچھی بھلی عمر کے لوگوں نے بھی اسے بچپن اور لڑکپن میں پڑھا ضرور تھا اس لئے اگر وہ اس کی ایڈیٹر مقرر ہو جاتی تو شاید اسے لوگوں کو اس کے بارے میں بتانا اور مدیرہ کی حیثیت سے اپنا تعارف کرانا شرم ساری کا باعث نہ بنتا۔ لوگوں کے ذہنوں میں رسالے کا کم از کم نام تو زندہ تھا۔

.... اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ عالیہ اپنے ذوق کی تسکین چاہتی تھی۔ نوکری بے شک اس کی معاشی ضرورت تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر کام اس کے ذوق کے مطابق ہوتا تو شب و روز ذرا زیادہ اطمینان اور خوشی سے گزر سکتے تھے۔ اس مقصد کے لئے وہ مالی فائدے میں تھوڑی بہت کمی بھی گوارا کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے

انٹرویو کے لئے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

رسالے کے لیٹر ہیڈ پر رسالے کا پتا کچھ اور درج تھا۔ وہ اندرون شہر' اردو بازار کے کسی حصے کا ایڈریس تھا جبکہ اسے انٹرویو کے لئے ایرمال کے کسی ایڈریس پر بلایا گیا تھا۔ یہ ایرمال کے کسی کمرشل ایریا کا ایڈریس تھا۔ خط کسی جمال پاشا کی طرف سے تھا۔ وہ رسالے کا منیجنگ ایڈیٹر تھا۔ عالیہ کو یاد پڑتا تھا کہ جب وہ رسالہ پڑھا کرتی تھی تو یہ نام اس میں اس کی نظر سے گزرا تھا۔

جس روز اسے بلایا گیا تھا اس نے فیکٹری سے تین گھنٹے کی چھٹی لی اور رکشے میں بیٹھ کر مطلوبہ ایڈریس پر جا پہنچی۔ یہ ایرمال پر واقع کسی پرانی بلڈنگ کو گرا کر بنائی گئی ایک جدید اور بلند و بالا عمارت تھی جس میں کئی بڑی کمپنیوں کے دفاتر تھے۔ اسی کے ایک فلور پر "پاشا انٹرپرائزز" کا دفتر تھا جہاں اسے بلایا گیا تھا۔ اس عمارت میں دفتر ہونے اور پاشا انٹرپرائزز کے نام سے کمپنی ہونے کا مطلب عالیہ کے خیال میں یہی تھا کہ جمال پاشا ایک باحیثیت اور دولت مند آدمی تھا۔

عمارت میں صاف ستھری اور عمدگی سے چلنے والی لفٹیں بھی موجود تھیں۔ جب وہ ایک لفٹ کے ذریعے پانچویں فلور پر پہنچی اور پاشا انٹرپرائزز کے دفتر میں داخل ہوئی تو مرعوبیت کے ساتھ ساتھ اسے ایک قسم کی فرحت کا بھی احساس ہوا۔ غالباً وہ پورا فلور ہی کمپنی کے پاس تھا۔ شیشے کے دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی اس کے پاؤں گویا دبیز قالین میں دھنسنے لگے۔ بڑے سے ہال کے ایک گوشے میں استقبالیہ تھا جس کے کاؤنٹر پر ایک خوش گفتار لڑکی بیٹھی فون پر بات کر رہی تھی۔ اس کے بات کرنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خوش شکل ہی نہیں' خوش ادا بھی تھی۔ ہال میں ایئرکنڈیشننگ کی خنکی اور ایئر ریفریشنر کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ عالیہ کو یہ خیال بڑا دلکش محسوس ہوا کہ شاید ایڈیٹر کا کمرہ اسی آفس میں ہو۔ ایک خوب صورت' آرام دہ اور نہایت باعزت قسم کے آفس میں ایڈیٹر کے طور پر بیٹھ کر کام کرنے کا تصور اس کے لئے بڑا جاں فزا تھا۔

وہ ریسپشنسٹ کے سامنے جا کھڑی ہوئی جس کی فون پر بات چیت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ آخر اس نے بڑی ادا سے "بائے" کہہ کر ریسیور رکھا اور عالیہ کی طرف متوجہ ہوئی

تو عالیہ نے اپنا نام بتایا۔ اسے مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ریپشنسٹ کے چہرے پر یک دم خوش خلقی کے آثار پیدا ہو گئے اور وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''آپ یقیناً بچوں کے رسالے میں ایڈیٹر کی پوسٹ کے لئے انٹرویو دینے آئی ہیں۔''

عالیہ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''آپ تشریف رکھیے۔ میں ابھی پاشا صاحب کو اطلاع دیتی ہوں۔''

عالیہ آہستگی سے صوفے پر بیٹھ گئی اور اپنے حواس کو مزید سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے حیرت تھی کہ اس جاب کے لئے کوئی اور لڑکی یا عورت انٹرویو دینے کے لئے نہیں آئی تھی۔ کم از کم اس ہال میں کوئی نظر نہیں آ رہی تھی پھر اسے خیال آیا کہ شاید ایک وقت میں صرف ایک امیدوار کو بلایا جا رہا ہو۔ بعض ادارے اس طرح بھی انٹرویو لیتے تھے۔ ریپشنسٹ نہایت دھیمی آواز میں انٹرکام پر بات کر رہی تھی۔

آخر اس نے ریسیور رکھا اور مسکراتے ہوئے عالیہ سے مخاطب ہوئی۔ ''آیئے، میں آپ کو پاشا صاحب کے کمرے تک پہنچا دوں۔'' وہ کاؤنٹر کے عقب سے نکل کر آئی اور شیشے کے ایک دوسرے دروازے کی طرف بڑھی۔ عالیہ اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔

☆======☆======☆

جمیل کے آفس میں آج پھر رملہ آئی ہوئی تھی۔

ماہم اس کے آفس سے کافی دور اپنی کیوبیکل میں بظاہر ایک فائل پر نظر جمائے سکون سے بیٹھی تھی لیکن درحقیقت وہ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ اس کا ذہن اسی خیال میں اٹکا ہوا تھا کہ جمیل کے آفس میں رملہ موجود تھی۔

بہت دیر تک وہ ساکت بیٹھی رہی لیکن آخرکار فیصلہ کن سے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ مضبوطی سے قدم اٹھاتی جمیل کے آفس کی طرف جا رہی تھی۔ پختہ فرش پر اس کے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ آج کچھ زیادہ ہی گونج رہی تھی۔

جمیل کے آفس کے دروازے پر باوردی چپڑاسی نے اسے روک لیا۔ ماہم نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورا تو وہ ایک قدم پیچھے ضرور ہٹ گیا لیکن راستہ اس نے پھر بھی نہ چھوڑا۔

''کیا تم مجھے پہچانتے نہیں؟'' ماہم غرائی۔

چپڑاسی معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ''بی بی جی.........! پہچانتا ہوں لیکن صاحب نے سختی سے منع کر رکھا ہے کہ جب رملہ بی بی اندر بیٹھی ہوں تو کسی کو بھی اندر نہ آنے ا جائے۔''

''مجھے بھی.........!'' ماہم نے کچھ اور سخت لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں، آپ کو بھی.........'' چپڑاسی نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

ایک شعلہ سا ماہم کی کسی رگ جاں سے اٹھا اور دل کو جیسے خاک کر گیا۔ اس کے ک سراپا میں جیسے کوئی انجانی طاقت بھر گئی۔ جس حرکت کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی ی، وہ وہی کر گزری۔

اس نے ایک ہاتھ سے چپڑاسی کو ایک طرف دھکیلا اور دوسرے ہاتھ سے دروازہ ول کر اندر جا پہنچی۔

ماہم نے جب دروازے پر چپڑاسی کو ایک طرف دھکیلا تو اس کے اندر طوفان مچل رہا تھا لیکن جب اس نے کمرے میں قدم رکھا تو اسے خود پر حیرت ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے خود پر قابو پا چکی تھی۔ اس کا انداز طوفانی نہیں تھا۔ یک لخت ہی وہ کسی جھیل کی طرح سکون ہو چکی تھی۔

پہلے اس کی نظر رملہ پر ہی پڑی۔ وہ جمیل کے قریب بڑی نخوت سے ٹانگ پہ ٹانگ ئے ایک کرسی پر براجمان تھی۔ کہنے کو وہ کرسی ہی تھی مگر رملہ اس پر کچھ اس شان سے ی تھی جیسے وہ تختِ شاہی ہو اور کوئی ملکہ اس پر بیٹھی اپنے دربارِ خاص کا معائنہ کر رہی ۔

رملہ خوب صورت نہیں تھی۔ اسے صرف کسی حد تک خوش شکل کہا جا سکتا تھا ن جب سر سے پاؤں تک کی آرائش کے لیے خوب صورتی کے لوازمات موجود ہوں دولت کی چمک دمک بھی شامل ہو تو اچھے خاصے بدصورت بھی دلکش دکھائی دینے لگتے ۔ رملہ تو پھر بھی کچھ خوش شکل تھی۔

اس کے کلون کی مہک کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ماہم کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ

جب اسے کسی بھی وقت جمیل سے کسی بھی جگہ ملنے کے مواقع میسر تھے تو وہ آفس کیوں چلی آتی تھی؟

رملہ نے عجیب سی نظروں سے ماہم کا سر تا پا جائزہ لیا۔ ایک غیر اہم سی چیز طرح......... جسے انسان دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہا ہوتا مگر وہ یہ تاثر دینے میں زیادہ کامیاب نہیں رہی تھی۔

ماہم کا چہرہ میک اپ سے محروم تھا' اس کا لباس معمولی تھا۔ اس کا وجود خوشبو میں لپٹا ہوا نہیں تھا پھر بھی رملہ اسے ایسی نظروں سے دیکھتی تھی جیسے وہ اس کی آنکھ میں چبھتی ہو لیکن اپنی اس کیفیت کو وہ بے نیازی اور نخوت میں چھپانے کی کوشش کر تھی۔ وہ ماہم کو کئی بار فیکٹری میں اِدھر اُدھر دیکھ چکی تھی۔

جمیل نے گڑبڑا کر ماہم کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے یہ تو نہیں پوچھ سکا کہ چپڑا نے اسے کیسے اندر آنے دیا مگر یہ سوال اس کی آنکھوں میں ضرور تھا۔

"سر.........!" ماہم نے نہایت تلخ اور چبھتے ہوئے لہجے میں یہ الفاظ ادا کیا۔ "آ پیکنگ ہال میں تشریف لائیے۔ آپ کو ایک ضروری چیز دکھانی ہے۔"

"کیا وہ کسی اور وقت نہیں دکھائی جا سکتی؟ اس وقت میں ذرا بزی تھا۔" جمیل۔ اپنے لہجے میں باس والی سرد مہری لانے کی کوشش کی۔

"نہیں سر! یہ بہت ضروری ہے۔ بہت بڑی کنسائنمنٹ میں گڑبڑ ہو سکتی ہے۔" ما نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

رملہ بے نیازی سے اپنی ناخن پالش کا جائزہ لینے لگی۔ جمیل نے معذرت خواہا انداز میں اسے مخاطب کیا۔ "میں ابھی آیا رملہ.........! تم جانا مت۔"

رملہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

جمیل گویا بادلِ نخواستہ اٹھ کر ماہم کے ساتھ باہر آیا۔ ماہم پیکنگ ہال کی طرف جا کے بجائے راستے میں ایک راہداری میں رک گئی۔ اس راہداری سے کم ہی لوگوں کا گز ہوتا تھا۔ ایک طرف لمبی دیوار تھی جس کے عقب میں مشینوں کی گھرگھراہٹ سنائی د رہی تھی اور کچھ بلندی پر ائرکنڈیشننگ کے نظام سے منسلک گول گول شگافوں سے گر

ا باہر پھینکی جا رہی تھی جو ان کے سروں پر سے گزر رہی تھی۔ اس ہوا کی وجہ سے اہداری میں گرمی پھیلی ہوئی تھی۔ جمیل اپنے ایئرکنڈیشنڈ کمرے سے اٹھ کر آیا تھا' وہ ا رکتے ہوئے ناگواری محسوس کر رہا تھا۔

ماہم اس کی ناگواری کی پروا کیے بغیر دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے تلخ لہجے میں بولی۔

"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی مجھے یہ وقت بھی دیکھنا پڑے گا۔"

"کیسا وقت؟" وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"لگتا ہے اس جوانی میں ہی تمہاری یادداشت کافی کمزور ہو گئی ہے اور حواس جواب ینے لگے ہیں۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "یا پھر شاید یہ سب کچھ صرف میرے لیے ہے' سرے لوگوں کے لیے تم وہی جمیل ہو جس کا ذہن بہت تیزی سے کام کرتا ہے جسے وٹی سے چھوٹی بات اور معمولی سے معمولی وعدہ بھی اچھی طرح یاد رہتا ہے۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ۔" وہ ناگواری سے بولا۔ اس نے تکلفاً بھی اپنی چڑچڑاہٹ اور گواری کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ "یہ کوئی ایسی جگہ نہیں ہے کہ یہاں کھڑے ہو کر یلیاں بجھوائی جائیں۔ اشاروں اور علامتوں میں باتیں کی جائیں۔ صاف صاف کہو بات کیا ہے؟"

ماہم گویا خون کے گھونٹ پی کر اپنے لہجے پر قابو رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "اچھا! تمہاری سہولت کے لیے تمہیں صاف اور سیدھے انداز میں بھی یاد دلانے کی شش کرتی ہوں۔ معلوم نہیں اس کے بعد بھی تمہیں یاد آسکے گا یا نہیں۔ کل تم نے فون کر کے مجھے شام کو سرونٹ کوارٹر میں آنے کے لیے کہا تھا لیکن جب میں مقررہ ت پر وہاں پہنچی تو دروازے پر تالا لگا ہوا تھا اور مجھ احمق کے پاس اس تالے کی چابی ی نہیں ہوتی۔ اس سے پہلے کبھی ایسی نوبت ہی نہیں آئی کہ مجھے خود تالا کھول کر اندر ھ کر تمہارا انتظار کرنا پڑا ہو۔ ہمیشہ تم وہاں پہلے سے موجود ہوتے تھے۔ بلکہ کبھی کبھار ے ہی تم سے معذرت کرنا پڑتی تھی کیونکہ میں کسی مجبوری کی وجہ سے معمول کے ابق پہنچ نہیں پاتی تھی مگر........."

وہ ایک لمحے کے لیے یوں خاموش ہوئی جیسے آواز اس کے حلق میں اٹکنے لگی ہو۔

پھر وہ سنبھل کر بولی۔ "مگر کل شام میں آدھا گھنٹہ باڑھ کے پیچھے چھپ کر تمہارا کرتی رہی۔ میں کوارٹر کے سامنے کھڑی بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ تم میری پوزیشن کا ا کرسکتے ہو؟ محسوس کرسکتے ہو کہ میں اس وقت کس طرح اپنے آپ سے بھی شرمس رہی تھی؟"

اس کی بات سن کر بھی جمیل کے چہرے پر کوئی تغیر نہ آیا' ناگواری کی شکنیں ب رہیں۔

"میں ایک ضروری کام میں پھنس گیا تھا۔ مجبوری آن پڑی تھی' جس کی وجہ میں نہیں پہنچ سکا لیکن کیا یہ بتانے کے لیے مجھے اس وقت آفس سے اٹھا کر یہاں ضروری تھا؟ یہ بات پھر کسی وقت بھی ہوسکتی تھی۔" اس کے لہجے میں چڑچڑاہٹ ب تھی۔

"بہت تکلیف ہوئی ہے رملہ کے سامنے سے اٹھ کر آنے میں..........؟" ماہم لہجے میں زہر چھلک رہا تھا۔

"ماہم! آخر تمہیں یکایک کیا ہوگیا ہے؟ تمہارا رویہ یک دم ہی بدل گیا ہے۔ تم بروز صورتِ حال کو زیادہ سے زیادہ خراب کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔" وہ گویا ا غصے اور جھنجلاہٹ کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ندامت' شرمندگی اور فکر مند معذرت خواہی کا اس کے چہرے پر کوئی رنگ نہیں تھا۔

"میرا خیال ہے میری آنکھیں کھلنا شروع ہوگئی ہیں۔" وہ بے خوفی سے بو "میں نے جب سے شادی کے معاملے کو سامنے لانے کی بات کی ہے تب سے تم نے سے کترانا شروع کر دیا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہارے ارادے کچھ ٹھیک ن ہیں۔" سچی بات تو یہ تھی کہ ماہم اندر ہی اندر سخت خوفزدہ تھی۔ بظاہر وہ اس وقت جرأت سے جارحانہ انداز میں بات کر رہی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنے خوف چھپا کر بہادر بننے اور باہمت نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

خوف کی وجہ یہ تھی کہ اس کے پاؤں کمزور تھے۔ اس کے پاس نکاح نامہ تک نہ تھا۔ شادی ہوئی تھی تو جمیل نے کہا تھا کہ نکاح نامہ رجسٹر ہونے کے بعد اس کی ایک

ملے گی اور اس میں تقریباً ایک ماہ لگ جائے گا۔

ماہم اُس وقت اس کی محبت میں مخمور تھی۔ یہ باتیں اسے غیر اہم محسوس ہوئی تھیں۔ بعد میں کئی بار اس نے.......... سرسری انداز میں تذکرہ بھی کیا تھا مگر نکاح نامہ یا اس کی نقل ملنا تو درکنار' اسے اس کی صورت بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوئی تھی۔ جمیل نے ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اسے مطمئن کر دیا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ مکان لاہور کے کس علاقے میں واقع تھا جہاں اس کی شادی انجام پائی تھی۔ نکاح خواں کا نام کیا تھا.......... یا گواہ کون تھے؟

وہ اب سوچتی تھی تو حیران ہوتی تھی کہ کیا واقعی محبت اندھی ہوتی ہے؟ یا پھر محبت میں انسان اندھا ہو جاتا ہے؟ اس نے ہمیشہ خود کو ایک سمجھ دار لڑکی سمجھا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ یہ محض اس کی خوش فہمی اور خود پرستی تھی یا پھر واقعی محبت کا جادو انسان کو نادانی کی ان منزلوں تک لے جا سکتا ہے جن کا وہ عام حالات میں تصور بھی نہیں کر سکتا؟

"فار گاڈ سیک ماہم..........!" جمیل دانت پیس کر گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ "کیا یہ جگہ ایسی باتیں کرنے کے لیے مناسب ہے؟ اور یہ وقت ہے ایسے جھگڑے نکالنے کا؟"

"جھگڑے؟" ماہم نے حیرت سے دہرایا۔ "کون سے جھگڑے؟ اس میں جھگڑے والی کیا بات ہے؟"

"یہ جھگڑا نہیں تو اور کیا ہے؟" وہ گویا چلاتے چلاتے رہ گیا۔

"ہرگز نہیں' یہ کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ میں تو ایک طے شدہ حقیقت کی بات کر رہی ہوں۔ جھگڑا تو کسی ایسی بات پر ہوتا ہے جس کا تصفیہ ہونا باقی ہو' جس میں کوئی نکتہ وضاحت طلب ہو۔ میں جو بات کر رہی ہوں اس میں تو کوئی ایسا پہلو نہیں۔ میں تمہاری بیوی ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ اب تم تمام متعلقہ لوگوں کے سامنے اس حقیقت کو قبول کرلو۔ اپنی زندگی مجھے عجیب ذلت کی سی زندگی محسوس ہونے لگی ہے۔ میں اس طرح کے معمولات مزید برداشت نہیں کر سکتی۔"

غیر ارادی طور پر اس کی آواز رندھنے لگی۔ وہ اب بھی اپنے آپ پر قابو رکھنے کی

پوری کوشش کر رہی تھی لیکن اس کے سینے سے غم وغصے کا غبار اٹھ کر اس کے حواس پر پھیل رہا تھا' اس کی نظر کو دھندلا رہا تھا۔ اسے اپنے حلق میں آنسوؤں کی تلخی پھیلتی محسوس ہو رہی تھی۔

"کون کس کی بیوی ہے بھئی.......... اور کون سے جھگڑے ہیں؟ کیا قصہ ہے؟" یہ رملہ کی آواز تھی اور اچانک ہی ابھری تھی۔

وہ دونوں بری طرح چونک کر بیک وقت بائیں طرف مڑے۔ رملہ راہداری کے کونے سے نکل کر اچانک ہی سامنے آئی تھی۔ اس کے پیروں میں ہلکے پھلکے خوب صورت' امپورٹیڈ جوتے تھے۔ اس کی ذرا سی بھی آہٹ سنائی نہیں دی تھی اور وہ یک دم ہی ان کے سامنے آ پہنچی تھی۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ راہداری کے کونے پر' دیوار کی آڑ میں کچھ دیر سے موجود رہی ہو اور ان کی کافی گفتگو سن چکی ہو۔ یہ خیال فوراً ہی ماہم کے ذہن میں آیا تھا۔

جمیل کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا مگر وہ سنبھل کر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "کچھ نہیں.......... کوئی قصہ نہیں.......... وہ دراصل ایک مزدور اور اس کی بیوی کی بات ہو رہی تھی۔"

"اوہ..........!" وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ پھر اس نے ماہم کا سرتاپا جائزہ لیا۔ "میرے خیال میں تو سپروائزر صاحبہ تمہیں پیکنگ ہال میں کچھ دکھانے' کسی ارجنٹ مسئلے کے بارے میں بات کرنے کے لیے آفس سے بلا کر لائی تھیں۔ یہ راستے میں مزدور اور اس کی بیوی کا قصہ کہاں سے شروع ہو گیا؟"

جمیل گویا اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ "تم یہاں کیوں چلی آئیں؟ آفس میں بیٹھتیں' میں ابھی آ رہا ہوں۔"

"بس.......... میں دراصل گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شام کو گھر آؤں گی۔"

وہ بات جمیل سے کر رہی تھی مگر دیکھ ماہم کی طرف رہی تھی۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ جمیل نے اپنی دانست میں بات ٹالنے کی کوشش کی :

تھی لیکن رملہ اپنا سوال نہیں بھولی تھی۔

وہ اپنے گاگلز اتار کر ماہم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "کس مزدور اور اس کی بیوی کا قصہ ہے؟"

ماہم کے ضبط کا بندھن گویا یک لخت ہی ٹوٹ گیا۔ اسے نتائج کی پروا بھی نہیں رہی۔ یک دم ہی وہ جیسے پھٹ پڑی۔ "یہ ایک مزدور اور اس کی بیوی کا نہیں' ایک مزدور بیوی اور اس کے سیٹھ شوہر کا قصہ ہے۔ ایسے بزدل شوہر کا.......... جس میں علی الاعلان اپنی بیوی کو بیوی کہنے کی جرأت نہیں ہے۔ وہ مزدور بیوی میں ہوں۔" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا پھر جمیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "اور وہ بزدل شوہر یہ ہے.........."

ایک لمحے کے لیے تو رملہ کو بھی جھٹکا سا لگا مگر وہ بہت زمانہ ساز لڑکی تھی۔ اس جھٹکے کو پی گئی اور گاگلز کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے جمیل کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "یہ میں کیا سن رہی ہوں جمیل؟"

جمیل اب سنبھل چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی بجائے غصہ جھلک رہا تھا۔ وہی غصہ جسے وہ اب تک ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس عالم میں بھی وہ احتیاط کو نہیں بھولا۔ پہلے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی آ تو نہیں رہا.......... پھر وہ تیز لہجے میں بولا۔ "اس لڑکی کا یا تو دماغ چل گیا ہے یا پھر یہ کوئی سنگین مذاق کر رہی ہے مگر اس مذاق کی سنگینی کا اسے خود بھی اندازہ نہیں ہے۔"

"اچھا..........! تو یہ مذاق ہے؟ اور میں محض "ایک لڑکی" ہوں؟" اس کی آواز ایک بار پھر رندھنے لگی اور آنکھیں آنسوؤں سے دھندلانے لگیں۔ وہ بہادر بن کر لڑنا چاہتی تھی مگر آنسوؤں نے یک دم شکست خوردہ سا بنا دیا تھا۔

اس لمحے اسے ان لوگوں پر بہت غصہ آیا جو کہتے ہیں کہ آنسو عورت کا سب سے بڑا ہتھیار ہیں۔ اس کے خیال میں تو آنسو عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہیں' جو قدم قدم پر اس کے ناتواں ہونے کا بھید کھول دیتے ہیں۔ آنسوؤں کی ایک بہت بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ جن موقعوں پر انہیں نہیں بہنا چاہیے..........' ان موقعوں پر بھی بہہ نکلتے ہیں۔

"دیکھو لڑکی..........!" رملہ نخوت سے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

"چونکہ میں اس فیملی کی ہونے والی بہو ہوں' اس لیے مجھے اس معاملے میں دلچسپی لینی پڑ رہی ہے۔ دیکھو' یہ تو مجھے معلوم ہے کہ یہ مرد بڑے ہرجائی ہوتے ہیں۔ شادی سے پہلے تو کیا' شادی کے بعد بھی اِدھر اُدھر منہ مارتے پھرتے ہیں......... لیکن اس قسم کے افیئرز کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دینا ہم لڑکیوں کی سماجی مجبوری ہے لیکن اگر معاملہ شادی کا ہے تو مجھے سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا۔"

"رملہ.........!" جمیل اپنے مخصوص مضطربانہ انداز میں بول اٹھا۔ "تم بھی اس کی باتوں میں آگئیں یہ جو کچھ کہہ رہی ہے جھوٹ ہے۔ اسے ضرور کسی نے بہکایا ہے اور کوئی چکر چلانے پر اکسایا ہے۔ تمہیں معلوم ہے ہم جیسے خوش حال لوگوں کے خلاف اس قسم کی سازشیں ہوتی رہتی ہیں جو کارخانوں کے مالک ہوتے ہیں اور جن کے کارخانوں میں عورتیں بھی کام کرتی ہیں۔ وہاں یونینز بھی ہوتی ہیں۔ کاروباری مخالفتیں بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ کبھی کبھار ہم جیسے صنعت کاروں کے خلاف اس قسم کے اسکینڈل بنتے ہیں لیکن تمہیں اس سے تشویش زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اس معاملے سے نمٹ لوں گا......... تم اس کے چکر میں مت آؤ۔ اس سے پوچھو' اس کے پاس اتنے بڑے دعوے کا کوئی ثبوت ہے؟"

ماہم کو ایک لمحے کے لیے چکر سا آگیا۔ آخر اس سوال کا عفریت اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا جس کی دہشت اسے پہلے ہی اندر ہی اندر کھا رہی تھی۔

جس کی محبت میں الجھ کر اس نے آنکھیں بند کر کے اپنا کُل زادِ راہ لٹا دیا تھا' اس کا آنکھیں پھیر لینے کا صدمہ تو اپنی جگہ تھا مگر اب جبکہ ماہم نے اپنا راز ہونٹوں سے اُگل ہی دیا تھا تو اس سوال کی دہشت' صدمے سے بھی زیادہ تھی کہ اس کے پاس اپنے دعوے کا ثبوت کیا تھا؟

"ایک لڑکی جب اپنی زبان سے اقرار کرتی ہے کہ فلاں اس کا شوہر ہے تو اس کے پاس اس اعتراف سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟" وہ تیز و تند آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔ "وہ بھی محض چند الفاظ ہی ہوتے ہیں جو دو انسانوں کو اس بندھن میں باندھتے ہیں۔ یہ کاغذی کارروائیاں تو محض دنیاوی چیزیں ہیں۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین

ہیں لیکن اگر تمہاری نظر میں یہ چیزیں زیادہ اہم ہیں تو وہ بھی کسی نہ کسی طرح نکل آئیں گی۔ اب اتنا اندھیر بھی مچا ہوا نہیں ہے۔ تم نے آج تک مجھے بہلائے پھسلائے رکھا اور نکاح نامے کی نقل نہیں دی لیکن میں کوشش کروں گی تو کسی نہ کسی طرح جلد یا بدیر' ان لوگوں کا سراغ لگا ہی لوں گی جن کے سامنے نکاح ہوا تھا۔ جو گواہ بنے تھے اور ان مولوی صاحب کا پتہ بھی چل ہی جائے گا جنہوں نے نکاح پڑھایا تھا۔"

اپنی دانست میں ماہم بڑا مضبوط نکتہ ڈھونڈ کر لائی تھی اور اس کے لہجے میں ایک معصوم سی دھمکی پنہاں تھی لیکن جمیل یوں ہنس دیا جیسے اس نے کوئی بچکانہ سی بات کی ہو۔ ماہم دھندلائی ہوئی آنکھوں سے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

وہ اسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "لگتا ہے تم نے کوئی خواب دیکھا ہے اور وہ تمہارے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ تم کسی ماہر نفسیات سے مل کر اپنے بارے میں مشورہ کرو۔ اخراجات کی فکر نہ کرنا' وہ ہم ادا کر دیں گے۔ آخر تم ہماری اہم ورکرز میں سے ایک ہو۔"

پھر وہ رملہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ "آؤ چلیں' اس لڑکی سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ خواہ مخواہ کا کوئی اسکینڈل کھڑا کرنے کے چکر میں ہے لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ اس قسم کے اسکینڈل لڑکیوں کو ہی مہنگے پڑتے ہیں۔"

ماہم کا ذہن غوطے کھا رہا تھا۔ اسے نہ تو اپنی آنکھوں پر یقین آ رہا تھا اور نہ ہی اپنے کانوں پر۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔

جمیل نے اس کے سامنے بڑی اپنائیت سے رملہ کا ہاتھ تھاما اور وہ دونوں باہر جانے والے راستے کی طرف چل دیے۔ چلتے چلتے رملہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ماہم کے لیے ترحم تھا جو ماہم کی روح پر مزید چرکے لگانے کے لیے کافی تھا۔

وہ نہ جانے کس طرح اپنے کیبن میں واپس پہنچی' اس کا پورا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ہال میں کچھ کام شروع ہو چکا تھا جس کی نگرانی اسے کرنی چاہیے تھی لیکن اس وقت تو اس کے حواس ہی اپنے قابو میں نہیں تھے۔ اپنا آپ اس سے سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ اس نے اپنی اسسٹنٹ کو کام کی نگرانی کرنے کی ہدایت کی اور خود اپنے کیبن کی شیشے کی

دیواروں کے بلائنڈز گرا کر میز پر سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ اسے سنبھلنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔

اس نے دھوکا کھانے' اعتبار اٹھ جانے کے صرف قصے اور افسانے پڑھے تھے۔ کبھی کبھی اسے حیرت ہوتی تھی کہ لوگ اتنے عاقل و بالغ ہوتے ہوئے بھی کس طرح دھوکا کھا جاتے ہیں لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ دھوکا کھانا تو شاید نظام فطرت کا ایک حصہ ہے۔ محض عقل و دانش انسان کو دھوکا کھانے سے نہیں بچا سکتی۔ بچپنا رخصت ہونے کے بعد کسی کو اس بات کی گارنٹی نہیں مل جاتی کہ اب وہ دھوکا نہیں کھائے گا۔ یہ تو مقدروں کی باتیں ہیں' تقدیر کے کھیل ہیں۔ کوئی بھی انسان' کسی بھی وقت دھوکا کھا سکتا ہے۔ کوئی اچھا خاصا دانش ور بھی کسی کمزور لمحے میں کسی جاہل اور احمق سے انسان کے ہاتھوں بے وقوف بن سکتا ہے۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ سب دلیلوں میں وزن ہے لیکن دل بے ایمان تو دل ہی ہے۔ سمجھانے بجھانے سے' دلیلوں سے اسے قرار تو نہیں آسکتا۔ بار بار یہی سوچ کر اس کا دل بھر آتا...... کہ ابھی ابھی وہ جس جمیل کا سامنا کر کے آرہی ہے' یہ وہی جمیل ہے جو اس کی زلفوں سے کھیلتے ہوئے ساتھ جینے ساتھ مرنے کے عزم کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اسے تو کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ جمیل اس کی زلفوں سے کھیلتے کھیلتے اس کی زندگی سے بھی کھیل سکتا ہے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اسے دھوکا دے سکتا ہے۔ اس کے سامنے ہر تعلق سے منکر ہو سکتا ہے۔

ہر کمزور انسان کی طرح ایک لمحے کے لیے اس کا دل بھی غم و غصے سے بھر گیا۔ اس کا دل چاہا کہ جمیل کو قتل کر ڈالے' اس کی بوٹیاں نوچ لے' محبتوں سے تراشا ہوا اپنا یہ صنم ریزہ ریزہ کر دے۔ مگر دھیرے دھیرے اسے تسلیم کرنا پڑا کہ یہ بھی تو اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ واقعی ایک کمزور اور بے سہارا لڑکی ہے۔

بلکہ اب تو اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے خواہ مخواہ غصے اور جذبات میں آکر اپنا راز اس لڑکی کے سامنے اگل دیا تھا جو اس کے لئے ایک زہریلی رقیب ثابت ہو سکتی ہے۔
لیکن پھر اس نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ خود رملہ کے لیے بھی مصلحت کا تقاضا یہی ہے

کہ وہ اس معاملے کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ یہ چیز اس کے مفاد میں نہیں ہے اور خود جمیل بھی اسے یہی سمجھا رہا ہو گا۔

"بے خوفی تو اب مجھے ہونی چاہیے۔" ماہم نے سوچا۔ اب ایک بار بات ہونٹوں پر آہی گئی تھی تو گویا جھجک جاتی رہی تھی۔ جس بات کو وہ دل کے بند کواڑوں میں چھپاتی رہی تھی اسے چھپائے رکھنے کا اب کوئی فائدہ تو رہا نہیں تھا۔ جمیل نے اپنی اصل صورت تو دکھا ہی دی تھی۔ اب تو اس نے بالکل صاف طور پر بتا دیا تھا کہ شروع سے ہی اس کے دل میں کیا تھا۔ خواہشوں کے بھوکے پرندے نے اپنا پیٹ بھر لیا تھا۔ اب وہ نئی منزلوں کی تلاش میں تھا۔

اب تو ماہم کو بربادی کے اس صدمے سے سنبھلنا تھا اور فیصلہ کرنا تھا کہ دل پر اتنا گہرا زخم لے کر وہ کیونکر زندگی گزارے گی؟ یہ کوئی معمولی ٹھوکر نہیں تھی جس کے بعد وہ آسانی سے سنبھل جاتی۔

☆========☆========☆

ریسپشنسٹ کی رہنمائی میں عالیہ شیشے کے اس سیاہ دروازے تک پہنچی جس سے اندر کا منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ریسپشنسٹ نے دروازہ تھوڑا سا کھولا لیکن خود باہر ہی کھڑی رہی۔ خوش خلقی سے مسکراتے ہوئے اس نے عالیہ کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ عالیہ نے اس کا شکریہ ادا کر کے دھڑکتے دل کے ساتھ اندر قدم رکھا۔

وہ نہایت سلیقے اور خوش ذوقی سے آراستہ کیا گیا ایک خوب صورت کمرہ تھا۔ اس کی تزئین و آرائش یقیناً کسی اچھے انٹیریئر ڈیکوریٹر کی رہین منت تھی۔ تمام تر سادگی کے باوجود دولت کی شان نمایاں تھی۔

ایک خوب صورت اور چمکتی میز کے پیچھے جو شخصیت موجود تھی وہ بھی متاثر کُن اور باوقار تھی۔ یقیناً وہی پاشا صاحب تھے۔ وہ غالباً پچاس سے اوپر کے تھے۔ ان کی قلمیں سفید تھیں اور بالوں میں بھی سفیدی غالب تھی اور انہیں خوب رُو یا وجیہہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود ان کی شخصیت دلکش تھی۔

عالیہ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اس کے استقبال کے لیے مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ایک دولت مند آدمی' کمپنی کا مالک' اپنے ہاں ملازمت کی امیدوار کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑا ہو؟ یہ کچھ عجیب سی بات تھی اور ان کی مسکراہٹ.........! گو کہ وہ بردباری سے ہی مسکرا رہے تھے لیکن اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ جوانی میں اس مسکراہٹ نے بہت سی عورتوں کے دل دھڑکائے ہوں گے۔ تاہم عالیہ کا دل اس وقت ہلکی سی گھبراہٹ سے دھڑک رہا تھا۔ کافی دن بعد اسے کوئی انٹرویو دینے کا اتفاق ہو رہا تھا اور یہاں کے طور طریقے' انٹرویو کے انداز ذرا الگ اور غیر رسمی ہی معلوم ہوتے تھے۔

"آیئے......... آیئے عالیہ.........! تشریف رکھیے۔" انہوں نے اپنے مقابل پڑی

ایک خوب صورت اور آرام دہ کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ لہجہ اور انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ بہت پہلے سے عالیہ کو جانتے ہوں اور وہ مسلسل مسکرائے بھی جا رہے تھے لیکن مجموعی طور پر ان کا انداز مشفقانہ ہی تھا۔ وہ روایتی قسم کے باس معلوم نہیں ہوتے تھے اور ان کے انداز و اطوار میں کسی بھی قسم کے گھٹیا پن کا شائبہ تک نہیں تھا۔ مجموعی طور پر وہ ایک دلکش' شائستہ اور مشفق آدمی تھے۔ عالیہ نے فوراً ہی ان کے بارے میں دل میں رائے قائم کر لی۔

"کیا پئیں گی آپ.........؟ چائے' کافی یا ٹھنڈا؟" وہ بیٹھ چکی تھی۔ پاشا صاحب نے خود بھی بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

یہ اس کی حیرتوں میں ایک اور اضافہ تھا۔ ملازمت کی امیدوار سے چائے کافی کے لئے پوچھا جا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو اسے شبہ ہوا کہ کہیں پاشا صاحب اسے ملازمت کی امیدوار کے بجائے کوئی معزز مہمان تو نہیں سمجھ رہے تھے؟ کہیں انہیں غلط فہمی تو نہیں ہو گئی تھی؟ لیکن پھر اسے یاد آیا کہ ریسپشنسٹ لڑکی نے' جو شاید ان کی سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دیتی تھی' انہیں انٹرکام پر اس کے بارے میں یقیناً اچھی طرح بتا دیا تھا۔

"بہت شکریہ' میرا خیال ہے ان تکلفات کی ضرورت نہیں۔" عالیہ اپنی گھبراہٹ کو کامیابی سے چھپاتے ہوئے بولی۔

"لیکن میں تکلفاً نہیں پوچھ رہا۔" پاشا صاحب کی مسکراہٹ کچھ اور روشن ہو گئی "چائے وغیرہ کا سلسلہ چلتا رہے گا تو ہم ذرا زیادہ ریلیکس ہو کر گفتگو کر سکیں گے۔ دراصل میرا اپنا چائے کا موڈ ہو رہا ہے۔ اگر آپ ساتھ دیں گی تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"چلیے۔ اگر آپ کا موڈ ہے تو ضرور منگا لیجیے۔" عالیہ نے گویا مورل سپورٹ کے لیے اپنے ہینڈ بیگ کو مضبوطی سے تھاما ہوا تھا لیکن پاشا صاحب کے رویے اور اندازِ گفتگو سے اس کی گھبراہٹ دھیرے دھیرے کم ہونے لگی تھی۔

پاشا صاحب نے انٹرکام پر کسی کو چائے کے لیے کہا اور ریسیور رکھ کر ایک خوب صورت سگار بکس سے سگار نکالتے ہوئے عالیہ کی طرف دیکھ کر اجازت طلب انداز میں بولے۔ "اِف یُو ڈونٹ مائنڈ مائی اسموکنگ.........؟"

"نو' آئی ڈونٹ مائنڈ۔ پلیز گو اہیڈ۔" عالیہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اسے سگریٹ یا سگار کے دھوئیں کی بو اچھی معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن پاشا صاحب نے سگار سلگایا تو کمرے میں پھیلی ہوئی ائیر ریفریشنر کی مہک میں مدغم ہو جانے والا سگار کا دھواں اسے قطعاً ناگوار محسوس نہ ہوا۔

چند لمحے بعد ہی ایک باوردی چپڑاسی چائے لے آیا اور کپ تیار کر کے ان کے سامنے رکھ کر رخصت ہو گیا۔ چند منٹ بعد عالیہ کو اچانک یہ محسوس کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ واقعی بڑے دوستانہ ماحول میں پاشا صاحب کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ انہیں اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ اس سے کئی سوالات کر چکے تھے اور عالیہ کو احساس بھی نہیں ہو سکا تھا۔ نہایت غیر محسوس سے انداز میں شاید اس کا انٹرویو شروع ہو چکا تھا اور اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔

تاہم گفتگو کے بہاؤ میں بہہ جانے کے باوجود اس نے خود کو قابلِ رحم یا ضرورت مند بنا کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ اس کی انا کو گوارا نہیں تھا البتہ اس نے یہ ضرور واضح کر دیا تھا کہ اخباروں' رسالوں کی دنیا میں ملازمت کرنے اور کہانیاں لکھنے کا اسے بے پناہ شوق تھا اور وہ ضرورت سے زیادہ شوق کے تحت اس فیلڈ میں آنا چاہتی تھی مگر ابھی تک اسے موقع میسر نہیں آیا تھا۔ ورنہ اگر بات صرف ملازمت کی ہوتی تو ملازمت وہ اس وقت بھی کر رہی تھی۔

"ہمیں درحقیقت ایسی ہی لڑکی کی تلاش ہے........" پاشا صاحب گویا کچھ اور ریلیکس ہو کر ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے۔ "ہمارے رسالے میں کوئی ایسی لڑکی چل بھی نہیں سکتی جو صرف بہتر ملازمت کی تلاش میں نکلی ہو........ اور لڑکے چونکہ اور بھی زیادہ لاابالی........ اور کم محنتی ہوتے ہیں اس لیے ان کی طرف سے تو ہم بالکل ہی مایوس ہو گئے ہیں اور اس کام کے لیے اب کسی لڑکی کو ہی رکھنا چاہتے ہیں۔"

انہوں نے سگار کا ایک کش لے کر دھواں ہوا میں چھوڑا اور سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولے۔ "چند لڑکیاں آپ سے پہلے آ بھی چکی ہیں لیکن ان میں سے کوئی ہمیں اس

جاب کے لیے مناسب نہیں لگی اور جو مناسب تھیں' تجربہ بھی رکھتی تھیں وہ تنخواہ سن کر اور رسالے کا دفتر وغیرہ دیکھ کر مایوس ہو کر چلی گئیں۔"

"مگر یہ دفتر تو بہت شان دار ہے۔" عالیہ بے اختیار چاروں طرف دیکھ کر بولی۔

پاشا صاحب رسان سے مسکرائے اور گویا اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے بولے۔ "یہ رسالے کا دفتر نہیں ہے۔ یہ تو میرے امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس اور کنسٹرکشن کمپنی کا دفتر ہے۔ رسالہ ایک بالکل الگ پروجیکٹ ہے۔ اس کا دفتر بھی الگ ہے۔ ہر چیز الگ ہے۔ تمام معاملات بالکل الگ ہیں۔ رسالے کا اس جگہ سے کوئی تعلق نہیں۔"

"اوہ........!" عالیہ صرف اتنا ہی کہہ کر رہ گئی۔ اس بات کا اندازہ تو اسے انٹرویو کے لیے آنے والے خط سے بھی ہو گیا تھا لیکن اس کے خیال میں یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں تھی۔ مالک تو بہرحال پاشا صاحب ہی تھے لیکن وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ پاشا صاحب اتنا زور دے کر یہ بات کیوں کہہ رہے تھے۔

پاشا صاحب گویا اس کی الجھن کو سمجھتے ہوئے بولے۔ "عالیہ! اگر تم اسے وقت کا زیاں نہ سمجھو تو میں تمہارے چند منٹ لوں گا۔ تمہیں ذرا صحیح طور پر اس رسالے اور اس نوکری کے بارے میں ضروری پس منظر سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں۔ تاکہ تم یہ محسوس نہ کرو کہ تمہیں کسی بات کے سلسلے میں اندھیرے میں رکھا گیا۔ میں تمہیں اس رسالے کی کہانی سنا دینا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی کہ تمہیں یہ نوکری کرنی چاہیے یا نہیں۔"

عالیہ حقیقتاً ذرا شرمندگی سے بولی۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا میرے وقت کا کیا زیاں ہو گا۔ وقت تو آپ کا قیمتی ہے۔ یہ تو آپ کی نوازش ہے کہ آپ اتنے اطمینان و سکون سے بات کر رہے ہیں' جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کر رہے۔"

"اس رسالے کے کاموں کے لئے میں خاص طور پر کچھ نہ کچھ وقت نکالتا ہوں۔" پاشا صاحب نے بتایا۔

"اگر آپ اس کی کہانی سنانا چاہتے ہیں تو ضرور سنائیے۔ میں بڑے شوق سے سنوں گی۔ کہانیاں سننا اور کہانیاں لکھنا ہی تو میرا سب سے بڑا شوق ہے۔ افسوس کہ ابھی تک

مجھے لکھنے کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع نہیں ملا اور میں نام نہیں بنا سکی، شہرت نہیں پا سکی۔ بہرحال، میں مایوس نہیں ہوں۔ وقت کبھی نہ کبھی تو موقع دے گا۔"

"ضرور ضرور، کیوں نہیں۔" پاشا صاحب حوصلہ بڑھانے والے لہجے میں بولے۔ "ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی تو بہت وقت پڑا ہے جدوجہد کے لیے۔ ہمارا رسالہ محض بچوں کا رسالہ سہی اور بہت زیادہ کامیاب نہ سہی لیکن شاید یہی آپ کی شہرت کا نقطۂ آغاز ہو۔ کسی زمانے میں تو ہمارا رسالہ اتنا مشہور اور مقبول تھا کہ بڑے بڑے نامور ادیب بھی اس میں لکھنے سے انکار نہیں کرتے تھے اور بہت سے ایسے رائٹرز جن کا آج بڑا نام ہے جو بڑے مشہور ہیں، ٹی وی اور فلم کے بھی بڑے مانے ہوئے رائٹر بن چکے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ انہوں نے اپنے قلمی سفر کا آغاز ہمارے رسالے سے کیا تھا جو ان کے لیے بہت مبارک ثابت ہوا۔"

"اچھا!" عالیہ کی آنکھیں کچھ پھیل گئیں۔ حقیقت یہ تھی کہ اس قسم کی باتیں اسے بہت متاثر کرتی تھیں۔ اس قسم کے قصے سننا اسے بہت بھلا لگتا تھا کہ ایک انسان نے کہاں سے سفر شروع کیا اور کہاں پہنچ گیا۔

وہ غیر ارادی طور پر میز پر جھکتے ہوئے بولی۔ "پھر تو آپ مجھے اس کی کہانی ضرور سنائیے۔"

"کہانی کوئی خاص نہیں ہے۔" پاشا صاحب گہری سانس لے کر بولے۔ "اس ملک میں.......... بلکہ شاید دنیا بھر میں نکلنے والے بیشتر اخباروں اور رسالوں کی کہانی تقریباً یہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان میں سے کچھ کامیاب ہوئے اور کچھ ناکام۔ کچھ بہت جلدی بند ہو گئے، کچھ کو عروج ملا اور وہ عروج کا ایک طویل دور گزارنے کے بعد رفتہ رفتہ بند ہونے کی منزل پر پہنچے، کچھ عروج کا دور گزارنے کے بعد زوال کا شکار ہوئے لیکن زوال میں بھی لشتم پشتم کسی نہ کسی طرح اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ہمارا رسالہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔"

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر انہوں نے سگار کا ہلکا سا کش لیا اور مسکراتے ہوئے بولے۔ "یہ رسالہ میرے لڑکپن کا عشق ہے۔"

عالیہ بھی مسکرا دی۔ پاشا صاحب نے بات جاری رکھی۔ "جس عمر میں لڑکے ماہ رخوں سے ربط و ضبط بڑھانے کے جتن کر رہے ہوتے ہیں، کسی کے انتظار میں بس اسٹاپوں پر کھڑے ہوتے ہیں۔ اپنی چھت سے کسی کی چھت پر خط پھینک رہے ہوتے ہیں یا کسی کو ٹیلی فون کرنے کے لیے موقعے کی تلاش میں ہوتے ہیں، میں اُس عمر میں صرف اور صرف ایک رسالہ نکالنے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔"

وہ ایک لمحے کے لیے گویا ان دنوں کی یاد میں کھو گئے۔ عالیہ بولی۔ "آپ کے خواب بہرحال ہم عمروں کے خوابوں سے بہتر تھے۔ وہ عامیانہ سے خواب تو سبھی دیکھتے ہیں لیکن رسالہ نکالنے، کہانیاں لکھنے، شاعری کرنے اور پینٹنگ کرنے کے خواب بہت کم لوگ دیکھتے ہیں اور وہ عام لوگوں سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔"

"شاید۔" پاشا صاحب دھیمے لہجے میں بولے پھر ایک دم ذرا چونکنے کے سے انداز میں بولے۔ "یہ تم میرا دل رکھنے کے لیے تو نہیں کہہ رہیں؟"

"ہرگز نہیں۔" عالیہ پُرزور لہجے میں بولی۔

"بہرحال۔" پاشا صاحب نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "رسالہ نکالنے کا شوق جنون کی حد تک تھا اور حالت یہ تھی کہ جیب میں دس روپے بھی فالتو نہیں ہوتے تھے۔ بہت غریب گھرانا تھا ہمارا۔ ٹیوشن پڑھا کر میں اپنا تعلیم کا خرچ پورا کرتا تھا۔" انہوں نے اپنے ارد گرد در و دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ سب تو بہت بعد کی باتیں ہیں۔ خوش حالی کا سفر بہت بعد میں جا کر شروع ہوا۔ میں رسالہ نکالنے کے بھوت کو ذہن سے نکالنے کی بہت کوشش کرتا مگر وہ نکل نہ سکا۔ اگر خواہش میں شدت ہو تو قدرت کچھ نہ کچھ مدد کر ہی دیتی ہے۔ میرے لیے بھی کم از کم جدوجہد کا آغاز کرنے کا تو ایک ذریعہ بن ہی گیا۔"

وہ ایک بار پھر کھوئے کھوئے سے انداز میں مسکراتے ہوئے خاموش ہوئے تو عالیہ تجسّس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ "وہ کیا سر..........؟" اس نے غیر ارادی طور پر پاشا صاحب کو "سر" کہنا شروع کر دیا تھا۔

"دس روپے والے ایک انعامی بانڈ پر میرا دو ہزار روپے کا انعام نکل آیا۔" وہ گویا اس یاد سے محظوظ ہوتے ہوئے بولے۔ "میرے پاس ایک ہی بانڈ تھا جو میں نے نہ جانے

کب سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ اسی پر انعام نکل آیا۔ آج کے دور میں دو ہزار کی رقم
بڑی حقیر لگتی ہے لیکن تم تصور نہیں کر سکتیں کہ اس وقت کم از کم مجھے یہ رقم کتنی بڑی
محسوس ہوئی تھی۔ بالکل ایسا ہی لگا جیسے اچانک قارون کا خزانہ میرے ہاتھ لگ گیا ہو۔ گھر
میں دو ہزار کی اس رقم کے لیے اچھے خاصے لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ ایسا لگتا تھا
گھر کے ہر فرد نے کوئی نہ کوئی کام سوچ کر رکھا ہوا تھا کہ کہیں سے پیسے آئیں تو یہ کر
جائے' وہ کرلیا جائے۔ ابا کا حکم تھا کہ فلاں کام کیا جائے۔ اماں کی رائے میں فلاں کام زیادہ
ضروری تھا۔ بھائی اور بہن دبی دبی زبان میں اپنی کچھ اہم ضروریات بیان کر رہے تھے
کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میرے ذہن میں کیا کھچڑی پک رہی تھی۔"

"آپ نے فوراً رسالہ نکالنے کا پروگرام بنالیا ہو گا؟" عالیہ مسکرائی' اسے یاد ہی
نہیں رہا تھا کہ وہ یہاں انٹرویو دینے آئی تھی۔ رسمی انٹرویو والا ماحول ہی نہیں تھا۔ عمر کے
فرق اور تمام تر احترام کے باوجود اتنی سی دیر میں ہی وہ پاشا صاحب کو اپنا کوئی دیرینہ
دوست محسوس کر رہی تھی۔

"ہاں۔" وہ مسکرائے۔ "میں اُس زمانے میں جن لوگوں کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے
جایا کرتا تھا ان میں ایک صاحب محسن مفتی بھی تھے۔ ان کا اس وقت تک ایک ہی چھوٹا سا
بچہ تھا۔ وہ انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے جہاں سے رسالوں اور اخبارات وغیرہ کے
لیے ڈیکلریشن بھی ملتے ہیں۔ معمولی سے عہدے پر تھے۔ ایمان دار آدمی تھے۔ رشوت
وغیرہ نہیں لیتے تھے۔ اس زمانے میں اتنی لوٹ مار مچی بھی نہیں تھی۔ ان کی دیانت داری
کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ اخراجات پورے کرنے کے لیے پارٹ ٹائم کوئی کام کرنے کے
خیال سے انہوں نے چھوٹی سی ایک لائبریری بھی کھولی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں اس قسم
کی لائبریریاں "آنہ لائبریریاں" کہلاتی تھیں کیونکہ کتابوں کا کرایہ عموماً ایک آنہ روز ہوتا
تھا۔ میں ان کی لائبریری سے دیوانوں کی طرح دن میں دو دو تین تین کتابیں کرائے پر لے
کر پڑھتا تھا اور زیادہ شدت سے اپنے خوابوں میں الجھا رہتا تھا۔ میں ان کے بچے کو جو
ٹیوشن پڑھاتا اس کی فیس نقد لینے کی نوبت نہیں آتی تھی' کتابوں کے کرائے میں ہی
حساب برابر ہو جاتا تھا........"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد پاشا صاحب نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "میں نے ڈرتے
ڈرتے مفتی صاحب کے سامنے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ میں ایک رسالہ نکالنا چاہتا
ہوں۔ وہ واحد آدمی تھے جنہوں نے میری یہ بات سن کر میری ہمت افزائی کی' ورنہ ہر
ایک نے کوئی نہ کوئی منفی پہلو دکھا کر مجھے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔
بعض کے خیال میں تو مجھ میں اس قسم کے کاموں کی ذرا سی بھی صلاحیت نہیں تھی۔ بعض
کے خیال میں اس مقصد کے لیے دو ہزار روپے کی رقم اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر
تھی۔ بعض کے خیال میں' میں ڈیکلریشن لینے کا مرحلہ ہی طے نہیں کر سکتا تھا۔ اس زمانے
میں ڈیکلریشن واقعی جُوئے شِیر لانے کے برابر تھا۔ اس معاملے میں بھی مفتی صاحب ہی
کام آئے۔ انہوں نے ہی ڈیکلریشن حاصل کرنے میں میری مدد کی۔ یہی نہیں' انہوں نے
تھوڑی بہت مالی مدد بھی کی۔ انہوں نے بجٹ بنا کر بتایا کہ رسالہ نکالنے کے لیے یہ رقم کم
ہے۔ گو کہ وہ سستا زمانہ تھا پھر بھی بہرحال نہایت باکفایت انداز میں رسالہ نکالنے کے لیے
ابھی اس سے زیادہ روپیہ چاہیے تھا۔ چنانچہ ہزار روپے کا بندوبست انہوں نے کیا اور مزید
ایک ہزار روپے اپنے ایک دوست سے ادھار لے کر دیئے۔ وہ خود بھی رسالے کی تجویز
کے سلسلے میں بے حد پُرجوش تھے اور اس کے لیے کام کرنا چاہتے تھے لیکن طے یہ پایا کہ
محدود بجٹ کی وجہ سے بچوں کا رسالہ نکالا جائے کیونکہ اس پر خرچ کچھ کم آتا ہے۔"

انہوں نے ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر عالیہ کی طرف دیکھا گویا اطمینان کر رہے
ہوں کہ وہ ان کی بات توجہ سے سن رہی تھی یا نہیں۔ عالیہ نہایت انہماک سے سن رہی
تھی۔ کسی عام لڑکی کے لیے شاید یہ گفتگو زیادہ دلچسپی کا باعث نہ ہوتی لیکن عالیہ کے لیے
گویا اس کے خیال و خواب کی دنیا کی باتیں تھیں۔

پاشا صاحب نے مطمئن ہو کر بات جاری رکھی۔ "قصہ مختصر یہ کہ کرائے کا ایک
چھوٹا سا کمرہ لے کر ہم نے کام شروع کر دیا۔ مفتی صاحب کی دلچسپی لائبریری میں کم ہو
گئی۔ وہاں انہوں نے ایک دوست کو بٹھانا شروع کر دیا۔ خود وہ سرکاری دفتر سے اٹھ کر
سیدھے رسالے کے دفتر آجاتے۔ ہم دونوں نے مل کر بہت محنت کی' نئے نئے آئیڈیاز
تلاش کیے اور بڑی تیاریوں کے بعد آخر کار رسالہ آگیا۔ میں نے اپنا نام مینیجنگ ایڈیٹر اور

مفتی صاحب کا نام ایڈیٹر کے طور پر دیا لیکن وہ چونکہ سرکاری ملازم تھے اس لیے انھو نے پورا نام نہیں دیا۔ ان کا نام صرف "م۔ مفتی" چھپتا تھا۔"

عالیہ کو یاد تھا جب وہ بچپن میں یہ رسالہ پڑھتی تھی تو یہ نام ایڈیٹر کے طور پر چھپتا اور کم عمری میں اسے یہ عجیب سا لگتا تھا جیسے اصل میں اسے یوں ہونا چاہیے تھا۔ "م۔ مفتی" اور یہ سوچ کر وہ مسکرا دیتی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا' م۔ مفتی!

پاشا صاحب کی بات جاری تھی۔ "رسالہ راتوں رات تو نہیں' بہرحال خاصی تیز سے کامیاب ہو گیا۔ ہمیں اس سے اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی۔ ہمارے حالات ب ہوتے چلے گئے۔ جو تھوڑا سا قرض میں نے ابتدا میں لیا تھا وہ تو جلد ہی اتر گیا تھا۔ دفتر ایک بہتر عمارت میں منتقل ہو گیا۔ مزید کچھ عرصے بعد ہم نے وہ دفتر خرید ہی لیا۔ اب تو عمارت بھی بہت پرانی' دقیانوسی اور خستہ حال لگنے لگی ہے لیکن اس وقت وہ خا باعزت سمجھی جاتی تھی اور اُس میں ذاتی دفتر ہونا بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔"

"ایک رسالہ کامیاب ہوتے ہی آپ نے دوسرا اور پھر تیسرا رسالہ نکالنے کوشش نہیں کی؟" عالیہ اپنے ذہن میں کلبلا اٹھنے والا یہ سوال فوراً ہی پوچھے بغیر نہیں سکی۔

"نہیں' اُس زمانے میں اس کا رواج ذرا کم ہی تھا........."

عالیہ ان کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "آپ "اس زمانے" کے الفاظ تو یوں استع کرتے ہیں جیسے یہ بہت ہی پرانے زمانے کی باتیں ہیں' آپ اتنے زیادہ پرانے زمانے آدمی لگتے تو نہیں۔"

"میں اسے اعزاز سمجھتے ہوئے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں عالیہ.........!" پاشا صاح مسکراتے ہوئے سگار ایش ٹرے میں مسل کر بولے۔ "لیکن بہرحال میں ان خوش لوگوں میں سے نہیں ہوں جو مرتے دم تک خود کو جوان سمجھتے رہتے ہیں۔ اچھی خاصی ہے میری' پورے پچپن کا ہو چکا ہوں اور چونکہ میری پہلی اولاد لڑکی تھی اس لیے اب نانا بھی بن چکا ہوں۔ اب تو میری نواسی بھی سکول جانے لگی ہے اور جلد ہی میں دادا بن جاؤں گا۔"

عالیہ کہتے کہتے رک گئی۔ "سر! آپ اتنی عمر کے لگتے تو نہیں۔ آپ کی شخصیت پر عمر کے کچھ زیادہ اثرات نظر نہیں آتے۔" لیکن پھر اس نے سوچا کہ پہلی ہی ملاقات میں اس قسم کی باتیں کرنا کچھ زیادہ مناسب نہیں تھا۔ وہ خلوص یا صدق دل سے بھی یہ بات کرتی تب بھی اس میں چاپلوسی یا کسی اور جذبے کا پہلو تلاش کیا جا سکتا تھا اور عالیہ کے لیے اس کا تصور بھی شرمناک تھا۔

پاشا صاحب نے بال ڈائی نہیں کیے ہوئے تھے اور انہوں نے ایک لڑکی کے سامنے خود کو کم عمر بھی ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اپنے نانا ہونے اور عنقریب دادا بننے کی توقع کا اظہار بڑے خوشگوار لہجے میں کر رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ عام لوگوں کی طرح انہیں عمر کا کمپلیکس نہیں تھا اور وہ یقیناً ایک سمارٹ اور پُروقار نانا تھے۔ عالیہ کو اس لمحے وہ کچھ اور بھلے لگے۔

وہ کہہ رہے تھے۔ "یہ جو میں باتیں کر رہا ہوں انہیں اڑتیس برس ہونے کو آ رہے ہیں۔ میرے منہ سے یہ اس لیے بھی کافی پرانی لگ رہی ہیں کہ میں بہت کم عمری میں میدانِ عمل میں کود پڑا تھا۔ جس طرح وہ لڑکیاں جن کی شادیاں کم سنی میں ہو جاتی ہیں' ان کا دادی نانی بن جانا کچھ عجیب سا لگتا ہے اس طرح جو لوگ کم عمری سے عملی زندگی کا آغاز کرتے ہیں ان کی باتیں بہت ہی عمر رسیدہ بزرگوں کی سی لگتی ہیں......... لیکن بہرحال' اڑتیس سال بھی کچھ کم عرصہ نہیں ہوتا۔ تمہاری پیدائش سے بہت پہلے یہ رسالہ نکلا تھا اور تم نے اپنے بچپن میں اسے پڑھا ہے۔ شاید وہ اس کے عروج کا دور تھا۔"

"جی ہاں' اس وقت تو ٹین ایج تک کا شاید ہی کوئی لڑکا یا لڑکی ایسی ہو جو یہ دعویٰ کر سکتی ہو کہ اس نے یہ رسالہ نہیں پڑھا۔" عالیہ بولی۔

"میں نے تھوڑی سی خوش حالی آتے ہی دوسرا اور پھر تیسرا رسالہ تو نہیں نکالا لیکن اس رسالے کی آمدنی سے امپورٹ ایکسپورٹ کا کام خاصے اچھے پیمانے پر شروع کر لیا اور تب دھیرے دھیرے مجھ پر انکشاف ہوا کہ ایک کامیاب رسالہ تو شاید میں نے اتفاقاً......... اور کچھ لگن کے تحت یا پھر مفتی صاحب کے تعاون کی وجہ سے نکال لیا تھا لیکن بزنس کا ٹیلنٹ مجھ اکیلے میں اس سے کہیں زیادہ تھا۔ میرے بزنس نے صحیح معنوں

میں دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کی۔ میرے پاس دولت اتنی تیزی سے آئی کہ کبھی کبھی مجھے خود بھی حیرت ہوتی تھی۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے یوں ٹھنڈی سانس لی جیسے اس حیرت اور خوشی کے ساتھ کوئی ٹریجڈی بھی وابستہ تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولے۔ "عجیب بات یہ تھی کہ جوں جوں میرا بزنس ترقی کرتا گیا' میرا رسالہ زوال کا شکار ہوتا گیا۔ میں نے امپورٹ ایکسپورٹ کے بعد کنسٹرکشن کے کام میں بھی ہاتھ ڈال دیا اور اس میں بھی مجھے کامیابی نصیب ہوئی لیکن رسالے کی حالت روز بہ روز خراب ہوتی چلی گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی قرار دی جا سکتی ہے کہ اس کی طرف سے میری توجہ ہٹ گئی تھی لیکن میرا خیال ہے قدرت کو منظور ہی کچھ اس طرح تھا۔ بعد میں' میں نے اس پر توجہ دے کر اسے سنبھالنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ اپنی کھوئی ہوئی مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ ہم نے دوسرے تمام طریقے بھی استعمال کر کے دیکھ لئے۔ اس پر پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ جتنے میں ہم اسے ایجنٹ کے ہاتھ فروخت کرتے تھے اس سے دگنی قیمت میں وہ ہمیں پڑتا تھا۔ ہم اسے بہتر سے بہتر بنانے پر اتنا خرچ کرتے تھے اور نقصان میں بیچتے تھے پھر بھی وہ کچھ خاص نہیں چلتا تھا۔ مفتی صاحب بھی اپنی تمام صلاحیتیں استعمال کر کے تھک ہار کر بیٹھ گئے۔"

"آپ نے اس کے لیے کوئی اور نیا باصلاحیت ایڈیٹر تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟ کوئی زیادہ پُرعزم نوجوان.......... نیا خون..........؟" عالیہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

پاشا صاحب گویا تحمل سے مسکرائے۔ "ہم نے یہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ مفتی صاحب کی حیثیت میرے ملازم کی سی ہے۔ سرکاری ملازمت سے وہ برسوں پہلے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ شاید یہ بھی میری کاروباری سمجھ بوجھ کا ایک نمونہ تھا کہ میں نے انہیں پارٹنر نہیں بنایا تھا۔ ورنہ جس قسم کے حالات میں ہم نے سفر شروع کیا تھا ان میں عموماً لوگ پارٹنر بن کر چلتے ہیں لیکن وہ اس قسم کے ملازم ہیں جن کے سامنے مالک بھی اونچی آواز میں بات نہیں کرتے۔ میں انہیں بھاری تنخواہ دیتا ہوں اور وہ سیاہ و سفید کے تقریباً مالک ہیں۔ انہیں اچھا تو نہیں لگا اور مجھ پر مالی طور پر بھی مزید بوجھ پڑا۔ اس کے باوجود گزشتہ چند برسوں کے دوران میں' میں نے کئی ایسے نئے ایڈیٹرز کو بھی معقول تنخواہوں پر لا کر

مفتی صاحب کے ساتھ بٹھایا جو بچوں کے رسالوں کے معاملے میں بہت کامیاب سمجھے جاتے تھے لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ آخر مجھے اس بوجھ کو کم کرنا پڑا۔"

انہوں نے ایک اور بوجھل سی سانس لی۔ عالیہ نے بھی اپنے دل میں تاسف کی ایک خفیف سی لہر محسوس کی جیسے یہ اس کی اپنی زندگی کی کسی ناکامی کا ذکر ہو۔

"بزنس میں تھوڑی سی سفاکی اور مکمل عدم جذباتیت درکار ہوتی ہے۔" پاشا صاحب بولے۔ "اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں عار نہیں کہ یہ خصوصیات مجھ میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے تبھی میں ایک کامیاب بزنس مین ہوں۔ اگر میں اپنے اس بچوں کے رسالے کے بارے میں بھی بزنس مین بن کر سوچوں تو مجھے اس کو بند کر دینا چاہیے کیونکہ مجھے ہر ماہ تقریباً پچاس ہزار روپے پلے سے ڈالنا پڑ رہے ہیں۔ بے مقصد طور پر پچاس ہزار روپے مہینہ باقاعدگی سے خرچ کرتے رہنا یا یوں کہئے کہ کسی کنویں میں پھینکتے رہنا مجھ سے بڑے کسی دولت مند کو بھی گوارا نہیں ہوگا۔ وہ بھی دو چار ماہ میں ہی ایسے کسی خرچ پر چلا اٹھے گا لیکن میں خندہ پیشانی سے یہ نقصان برداشت کر رہا ہوں کیونکہ یہ رسالہ میرے لڑکپن کا عشق ہے۔' یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں' اور پھر میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ جس بزنس سے میں نے ساری دولت کمائی ہے اور کما رہا ہوں' وہ میں نے اس رسالے کی آمدنی سے ہی شروع کیا تھا۔ یعنی کل بوقتِ ضرورت اس رسالے نے مجھے ایک نئے سفر کی توانائی کے لئے خون دیا تھا۔ آج اگر اسے باقاعدگی سے تھوڑے سے خون کی ضرورت پڑتی ہے اور میں وہ دینا افورڈ کر سکتا ہوں تو مجھے دیتے رہنا چاہیے۔ اس لیے میں اسے بند نہیں کرنا چاہتا۔"

"آپ نے شاید کبھی ریڈیو' ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے رسالے کی پبلسٹی نہیں کی۔" عالیہ نے اپنی دانست میں ایک اہم نکتہ تلاش کیا۔ "یہ پبلسٹی کا دور ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی آپ کے رسالے کی پبلسٹی کی مہم دیکھی ہو۔"

"یہ بھی کر کے دیکھا تھا۔" پاشا صاحب افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "کئی لاکھ روپیہ اس بے ثمر مہم میں بھی ضائع کیا تھا۔ شاید وہ اشتہارات تمہاری نظر سے نہ گزرے ہوں یا تمہیں یاد نہ رہا ہو۔ کافی پرانی بات ہو گئی ہے۔ اس سے عارضی طور پر

سرکولیشن میں تھوڑا سا اضافہ ہوا تھا۔ وہ بھی کوئی خاص نہیں تھا اور پبلسٹی کمپین بند ہو ہی رسالہ واپس وہیں پہنچ گیا۔"

"گویا......... الٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا۔" عالیہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"ہاں.........اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ بیماری دل ایسی نہیں تھی جو میرا کام تمام کر دیتی۔" پاشا صاحب مسکرائے پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "میں اس نتیجے پہنچا ہوں کہ اخبار اور رسالے بھی انسانوں ہی کی طرح ہوتے ہیں۔ بعض اپنی طبعی عمر پوری کر کے مرجاتے ہیں۔ بعض جوانی میں ہی مرجاتے ہیں۔ بعض حادثاتی طور پر مر جاتے ہیں۔ بعض لمبی عمر پاتے ہیں اور بعض مختصر۔ بعض پنپ نہیں پاتے اور بعض خوب پھلتے پھولتے ہیں۔ ان کا "خاندان" خوب پھیل جاتا ہے۔ ایک رسالے یا اخبار سے رسالوں اور اخباروں کی پوری "فیملی" بن جاتی ہے۔"

انہوں نے ایک گہری سانس لی اور بدستور مسکراتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "میرا خیال ہے میرے رسالے کے مقدر میں بھی اللہ تعالیٰ نے جتنی زندگی لکھی تھی وہ اس کا بیشتر حصہ گزار چکا ہے اور اب اپنے بڑھاپے کا دور گزار رہا ہے۔ اس نے اپنے عروج کا دور یعنی ایک اچھی خاصی جوانی بھی دیکھی۔ بیس بائیس سال وہ بے حد مقبول رہا۔ بیس، بائیس سال خاصا طویل عرصہ ہوتا ہے۔ اس نے کم از کم دو نسلوں پر اثرات اور یادوں کے خوب صورت نقوش چھوڑے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم ابھی اس کی کتنی طبعی عمر باقی ہے، لیکن میں کم از کم اسے کسی چھوٹے موٹے عذر کی وجہ سے بند ہوتا یعنی مرتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں وہ جاری رہے۔ اگر وہ پچاس ہزار مہینے کی قربانی چاہتا ہے تو میں دیتا رہوں گا۔ ہو سکتا ہے مجھے مفتی صاحب کے انتقال کے بعد اسے بند کرنا پڑے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مفتی صاحب سے پہلے میں خود ہی اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔"

"خدا نہ کرے۔" بے اختیار عالیہ کے منہ سے نکلا۔

وہ دھیرے سے ہنسے۔ "یہ کوئی انہونی نہیں ہے عالیہ۔ اس عبرت سرائے دہر سے ہر ایک کو لوٹ کر جانا ہے۔ موت، زندگی سے زیادہ اہم حقیقت ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سر! مگر........." وہ کچھ گڑبڑا کر رہ گئی۔ اس کی خود صحیح طور پر سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد پاشا صاحب بولے۔ "بہرحال، خواہش میری یہی ہے کہ رسالہ میری زندگی میں بند نہ ہو۔"

"لیکن اس کے لیے آپ کو نئی ایڈیٹر کی تلاش کیوں ہے؟ رسالہ جیسے تیسے چل ہی رہا ہے اور ایڈیٹر کے طور پر مفتی صاحب موجود ہی ہیں؟" عالیہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"مسئلہ مفتی صاحب ہی کا تو ہے۔" پاشا صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "وہ اب کافی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اب کام ان سے سنبھلتا نہیں۔ میں انہیں گھر بیٹھے ہی تنخواہ دینے کو تیار ہوں لیکن وہ ریٹائرمنٹ لینے اور گھر جانے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں، پاشا صاحب، گھر بیٹھ کر میں مر جاؤں گا۔ سرکاری نوکری سے تو میں نے وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے لی تھی لیکن رسالے سے ریٹائرمنٹ لینا میری موت ہوگی۔ اور میں ان پر حکم نہیں چلا سکتا۔ ان پر اپنی مرضی نہیں ٹھونس سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی ان کا ہاتھ بٹانے والا اور کام شیئر کرنے والا......... بلکہ یوں کہو کہ زیادہ تر کام اپنے سر لینے والا مل جائے۔"

"تو یوں کہئے نا کہ آپ کو رسالے کے لیے ایک ایڈیٹر کی نہیں بلکہ ایک بوڑھے کے لیے ایک نرس کی ضرورت ہے جو اس کی پرانی نرس کا ہاتھ بٹائے لیکن پرانی نرس کافی بوڑھی ہو چکی ہے۔" عالیہ بولی تاہم اس کے لہجے میں ناگواری نہیں تھی۔ اس نے یہ بات مسکراتے ہوئے کہی تھی۔

"یہی سمجھ لیجئے۔" پاشا صاحب بھی مسکرائے۔ "لفظوں کے ہیر پھیر سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل چیز تو کام ہے اور میرا خیال ہے آپ جیسی نوجوان اور حال ہی میں ماسٹرز کرنے والی لڑکی کے لیے یہ ایک اچھا آغاز ہے۔ آپ نے اس سے پہلے کہیں کام نہیں کیا۔ کام سیکھ لیں گی تو آگے بڑھنے کے مواقع آپ کے منتظر ہوں گے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ مروت میں ہمیشہ ہمارے ہاں ہی بیٹھی رہیں۔ اگر آپ کو بہتر مواقع ملیں تو ضرور قسمت آزمائی کر لیجئے گا۔ میں محض اپنے فائدے کی خاطر آپ کو پرانی رفاقت کے واسطے

دے کر اور آپ کی جذباتیت کو اپیل کر کے آپ کو روکنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ ہر انسان کو بہتر مواقع تلاش کرنے کا حق حاصل ہے۔"

ان کا اندازِ گفتگو بے حد دل نشیں تھا۔ ان کی گفتگو میں ان کے کاروباری ہونے کی جھلک ضرور تھی لیکن عالیہ کے خیال میں اس میں کہیں اس سفاکی' خودغرضی' بدلحاظی' بے مروتی کا شائبہ تک نہیں تھا جس کا انہوں نے ذکر کیا تھا۔ بلکہ ایک لحاظ سے تو وہ بڑے بامروت اور وضع دار انسان تھے جو مفتی صاحب سے کاروباری اور جذباتی تعلق اب تک نبھا رہے تھے ورنہ عالیہ کو اپنی تمام تر کم عمر اور ناتجربہ کاری کے باوجود معلوم تھا کہ ایسی رفاقتیں اتنے طویل عرصے تک نہیں چلتیں۔

پاشا صاحب نے اس سے اس کے تجربے' قابلیت اور اہلیت کے بارے میں ایک سوال بھی نہیں کیا تھا۔ شاید انہیں اس کی طویل اور تفصیلی درخواست سے ہر بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ تنخواہ کا انہوں نے ابھی تک کوئی ذکر نہیں کیا تھا اور رسالے کی "کہانی" ختم کرنے کے بعد بھی وہ اس موضوع کی طرف آتے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس لیے عالیہ نے ڈرتے ڈرتے اور ہچکچاتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔ "سر! تنخواہ کیا ہو گی؟"

"چار ہزار۔" پاشا صاحب نے بلا تامل جواب دیا۔ "اور بس' کوئی دوسری مراعات وغیرہ نہیں ہوں گی۔"

چار ہزار اسے گارمنٹ فیکٹری میں بھی مل رہے تھے۔ اس کے ساتھ پک اینڈ ڈراپ کی سہولت تھی' لنچ فیکٹری کی طرف سے ملتا تھا اور ایک مناسب حد تک میڈیکل کی سہولت بھی حاصل تھی لیکن نہ جانے کیوں اسے اس وقت ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے بارے میں موازنہ کرنا دل میں بھی اچھا نہیں لگا۔

پاشا صاحب کہہ رہے تھے۔ "رسالے میں میرا نام اب بھی منیجنگ ایڈیٹر کے طور پر چھپتا ہے' وہ اسی طرح چھپتا رہے گا۔ مفتی صاحب چیف ایڈیٹر ہیں' وہ بدستور چیف ایڈیٹر ہی رہیں گے۔ ایڈیٹر کے طور پر آپ کا نام آئے گا۔"

عالیہ کی دھڑکنیں ایک لمحے کے لیے بے ترتیب سی ہو گئیں۔

"ایڈیٹر.........!" ایک عجیب سی کشش تھی اس لفظ میں۔ بچوں کے ایک زوال

پذیر رسالے ہی کی سہی' لیکن بہرحال وہ ایڈیٹر تو ہو گی اور پھر وہ کچھ ایسا گیا گزرا رسالہ بھی نہیں تھا۔ کسی زمانے میں تو بچے بچے کی زبان پر اس کا نام ہوتا تھا اور یہ بھی طے تھا کہ آج جو بزرگ' ادھیڑ عمر یا جوان نظر آ رہے تھے وہ کبھی نہ کبھی تو بچے رہے تھے۔ رسالے کا نام تو کسی کے لیے بھی نامانوس نہیں تھا۔ اس کی ایڈیٹر ہونا بہت ہی معمولی بات بھی نہیں تھی اور سچی بات تو یہ تھی کہ گارمنٹ فیکٹری کی چیکر کہلاتے ہوئے اسے اب کچھ زیادہ ہی شرم آنے لگی تھی۔

"ٹھیک ہے سر.........!" آخر وہ سر اٹھاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔ "مجھے منظور ہے۔"

"پھر بھی میں چاہوں گا کہ پہلے تم جا کر رسالے کا دفتر دیکھ لو۔ مفتی صاحب سے مل لو۔" پاشا صاحب بولے۔

"بس سر' جب فیصلہ کر لیا تو کر لیا۔ اب کیا ملنا اور کیا دیکھنا۔" وہ مسکرائی۔ "اب تو جو مقدر میں ہو گا' دیکھا جائے گا۔ میں بہت زیادہ سوچ بچار میں پڑ کر فیصلے کرنے اور فیصلہ کرنے کے بعد پچھتانے کی قائل نہیں ہوں۔ دونوں صورتوں میں الجھنوں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

پاشا صاحب نے کندھے اچکائے اور مسکراتے ہوئے بولے۔ "شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ تو پھر کب سے جوائن کر سکتی ہو؟"

عالیہ نے ایک لمحے سوچا پھر بولی۔ "اگلے پیر سے سر۔"

"ٹھیک ہے۔" پاشا صاحب نے طمانیت سے سر ہلایا۔ "سمجھ لیجیے پیر سے آپ کا اپائنٹ منٹ ہو گیا۔ رسالے کے سلسلے میں اپائنٹ منٹ لیٹر وغیرہ کا تکلف ہمارے ہاں نہیں کیا جاتا۔ میں مفتی صاحب کو فون پر آپ کے بارے میں بتا دوں گا۔ بس آپ جا کر اپنی میز کرسی سنبھال لیجیے گا اور کام شروع کر دیجیے گا۔"

☆======☆======☆

عالیہ شیشے کا دروازہ کھول کر ماہم کے کیبن میں داخل ہوئی تو ماہم چونکی' ورنہ وہ ہوا میں نظریں گاڑے دنیا و مافیہا سے بے خبر' نہ جانے کس چیز کو تک رہی تھی۔ عالیہ کو دیکھ

کر ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھری۔ عالیہ نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ ماہم کی آنکھوں میں اسے ایک عجیب سی اداسی جاگزیں نظر آئی لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ عالیہ جب سے یہاں آئی تھی اس نے ماہم کی آنکھوں میں اکثر اداسی ہی جاگزیں دیکھی تھی۔ وہ جب ہنستی بولتی تھی تب بھی اس کی آنکھیں گویا اس کی ہنسی کا ساتھ نہیں دیتی تھیں۔

عالیہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا پرابلم ہے؟ عالیہ کے حساب سے اسے کسی قسم کے احساسِ کمتری میں بھی مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ بظاہر اسے کوئی سنگین مالی مسئلہ بھی لاحق نظر نہیں آتا تھا۔ گھوم پھر کر عالیہ کو یہی شبہ ہوتا تھا کہ کہیں وہ کسی ناکام محبت کا تازہ زخم تو دل میں چھپائے نہیں پھر رہی تھی؟

لیکن اس نے کبھی ایسے موضوع پر اس سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ایک تو ان کے درمیان زیادہ بے تکلفی نہیں تھی۔ شناسائی بھی زیادہ پرانی نہیں تھی۔ دوسرے عالیہ کے خیال میں ماہم آسانی سے کھلنے والی لڑکی معلوم نہیں ہوتی تھی اس لیے اسے وقت سے پہلے اس قسم کی کوئی کوشش کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس نے خاموشی سے ایک کاغذ ماہم کی میز پر رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" ماہم نے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں پوچھا۔

"میرا استعفیٰ........" عالیہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ اس پر سائن کر دیں تو میں یہ پرسونل مینجر صاحب کو دے دوں۔"

ماہم کو جیسے دھچکا سا لگا۔ اس کی آواز کچھ اور دھیمی ہو گئی۔ "جا رہی ہو تم؟ خیریت تو ہے؟ تم یہاں خوش نہیں ہو؟ کوئی پرابلم ہے؟"

"نہیں، پرابلم تو کوئی نہیں۔ خوشی ناخوشی کا مسئلہ بھی اتنا سنگین نہیں۔" عالیہ نظر جھکاتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔ "لیکن آپ کو معلوم ہی ہے۔ میں نے آپ کو شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ یہ میری منزل نہیں ہے۔ ضرورت اور مجبوری کے تحت میں یہاں کام کر رہی تھی لیکن میری نظر میں بہرحال یہ ایک عارضی ملازمت تھی، پڑاؤ تھا۔"

"اور اب........؟" ماہم نے آنکھوں میں وہی اداسی لیے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اب مجھے اس میدان میں کام کرنے کا ایک موقع مل رہا ہے جہاں میں درحقیقت اپنی صلاحیتیں آزمانا چاہتی ہوں۔ مجھے ایک رسالے میں ایڈیٹر کے طور پر جاب مل گئی ہے۔" عالیہ کے لہجے میں غیر ارادی طور پر ہلکا سا فخر جھلک آیا۔

"اچھا........؟" ماہم کی آنکھیں ذرا پھیل گئیں لیکن یوں گویا ذات کے دریچے کچھ اور وا ہو گئے۔ اداس سے منظر کچھ اور واضح ہو گئے۔ اس نے گرم جوشی کے اظہار کی کوشش کی مگر اس میں اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

"کس رسالے میں؟" اس نے حتی الامکان اشتیاق سے پوچھا۔

"بچوں کا رسالہ ہے........ لیکن بہرحال' آغاز کے طور پر برا نہیں۔" عالیہ نے جواب دیا اور رسالے کا نام بتایا۔

"ارے ہاں۔" ماہم گویا کچھ یاد کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے یاد پڑتا ہے جب میں چھوٹی تھی تب تو یہ کافی گھروں میں نظر آیا کرتا تھا۔ خود ہمارے ہاں بھی ڈاک سے آتا تھا مگر اب کچھ زیادہ دکھائی نہیں دیتا۔"

"اب میں اس میں جاؤں گی تو شاید رفتہ رفتہ پھر بہت گھروں میں نظر آنے لگے۔" عالیہ نے خاصی خود اعتمادی سے کہا۔

ماہم نے گہری سانس لے کر گویا کوئی نادیدہ بوجھ ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔

"تو........ بہرحال' تم نے جانے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے؟ نظرِ ثانی کی کوئی گنجائش نہیں ہے؟"

"نہیں۔" عالیہ نے فیصلہ کن انداز میں نفی میں سر ہلایا۔

"سمجھ میں نہیں آرہا' تمہیں اپنے من پسند کیریئر کے آغاز پر مبارک باد پیش کروں یا ہماری کمپنی سے محروم ہونے پر افسوس کا اظہار کروں۔ ایک تم ہی تو تھیں یہاں جس سے بات کرنے' جس کے پاس کچھ دیر بیٹھنے میں ذرا لطف آتا تھا۔ اب تم بھی جا رہی ہو۔"

اس کی آنکھوں میں اداسیوں کے سائے گہرے ہو گئے۔ عالیہ کو اسی لیے اس پر بڑا

ترس آیا لیکن وہ ماہم کے لیے بھلا کیا کر سکتی تھی؟

"وقت ملا تو میں کبھی کبھار آپ سے ملنے آتی رہوں گی۔" اس نے خلوص سے ماہم کا ہاتھ تھپتھپایا۔ اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔

چھٹی کا بزر بجنے لگا۔ عالیہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ ابھی بیٹھیں گی؟"

"ہاں' میں کچھ دیر بیٹھوں گی۔" ماہم نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا' میں چلتی ہوں۔" عالیہ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"خدا حافظ!" ماہم نے دھیرے سے کہا۔

عالیہ رخصت ہو گئی اور دروازہ کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ ایک بار پھر ماہم اپنی سوچوں کے بھنور میں تنہا تھی۔ درحقیقت وہ عالیہ کے بارے میں زیادہ سوچنے کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ تو خود اپنی سوچوں کے بھیانک جنگل میں بھٹک رہی تھی۔ رہ رہ کر جمیل کی تصویر اس کے تصور کے افق پر ابھرتی تھی اور اب وہ اسے خاصی ڈراؤنی محسوس ہونے لگی تھی۔ بار بار اس کی آواز کی بازگشت سے ماہم کی سماعت مجروح ہونے لگتی تھی۔

ماہم کی نظر میں شادی دلوں کا سودا تھا۔ باقی معاملات تو ضمنی تھے۔ جب جمیل کے دل میں ہی اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی اور پورے ایک سال تک اس نے محبت کا ایک ڈراما کھیلا تھا تو اب اس کا تعاقب کرنا' اس کے پیروں کی زنجیر بننے کی کوشش کرنا فضول تھا۔

لیکن پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ کرنا ضرور چاہتی تھی۔ چھوٹا موٹا احتجاج ہی سہی' اپنے دل کا غبار نکالنے کی ایک کوشش ہی سہی۔

اس لیے آخرکار اس نے اپنی تمام تر جرأتیں مجتمع کیں' اپنے آپ کو سنبھالا' اپنا حلیہ کچھ درست کیا اور سیٹھ سہیل کے بنگلے پر جا پہنچی۔ آج پہلا موقع تھا کہ وہ چور دروازے سے اس بنگلے میں داخل نہیں ہو رہی تھی۔ وہ مین گیٹ پر پہنچی تو چوکیدار نے اسے روک لیا۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟" اس نے پوچھا۔

"بڑے سیٹھ صاحب سے۔" ماہم نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔

"ان سے تو کوئی نہیں مل سکتا۔ کل سے ان کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے ان کو کسی سے بھی ملنے سے منع کر رکھا ہے۔ بہت سے لوگ واپس جا چکے ہیں۔" چوکیدار نے بتایا۔

"لیکن میرا ان سے ابھی اور اسی وقت ملنا بہت ضروری ہے۔ یہ ایک انسانی زندگی کا سوال ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔ دراصل وہ ڈر رہی تھی کہ نہ جانے اس میں دوبارہ کبھی اس طرح جرأت مجتمع ہو پائے گی یا نہیں۔

"زندگی اور موت کا تو مجھے کچھ معلوم نہیں بی بی جی' مجھ کو تو بس اتنا معلوم ہے کہ سیٹھ صاحب سے کوئی ملنے نہیں جا سکتا۔" چوکیدار فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"چلو ٹھیک ہے' میں ان سے نہیں ملوں گی۔" ماہم نے کچھ سوچ کر نرم پڑتے ہوئے اور موقع محل کی مناسبت سے حکمت عملی تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے اندر تو جانے دو۔ میں گھر والوں سے ان کی طبیعت کا پوچھ کر ہی واپس آ جاؤں گی۔"

چوکیدار ایک لمحے کے لیے تذبذب کا شکار ہوا اور اسی لمحے اندر سے آواز آئی۔

"کیا بات ہے چوکیدار؟ کون ہے؟"

وہی شناسا سا اور بوجھل سی آواز سن کر ماہم کے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہو گئی۔ بھاری قدموں کی آہٹ گیٹ کی طرف بڑھتی محسوس ہوئی پھر کسی نے چھوٹا گیٹ پورا کھول دیا۔ رمیز کرتے پاجامے میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ کندھوں پر ایک خوب صورت سی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ انگلیوں میں سگار سلگ رہا تھا۔

"ارے......... ماہم......... تم.........!" ہمیشہ سپاٹ رہنے والے اس کے چہرے پر حیرت کی ہلکی سی لہر ابھری۔ "آؤ' آؤ' اندر آ جاؤ۔"

چوکیدار ایک طرف ہٹ گیا اور وہ اندر جا پہنچی۔

رمیز مزید کچھ نہیں بولا۔ اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے اندر کی طرف چل دیا۔ ایک طویل و عریض ڈرائیو وے سے گزر کر وہ پورچ میں پہنچے پھر برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر رمیز نے اس کے لیے بھاری بھرکم' منقش' چوبی دروازہ کھولا اور بڑا احترام

انداز میں اسے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

اندر قدم رکھتے ہی ماہم کے پاؤں دبیز قالین میں دھنس گئے۔ وہ ایک بڑے ہال میں کھڑی تھی۔ چھت کے وسط میں ایک بہت بڑا فانوس جھلملا رہا تھا۔ رمیز نے اندر کا رخ نہیں کیا۔ وہ وہیں سے اسے بائیں ہاتھ پر موجود سیڑھیوں کے راستے اوپر لے گیا۔ سیڑھیاں بھی قالین سے ڈھکی ہوئی تھیں۔

چند لمحے بعد وہ جس کمرے میں داخل ہوئے' وہ ایک آئیڈیل قسم کا آراستہ و پیراستہ اسٹڈی روم تھا۔ چاروں طرف دیوار گیر شیلفوں میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ کھڑکیوں پر بھاری پردے پھیلے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک لمبی چوڑی میز تھی۔

رمیز نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود میز کے دوسری طرف جا بیٹھا۔ ٹھوڑی مسلتے ہوئے اس نے پُرخیال انداز میں ماہم کی آنکھوں میں جھانکا۔

"بہت پریشان نظر آرہی ہو۔" وہ ملائمت سے بولا۔

ماہم کا خیال تھا کہ وہ اپنی پریشانیوں کو دل کی گہرائیوں میں دفن کر کے وہاں تک پہنچی تھی لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ اب بھی اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھیں پھر اسے رمیز کے لہجے پر بھی حیرت ہوئی۔ اس کے لہجے میں اتنی اپنائیت کیوں تھی؟ وہ برسوں کا شناسا کیوں لگ رہا تھا؟ جبکہ ماہم نے اسے محض چند ایک مرتبہ فیکٹری میں دیکھا تھا اور آج تک اس سے بات چیت تو صرف دو تین مرتبہ ہی ہوئی تھی۔

"میں آپ کے والد صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔" وہ اس سے نظریں چراتے ہوئے یک دم ہی بولی۔

"کیوں.........؟"

"یہ میں اُنہی کو بتاؤں گی۔"

اس نے سگار کا ایک طویل کش لیا اور گدیلی کرسی کے پشتے سے سر ٹکا لیا۔ پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "دیکھو ماہم! میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ ڈیڈی کی طبیعت کچھ ایسی زیادہ خراب نہیں ہے لیکن ڈاکٹر کے مشورے کی وجہ سے ہم نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ کوئی ان سے ملنے نہ پائے کیونکہ وہ گھر پر رہ کر بھی تمام کاروباری الجھنوں میں

ٹانگ اڑانے سے باز نہیں آتے۔ یہیں بیٹھے بیٹھے ہر الجھن' ہر مسئلے میں دلچسپی لیتے رہتے ہیں اور احکامات جاری کرتے رہتے ہیں۔ ایسے معاملات میں بھی الجھتے رہتے ہیں جو ٹینشن کا باعث ہوتے ہیں اور جبکہ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ٹینشن ان کے لیے بے حد نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اگر کوئی ان کے پاس جائے بھی تو......... کوئی خوشی کی خبر لے کر جائے اور تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تمہارے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔"

"غریبوں کے دامن میں خوشخبریاں تو شاذ و نادر ہی ہوتی ہیں رمیز صاحب.........!" وہ تلخ لہجے میں بولی۔ "لیکن امیروں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ جب چاہیں بُری خبروں سے بچنے کے لیے قلعہ بند ہو کر بیٹھ سکتے ہیں۔ کوئی ان تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ جبکہ غریبوں کے گھر میں ہر کوئی منہ اٹھا کر آسکتا ہے خواہ وہ بربادیوں کا پیغام لے کر ہی آیا ہو۔ خوشیوں پر ڈاکا ڈالنے ہی کیوں نہ آیا ہو۔"

رمیز نے یوں ہاتھ ہلایا جیسے کسی بچے کو اپنی عمر سے بڑی اور جذباتی تقریر کرنے سے منع کر رہا ہو۔ پھر وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "یہ بیکار' طویل اور جذباتی باتیں چھوڑو' سیدھی اور کام کی بات کرو۔ زمانہ بہت تیز رفتار ہو گیا ہے۔ تم بھی اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کرو' پریکٹیکل بنو۔"

"ہاں' آپ جیسی فیملیز سے مل کر احساس ہوتا ہے کہ زمانہ واقعی بہت تیز رفتار ہو گیا ہے۔" ماہم کے لہجے کی تلخی کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی۔ "لیکن کیا کریں' ہم جیسے لوگ اگر آپ کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش کرتے ہیں تو اوندھے منہ گر پڑتے ہیں۔ شاید اس رفتار سے چلنے کے لیے پاؤں بھی ذرا دوسری قسم کے درکار ہوتے ہیں۔ ویسے بائی دا وے' کیا آپ دولت مند لوگوں کی زندگی میں جذبات کا' کوئی دخل نہیں ہوتا؟"

"ہوتا ہے' کیوں نہیں ہوتا۔ کیا ہم انسان نہیں ہیں؟" وہ قدرے تھکے تھکے سے لہجے میں بولا۔ "کم از کم میری زندگی میں تو بہت دخل تھا جذبات کا لیکن حادثات میں بعض لوگ جسمانی طور پر معذور ہو جاتے ہیں۔ میں ایک حادثے میں جذباتی طور پر معذور ہو گیا ہوں۔ میں چاہوں تو بھی جذباتی نہیں ہو پاتا' میرے جذبات مر چکے ہیں۔"

"افسوس کہ میں آپ کے جذبات کی ناگہانی وفات پر اس وقت تعزیت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔" وہ استہزائیہ سے لہجے میں بولی۔ "کیونکہ اس وقت میرے اپنے اندر ایک قبرستان موجود ہے۔"

رمیز نے اس کے استہزائیہ لہجے کو نظرانداز کر دیا اور میز پر قدرے جھکتے ہوئے بولا۔ "ابھی تک تم نے اپنی آمد کا مقصد بیان نہیں کیا۔ جمیل کے بارے میں کوئی بات کرنے آئی ہو نا؟"

ماہم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا چاہتی تھی مگر غیر ارادی طور پر اس کا سر جھک گیا۔ وہ کچھ بھی نہ بول سکی۔

"تم مجھے بتاؤ تو سہی' شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔ شاید ڈیڈی سے بات کرنے سے تمہارا مسئلہ حل ہونے کے بجائے تمہارے جذبات کچھ اور مجروح ہوں۔" وہ بہت ملائمت بلکہ کسی حد تک محبت سے بولا۔

ماہم کے دل میں غبار سا بھر گیا۔ کافی دنوں سے کسی نے اس سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر یک دم میز پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

رمیز کچھ بھی نہ بولا۔ خاموشی سے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ شاید وہ یہی چاہتا تھا کہ اس کے دل کا غبار نکل جائے' دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

کچھ دیر آنسو بہہ چکے تو ماہم نے اپنے آپ کو بڑا شرمسار سا محسوس کیا۔ اس نے سر اٹھایا' رمیز کی طرف دیکھے بغیر اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھے اور برابر کی کرسی سے اپنا پرس اٹھا کر کھڑے ہوتے ہوئے مدھم آواز میں بولی۔ "میں اب چلتی ہوں۔ خواہ مخواہ ہی میں یہاں آئی.......... اور آپ کو بھی پریشان کیا.........."

وہ جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ اس نے اپنی کلائی ایک آہنی شکنجے میں پھنسی محسوس کی۔ اس نے پلٹ کر حیرت سے دیکھا۔ رمیز نے میز کے دوسری طرف سے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی تھی اور اس کی گرفت آہنی تھی۔

وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکی۔

ایک لمحے کے لئے ماہم کو عجیب سا محسوس ہوا۔

اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ رمیز یوں اچانک اتنی مضبوطی سے اس کی کلائی پکڑ لے گا۔ اسے کچھ خوف بھی محسوس ہوا۔ اس کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ دروازہ بند تھا اور اس کوٹھی کی وسعت کا اسے اندازہ تھا۔ ناممکن تھا کہ وہ چیخ مارتی تب ہی اس کی آواز گھر کے کسی دوسرے فرد تک پہنچ پاتی۔

یہ بھی ممکن تھا کہ اسے چیخ مارنے کی مہلت ہی نہ ملتی اور اگر وہ چیخنے میں کامیاب ہو جاتی تب بھی کوئی ضروری نہیں تھا کہ گھر میں موجود کوئی دوسرا فرد اس آواز کو توجہ کے قابل سمجھتا۔ آخر وہ گھر کے مالکان میں سے ایک تھا اور عین ممکن تھا کہ وہاں مالکان کے درمیان ایک دوسرے کے معاملات میں دخل دینے کا رواج ہی نہ ہو۔ بڑے گھروں کے دستور ہی نرالے ہوتے ہیں۔ کسی بات کے بارے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

لیکن جب اس نے رمیز کی آنکھوں میں جھانکا تو اسے وہاں کسی شیطانی یا گھٹیا جذبے کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اس کی آنکھوں میں صرف مضبوطی تھی' ٹھہراؤ تھا۔ تب ماہم کو احساس ہوا کہ کبھی کبھی کسی ڈوبتے ہوئے انسان کو سہارا دینے کے لئے بھی تو اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما جاتا ہے۔ رمیز نے جس طرح اسے روکا تھا' اس انداز میں ایک قسم کا مان تھا۔ وہ گویا پوری بات سنے بغیر اسے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

اس کے ارادے کی مضبوطی اس کی گرفت سے ظاہر تھی۔ شاید یہی پختگی' یہی فولادی پن رمیز کے کردار میں بھی تھا' اس کے ارادوں میں بھی تھا۔ وہ سر تا پا مضبوط تھا' اپنی جگہ پر' اپنے فیصلوں پر مضبوطی سے جم جانے والا۔ فوری طور پر اٹل فیصلہ کرنے والا۔

ماہم کے دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ کاش یہی مضبوطی' یہی ٹھہراؤ اور یہی پختگی تھوڑی بہت جمیل میں بھی ہوتی۔ وہ اتنا ناقابلِ اعتبار نہ ہوتا۔ ہوا کے دوش پر اُڑتے ہوئے پتے کی طرح..........

"بیٹھ جاؤ۔" رمیز کے لہجے میں بیک وقت تحکم بھی تھا اور اپنائیت بھی۔ "اب تم بات بتائے بغیر نہیں جا سکتیں جس کے لئے آئی تھیں۔"

ماہم اسی طرح ساکت کھڑی رہ گئی مگر اس کے ذہن میں گویا آندھیاں سی لگیں۔ کیا وہ اس شخص کو اپنی زندگی کے سب سے بڑے راز سے آگاہ کر سکتی ہے؟ ا اسے صحیح طور پر جانتی بھی نہیں ہے۔ بہت سطحی سی' بہت رسمی سی شناسائی ہے اور پھ ہے بھی کون؟ اسے لوٹنے والے' اس کے اعتماد کو دھوکا دینے والے اور اس کے پندا کرچی کرچی کرنے والے کا بڑا بھائی ہی تو ہے۔

مگر پھر اس کے ذہن میں آندھیوں کا رخ بدل گیا۔ سب کچھ جیسے الٹا ہو تاریکیوں میں کہیں بجلی سی کوندی اور وہ یک دم ہی جیسے ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔ فیصلہ بڑا تھا مگر اب اسے گویا غور و خوض کے لئے ایک لمحہ بھی درکار نہ تھا۔ اس کا ذہن سا ہو گیا تھا۔ ارادوں کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں نہ رہی۔ زبان کی لگام بھی اس گرفت سے چھوٹ گئی۔

”ٹھیک ہے' سن لیجئے آپ بھی میری رسوائی کی کہانی۔“ وہ دھم سے کرسی گئی۔

پھر اس نے شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دیا۔ آج فیکٹری میں جمیل کے میں اور آفس سے باہر رملہ کی موجودگی میں جو گفتگو ہوئی تھی وہ بھی سنا دی۔ اس نے بھی نہیں چھپایا اور تب اس نے اپنے آپ کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کیا جیسے اس کے بوجھ کسی اور کی سماعتوں پر' کسی اور کے محسوسات پر منتقل ہو گیا ہو۔

رمیز نے نہایت تحمل اور یکسوئی سے سب کچھ سنا تھا۔ ماہم کو یوں لگا جیسے اس دو میں اس نے پلک تک نہیں جھپکی تھی۔ کسی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا رہا تھا۔ مبادا کے ذرا بھی حرکت کرنے سے ماہم کے لفظوں کی روانی متاثر ہو جائے۔ کوئی اہم نکتہ پر آنے سے رہ جائے۔

اس کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی وہ چند لمحے تک پرخیال سی نظروں سے کی طرف دیکھتا رہا پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا دکھائی دے تھا۔

آخر وہ اس کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”ماہم! میں تو تمہیں اچھی خاصی سمجھ

لڑکی سمجھتا تھا۔ تم کچھ ایسی کم سن بھی نہیں ہو' مگر تم تو بہت نادان نکلیں' بالکل اسکول گرلز کی طرح' بلکہ آج کل تو اسکول گرلز بھی ایسی نہیں ہوتیں' اگر ذہن میں بے راہ روی کے جراثیم ہوں تب تو اور بات ہے ورنہ تو زمانے نے کم عمروں کو بھی بہت ہوشیار بنا دیا ہے۔“

ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”تم نے تو اپنے آپ کو عجیب دلدل میں پھنسا لیا ہے۔ مجھے نہ جانے کیوں یہ سب کچھ سن کر ایک بے عنوان سا صدمہ پہنچا ہے۔“ وہ شاید اپنے محسوسات کے بارے میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر نہ جانے کیوں ہچکچاہٹ آمیز سے انداز میں خاموش ہو گیا۔

اس دوران میں اس کا سگار بجھ چکا تھا۔ وہ اسے کرسٹل ایش ٹرے میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”فرض کرو کسی بھی طریقے سے جمیل کو مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ علی الاعلان تمہیں قبول کر لے۔ اپنے گھر میں بسا لے' تب بھی تمہارا کیا خیال ہے' تم اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی گزار سکو گی؟“

ماہم خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

رمیز نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ ”جس شخص کی نیت پہلے ہی ٹھیک نہیں تھی' جس نے تمہیں ایک خطرناک دھوکا دیا۔“

”خطرناک دھوکا؟“ ماہم سرسراتی سی آواز میں بولی۔

”ہاں' مجھے یقین ہے کہ جس شادی کا تم ذکر کر رہی ہو وہ محض ایک ڈرامہ تھی۔“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔

”نہیں۔“ ماہم کا خشک گلا کچھ اور خشک ہونے لگا۔ اس کا دل یک دم ڈوب سا گیا۔ ہاتھ پیروں میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔

”جمیل جیسے آدمی کے لئے اس قسم کے انتظامات کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ تم چونکہ عام طریقوں سے اس کے ہاتھ نہیں آئیں اس لئے اس نے تھوڑا سا تردد کیا ورنہ اس کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ وہ کچھ اور طرح کا آدمی ہے۔ اچھے بھلے لوگوں کو خوابوں کی دنیا میں لے جانے والا' سرابوں میں بھٹکا دینے والا' تمہارے لئے اسے کچھ آگے جانا پڑا۔ یہ اس

کی فطرت ہے۔ وہ جس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ہر حربہ اختیار کر لیتا ہے۔

پھر رمیز کے لہجے میں تاسف جھلک آیا۔ "جس شخص نے تم سے اتنا بڑا دھوکا کیا او جو' اب تم سے جان چھڑانا چاہتا ہے' اگر وہ مارے باندھے' بادلِ ناخواستہ تمہیں قبول بھی کرلے اور نئے سرے سے تمہاری شادی بھی کرادی جائے تو تمہیں یقین ہے کہ تم ا زندگی گزار سکو گی جس کے تم نے خواب دیکھے تھے؟"

ماہم نے بے بسی سے نفی میں سرہلا دیا۔

اس موضوع پر اس نے سوچا نہیں تھا۔ درحقیقت اس نے کسی بھی پہلو پر صح طرح سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں صحیح طور پر کام ہی نہیں کر رہ تھیں۔ جس کی محبت میں وہ دنیا جہان سے بے خبر ہوگئی تھی' کیا وہ واقعی اتنا فریبی اور مکا تھا؟ اس حقیقت کو اس کے ذہن نے ابھی تک قبول نہیں کیا تھا۔

"تو پھر کیوں اس کا تعاقب کر رہی ہو؟ اپنی مجروح انا کو کچھ اور مجروح کرنے کا سامان کیوں کر رہی ہو؟ یہ زندگی بھر کی رفاقتوں کے معاملے ہیں۔ کسی کو مجبوری کی بندشوں میں باندھ کر ساتھ نہیں چلایا جاسکتا.......... اور اگر تم اس سے لڑو گی' زیادہ واویلا کرو گی تو اس کا سب سے زیادہ نقصان صرف تمہیں ہوگا۔ وہ تمہاری زبان بند کرانے کے لئے کوئ خطرناک قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔ آخر وہ ایک بڑے صنعت کار اور سرمایہ دار کا بیٹا ہے۔"

رمیز اس کے بارے میں بالکل غیر متعلق اور غیر جانبدار ہو کر بات کر رہا تھا جیسے اس کا بھائی نہیں' کوئی تیسرا فریق ہو۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "زندگی تو لڑ کی تباہ ہوتی ہے اور پھر آج کل تو قوانین بھی دہرے دہرے چل رہے ہیں جو لڑکی لئے تو بہت ہی تباہ کن اور رسوا کن ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"آپ مجھے ڈرا کر بددل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شکست مان لینے کی طرف راغب کر رہے ہیں۔ آخر بھائی ہیں نا اس کے' بھائی ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں۔" ما بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"بہت خوب..........!" رمیز کے لہجے میں ہلکی سی تلخی در آئی۔ "یہی صلہ ملتا آج کل ہمدردی کرنے کا' لیکن میں تمہیں بے وقوف اور نادان سمجھ کر تمہارے طنز کو نظ

انداز کر رہا ہوں۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "تمہارا دل چاہے تو یقین کر لینا اور دل نہ مانے تو یقین مت کرنا' لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس کی انہی حرکتوں کی وجہ سے میں اسے پسند نہیں کرتا۔ ٹھیک ہے' دولت آج کے دور میں کچھ نہ کچھ برائیاں ضرور ساتھ لے کر آتی ہے اور مجبوراً انہیں نظرانداز بھی کرنا پڑتا ہے لیکن کسی کو دھوکا دینا میری نظر میں ناقابلِ معافی ہے اور یہ غیر ضروری بھی ہے۔"

شاید اسے احساس ہوا کہ ماہم کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی تھی۔ وضاحت طلب انداز میں بولا۔ "بھئی دیکھو' اگر عیاشی اس کی فطرت میں شامل ہے تو جس پوزیشن میں وہ ہے اس پوزیشن میں وہ کسی کو دھوکا دیئے بغیر بھی جتنی چاہے عیاشی کر سکتا ہے لیکن کسی کم مایہ' سیدھی سادی اور نادان قسم کی ورکر کو محبت کا فریب دے کر لوٹنا محض بدفطرتی ہے اور کچھ بھی نہیں۔"

اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں۔ "صرف اپنی بدفطرتی کی وجہ سے ہی نبیل مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔ میں اسے تمہارے "انتقام" سے بچانے کی کوشش نہیں کر رہا۔ میں تو نہایت غیر جذباتی انداز میں دلیل اور منطق کے سہارے تمہارے لئے کوئی راستہ تلاش کر رہا تھا لیکن اگر تمہیں انتقام لینے کا اتنا ہی شوق ہے تو ضرور لو۔ تم جو چاہتی ہو وہ کر گزرو' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

وہ تھکے تھکے انداز میں اپنی ریوالونگ چیئر پر آبیٹھا۔ ماہم کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا اور رمیز کے الفاظ گویا اس کے ذہن میں اپنی بازگشت چھوڑ گئے تھے۔ اس نے چند لمحے خاموش رہتے ہوئے ان پر غور کیا۔

"میں.......... میں معافی چاہتی ہوں کہ میں نے آپ کی نیت پر شبہ کیا۔ دراصل میرے حواس ٹھکانے نہیں ہیں۔" وہ شرمسار سے لہجے میں بولی۔

رمیز کے دل میں اگر کوئی خفگی تھی تو وہ گویا فوراً ہی دور ہوگئی۔ اس کے چہرے سے بادل سے ہٹ گئے۔

"میں تو صرف یہی جاننا چاہتا تھا کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟" وہ لائٹر سے اپنا سگار

دوبارہ سلگاتے ہوئے بولا۔ "بغیر سوچے سمجھے تو ڈیڈی کے سامنے جانے کا بھی کوئی فائد نہیں ہوگا۔ وہ تمہاری بات پر یقین ہی نہیں کریں گے۔ ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیں گے۔ اگر تم خوف زدہ یا مرعوب نہیں ہوگی تو معلوم ہے وہ زیادہ سے زیادہ کیا کہیں گے؟"

"کیا کہیں گے؟" ماہم نے مردہ سی آواز میں پوچھا۔

"وہ کہیں گے' اچھا......... تو لڑکی تم ہمیں بلیک میل کرنے آئی ہو؟ اسکینڈل کھڑ کرکے ہمیں پریشان کرنا چاہتی ہو؟ بولو اپنی زبان بندی کی کتنی قیمت چاہیے تمہیں؟ یہ کہہ کر وہ دوچار لاکھ روپے تمہارے منہ پر مارنے کی کوشش کریں گے۔ کیا روپیہ تمہارے مسئلے کا حل ہے؟ کیا روپے پیسے کی تمہاری نظر میں کوئی اہمیت ہے؟"

"میں لعنت بھیجتی ہوں ایسے روپے پر۔" وہ تیزی سے بولی۔ "میں نے تو آج تک جمیل سے کوئی تحفہ قبول نہیں کیا۔ حالانکہ میں تو اپنی دانست میں اس کی منکوحہ تھی۔ لے بھی لیتی تو کیا حرج تھا؟ میرا حق بنتا تھا لیکن میں نے یہی سوچا کہ جب شادی چھپ کر کی ہے تو تحفے لے کر کیا کروں گی؟ انہیں بھی کہیں چھپانا ہی پڑے گا۔ میں کہاں چھپاتی پھروں گی۔ اگر میں نے جمیل کی دولت سے متاثر ہو کر اس سے شادی کی ہوتی اور دولت بھی وہ جو مستقبل میں کبھی اسے ملے گی......... فی الحال اس کے ہاتھ میں نہیں ہے تو میں اس سے لڑنے کی نہیں' اس سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کرتی۔"

"اس وضاحت کی ضرورت نہیں۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا جیسے وہ اسے خوب جانتا ہو۔ اس کا مزاج آشنا ہو۔ اسے کسی قسم کی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ "گھوم پھر کر سوال پھر وہیں آجاتا ہے کہ تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں.........؟" اس نے آنکھیں پھیلائیں اور اس لمحے خود کو ایک نہایت سیدھی سادی دیہاتی سی لڑکی محسوس کیا۔ پھر وہ بے بسی سے ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولی۔ "مجھے خود نہیں معلوم' میں تو بس کسی رد عمل کا اظہار چاہتی تھی۔ میں اسے احساس دلانا چاہتی تھی کہ میں اتنی بے بس نہیں ہوں۔ غریب اور بے سہارا ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی لڑکی کو اتنی آسانی سے لوٹ لیا جائے اور وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ اِٹ اِزناٹ فیئر رمیز صاحب! اِٹ اِز ناٹ فیئر۔" ایک بار پھر اس کی آواز بھرانے لگی۔

ایک سسکی سی لے کر وہ سنبھل کر بولی۔ "اس طرح تو اس کا حوصلہ بڑھتا رہے گا۔ مجھ سے پہلے نہ جانے کن کن طریقوں سے' کون کون سی لڑکی بے وقوف بنی ہوگی اور آئندہ بھی بنتی رہے گی۔ کسی کو تو آگے بڑھ کر اس کی عیاشی کے اس انداز پر بند باندھنا چاہیے۔ یہ سب کچھ تو بہت شرمناک ہے۔"

"وقت خود ان بیماریوں کا علاج کر دیتا ہے یا پھر کوئی سزا دیتا ہے۔ میں نے بارہا اسے سمجھایا ہے۔ کچھ جوانی کا جوش ہے' کچھ بڑے باپ کا بیٹا ہونے کا زعم ہے۔ ابھی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ سختی اختیار کرنے کا مجھے کوئی خاص حق حاصل نہیں ہے اور دنیا کے سامنے میں کوئی تماشا کھڑا کرنا بھی نہیں چاہتا۔ ویسے بھی میرے خیال میں بد فطرتی کا کوئی علاج نہیں' بد فطرتی کا علاج ایک نہ ایک دن فطرت خود کر دیتی ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں تو اب خود اپنی نظر میں بھی کسی قابل نہیں رہی۔" اسے قطعاً احساس نہیں تھا کہ وہ اب اس سے مشورہ طلب کر رہی ہے جو اسے لوٹنے والے کا سگا بھائی ہے۔

رمیز ایک بار پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پیشانی کی شکنیں بتا رہی تھیں کہ وہ گہری سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ چند لمحے بعد وہ سگار کا کش لے کر اپنی کرسی کے قریب آرکا۔ میز کے دوسری طرف سے اس نے ماہم کی آنکھوں میں جھانکا۔

پھر وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "تم مجھ سے شادی کر لو۔"

ایک لمحے کے لئے وہ اپنی جگہ سن سی بیٹھی رہی۔ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے کانوں کی لویں تپ اٹھیں۔

"تاکہ ایک دو سال بعد آپ بھی اس شادی سے منکر ہو جائیں؟" وہ زہریلے لہجے میں بولی۔

"کیا بکواس ہے۔" وہ یک دم غصے اور بے ساختگی سے بولا۔ برف کی چوٹیوں کی طرح سرد نظر آنے والی اس کی آنکھوں میں انگارے سے دہک اٹھے۔ "کیا تمہیں مجھ میں اور جمیل میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟ جس شادی کی میں بات کر رہا ہوں' وہ چوری چھپے دو

چار جعلی گواہوں کی موجودگی میں' کسی قریبی شہر کے نامعلوم مکان میں نہیں ہوگی۔ میں جس شادی کی بات کر رہا ہوں وہ میرے والد اور تمہاری والدہ کی رضا مندی سے' اسی کالونی میں علی الاعلان سینکڑوں باراتیوں کی موجودگی میں ہوگی۔"

"میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید اس پیشکش پر کم از کم دل ہی دل میں بہت خوش ہوتی لیکن میرا دل کچھ اور اداس ہو گیا ہے۔ میں یہ شادی نہیں کر سکتی رمیز صاحب!" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"لیکن کیوں.........؟" رمیز کچھ زیادہ حیران نظر نہیں آرہا تھا جیسے اسے اپنے سوال کا جواب معلوم ہو مگر محض رسماً پوچھ رہا ہو۔

"لڑکی کوئی بے جان گڑیا تو نہیں ہوتی رمیز صاحب کہ جب چاہا ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دی۔ ایک بستر سے اٹھا کر دوسرے بستر پر سجا دی۔" وہ افسردگی سے بولی "میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی کیونکہ مجھے آپ سے محبت نہیں ہے۔"

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا جیسے اس نے کوئی بچکانہ سی بات سن لی ہو۔ پھر وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ملائمت سے بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے ماہم' کیا ہمارے معاشرے میں سب شادیاں محبت ہی کی شادیاں ہوتی ہیں؟ میرا خیال ہے کہ نوے فیصد سے بھی زیادہ شادیاں صرف ضرورت کی شادیاں ہوتی ہیں۔ انہی میں سے ایک شادی ہماری بھی ہوگی۔ ہر جگہ ضرورت کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔"

"لیکن آپ کیوں کریں گے مجھ سے شادی؟ آپ کو کیا ضرورت پڑی ہے؟" ماہم نے دھندلائی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے تم جن خوبیوں کی بنا پر اچھی لگی ہو ان میں سے ایک خوبی تمہاری صاف گوئی بھی ہے۔" رمیز بولا۔ "تم اتنی صاف گو ہو کہ مجھے تمہاری شخصیت شیشے کی طرح شفاف نظر آتی ہے۔"

اس نے ایک لمحے توقف کیا گویا خود کو کوئی بہت خاص بات کہنے کے لئے تیار کر رہا ہو پھر وہ ذرا دھیمے لہجے میں بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم جتنی صاف گو ہو' اتنی ہی صاف گوئی دوسروں کی طرف سے بھی برداشت کروگی۔ میں بھی تمہاری ہر بات کا جواب نہایت

صاف اور سچے طریقے سے دینا پسند کروں گا۔"

اس نے گہری نظروں سے ماہم کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھی۔ "میں یہ دعویٰ نہیں کروں گا کہ میں اچانک تمہاری محبت میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے شادی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میری عمر چالیس کے قریب ہوچکی ہے۔ اگر میں صحیح معنوں میں ضرورت محسوس کرتا تو اب تک شادی کرچکا ہوتا' لیکن یہاں بات میری ضرورت کی نہیں' تمہاری ضرورت کی ہے۔"

اس نے ایک لمحے کے لئے سگار کے ٹکڑے کو انگلیوں میں گھمایا اور ایش ٹرے میں مسل دیا۔ پھر وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی تلافی کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ تم ویسے ہی باعزت اور آسودہ حال گھرانے کی بہو بنو۔ تمہیں ویسا ہی محبت کرنے والا شوہر ملے جس کا تم نے خواب دیکھا تھا۔"

"لیکن آپ میرے لئے محبت کرنے والے شوہر کیسے ثابت ہوسکتے ہیں جبکہ آپ کو مجھ سے محبت ہی نہیں ہے۔"

"میں اپنی سی کوشش کروں گا۔" اس نے رسان سے جواب دیا۔ "ویسے بھی جب انسان لٹ جاتا ہے تو اسے اپنے نقصان کی تلافی کے لئے تھوڑی بہت کمی بیشی پر تو سمجھوتہ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

عجیب ہی دلیل ڈھونڈ کر لایا تھا وہ......... اس کی بات میں بڑا وزن تھا۔

ماہم خاموشی سے اس کی طرف تکتی رہی تو وہ بولا۔ "دراصل میں اپنی ذمے داری محسوس کررہا ہوں۔ آپ کے ساتھ جس نے دھوکا کیا' وہ اس گھرانے کا فرد ہے' میرا بھائی' میرا اپنا خون ہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ اس کا کفارہ مجھے ادا کرنا چاہیے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ماہم کی آواز گویا کسی کنویں کی تہہ سے ابھری۔ "آپ کی زندگی کیا اس شرمساری میں نہیں گزرے گی کہ چھوٹے بھائی نے جس احمق لڑکی کو دھوکا دے کر' کچھ عرصے کے لئے کھلونا بنا کر چھوڑ دیا' بڑے بھائی نے اسے گھر کی عزت بنالیا؟ اس احساس سے آپ کی نظریں تو نہیں جھکیں گی؟ پھر دھیرے دھیرے یہ شرمساری اور پچھتاوا مجھ سے نفرت کی صورت تو اختیار نہیں کرلے گا؟"

وہ بڑے تحمل سے مسکرایا اور مربیانہ سے لہجے میں بولا۔ "کیا تمہیں اندازہ نہیں ہو کہ میں اور جمیل' بھائی ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ماہم' میں قول نبھانے والا آدمی ہوں۔ اگر میں نے زندگی میں شرمساری یا کوئی اور مسئلہ محسوس بھی کیا تو میں اس کا حل تلاش کروں گا۔ نفرت یا کھسیاہٹ کی آغوش میں پناہ تلاش نہیں کروں گا۔" پھر وہ سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔ "یہ دراصل بزدلی کے اظہار کے مختلف طریقے ہیں اور میں بزدل نہیں ہوں۔ ویسے بھی ہمارے ہاں شرمساری اور فخر' اچھائی اور برائی کے پیمانے بدل گئے ہیں۔ شرمسار اسے ہونا چاہیے جس نے گناہ کیا ہو' کوئی غلط کام کیا ہو لیکن ہمارے معاشرے میں اس کے بالکل الٹ ہوتا ہے۔ یعنی الٹا وہ شرمندہ ہوتا ہے جس نے نیکی کی ہو۔"

اس نے گہری سانس لی اور اپنے لہجے میں گویا ایک عزم سموتے ہوئے بولا۔ "لیکن میں کوشش کروں گا کہ روایت کے اس دھارے میں نہ بہہ جاؤں۔ میرا ضمیر مطمئن ہوگا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' جذباتی ہو کر نہیں' بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ میں نے اپنی دانست میں ایک اچھا کام......... ایک نیک عمل کیا ہوگا۔ میں تو سر اٹھا کے چلوں گا۔ شرمندہ تو اسے ہونا چاہیے جس نے اتنا بڑا فریب کیا ہے۔ شادی کے نام پر ڈرامہ رچایا ہے۔ محبت کے نام پر اعتبار لوٹا ہے۔ اگر اسے شرمندہ ہونے کی توفیق نہیں ہوگی تو کوئی بات نہیں۔ میں بہرحال اسے اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ وہ ہمیں شرمندہ کرے۔"

وہ خاموش تھی۔ رمیز منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن ماہم کی کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔

"کچھ تو جواب دو ماہم!" آخر وہ بولا۔

ماہم مضطربانہ انداز میں میز پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ کبھی سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتی' کبھی نظر جھکا لیتی۔

آخر وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں بولی۔ "رمیز صاحب! آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو آج کے دور میں نایاب ہو چکے ہیں۔ آپ نے میرے لیے اتنا سوچا۔ اس حد تک آگے

جا کر اتنا بڑا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے میں آپ کی شکرگزار ہوں۔ یہ ایک ایسا احسان ہے جس کا میرے پاس کوئی صلہ نہیں' لیکن رمیز صاحب' مجھے شوہر خیرات میں نہیں چاہیے۔"

"بھئی' تم تو بہت مشکل لڑکی ہو۔" رمیز گویا زچ ہو کر بولا۔ "میں تو اب حیران ہو رہا ہوں کہ جمیل تم جیسی لڑکی کو بے وقوف بنانے میں کیونکر کامیاب ہو گیا؟"

ماہم گویا تڑپ کر بولی۔ "وہ دھوکہ درحقیقت مجھے جمیل نے نہیں' خود میری محبت نے دیا تھا۔ اگر مجھے جمیل سے محبت نہ ہوتی تو وہ مجھے کبھی بھی دھوکہ نہیں دے سکتا تھا۔"

"لیکن دھوکا بہرحال دھوکا ہے' چاہے وہ محبت کی آڑ میں دیا جائے یا کسی اور بہانے سے۔" رمیز بولا۔

"ہو سکتا ہے آپ کا خیال درست ہو۔" وہ مبہم لہجے میں بولی۔

دفعتاً جیسے رمیز کو کوئی اور خیال آیا۔ ذرا چونک کر بولا۔ "کیا تمہیں جمیل کا اصل روپ دیکھنے کے بعد بھی اس سے محبت ہے؟ اور کیا درحقیقت تمہیں وہی محبت مجھ سے شادی کے لئے ہامی بھرنے سے روک رہی ہے؟"

ماہم نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا' عجیب سے انداز میں مسکرائی پھر نہایت دھیمے لہجے میں بولی۔ "رمیز صاحب! سائنس کا اصول ہے کہ مادہ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ کبھی فنا نہیں ہوتا' کسی نہ کسی شکل میں اپنا وجود برقرار رکھتا ہے۔ محبت' مادے سے بالکل مختلف اور الٹ چیز ہے۔ محض ایک جذبہ ہے لیکن میرا خیال ہے محبت بھی کبھی فنا نہیں ہوتی۔"

"یعنی سیدھے انداز اور سادہ سے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ اس کی محبت اب بھی تمہارے دل میں موجود ہے' رخصت نہیں ہوئی؟" رمیز مسکرایا مگر اس مسکراہٹ میں ایک عجیب سی افسردگی کی آمیزش تھی۔

ماہم اسی دھیمے لہجے میں بولی۔ "رمیز صاحب! ابھی آپ خود ہی اعتراف کر چکے ہیں کہ میں ایک صاف گو اور سچی لڑکی ہوں۔ میں ریاکاری سے کام نہیں لوں گی۔ جمیل سے مجھے جو محبت ہے وہ تو کبھی فنا نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنی جگہ برقرار رہے گی لیکن وہ ایک گھٹیا انسان

ہے' اس محبت کا مستحق نہیں' اس لئے میں نے اس محبت کو دل کے کھنڈر میں دفن کر دیا ہے۔ مطمئن رہیے۔ وہ محبت اب کبھی آسیب کی طرح مجھ پر غلبہ نہیں پائے گی۔"

رمیز نے گہری سانس لے کر ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگالی۔ اس کے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے تھے اور وہ کھوئی کھوئی نظروں سے اک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ ماہم نے اپنے آپ کو نروس اور مضطرب محسوس کیا۔

جب وہ بولا تو اس کی آواز سرگوشی سے کچھ ہی بلند تھی۔ "تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں شادی کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کرتا؟ ٹھیک ہے' میں کچھ ایسا نو عمر یا نوجوان نہیں لیکن کچھ ایسا بوڑھا بھی نہیں ہو گیا ہوں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں' لیکن میں کسی کی نجی زندگی میں جھانکنا پسند نہیں کرتی رمیز صاحب! آپ خود ہی جہاں تک مناسب سمجھتے ہیں بتاتے جا رہے ہیں۔ میں تو درحقیقت آپ سے کچھ بھی پوچھنا نہیں چاہتی۔ یہ تو آپ کی نوازش ہے جو آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ اتنا کھل کر باتیں کیں۔"

اب وہ ایک ٹک چھت کو گھور رہا تھا جیسے وہ کوئی اسکرین ہو اور اس پر یادوں کی فلم چل رہی ہو۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "محبت کے بارے میں' میں تمہارے اس فلسفے سے متفق ہوں کہ محبت کبھی فنا نہیں ہوتی۔ میں بظاہر بہت پریکٹیکل انسان بن گیا ہوں۔ میری زندگی میں گویا جذبات کا کوئی گزر نہیں لیکن اندر سے میں آج بھی ایک ٹین ایجر کی طرح جذبات پرست ہوں۔"

اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آنے لگی۔ "کبھی مجھے بھی ایک لڑکی سے محبت تھی' آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ مگر آج وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح صاف گو' سیدھی' سچی اور شفاف شخصیت کی مالک تھی۔ کوئی پیچ و خم نہیں تھا اس میں' کوئی دھند نہیں تھی اس کی ذات کے افق پر۔ برسوں گزر گئے ہیں اسے مرے ہوئے لیکن دل کا ویرانہ آج تک دوبارہ آباد نہیں ہو سکا۔"

یادوں کی گہری پرچھائیوں نے اس کے وجیہہ چہرے کو جیسے گہنا دیا۔ یک دم ہی وہ

بہت تھکا تھکا دکھائی دینے لگا تھا۔ ماہم کے وجود میں ایک عجیب سا سناٹا پھیل گیا۔ آفاق کی اس کار گاہ شیشہ گری میں ہر طرف کوئی نہ کوئی کہانی کرچیوں کی صورت بکھری ہوئی تھی۔ ہر قہقہے کے پیچھے سسکی' ہر مسکراہٹ کے پیچھے آنسوؤں کی چمک چھپی ہوئی تھی۔ اسے تو گمان گزرا تھا کہ اس شخص کے خانۂ دل میں محبت کے لئے جگہ ہی نہیں ہے۔ وہ شاید محبت کرنے کا اہل ہی نہیں ہے لیکن وہ تو شاید دوسروں سے کہیں زیادہ شدتوں کے ساتھ محبت کرنے کا قائل بھی ہے اور گھائل بھی ہے۔ اس کے سینے میں بھی شاید زخموں کا گلزار مہک رہا ہے اور زخم تو صرف محبت کرنے والوں کا ہی نصیب ہوتے ہیں۔

"کیسے مری تھی وہ؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"مجھے فلائنگ کا شوق تھا' لائسنس یافتہ پائلٹ تھا میں۔" وہ ٹوٹتی ہی آواز میں بتانے لگا۔ "فلائنگ کلب کا ممبر تھا۔ اس روز میں کلب کا ڈکوٹا طیارہ اڑا رہا تھا' ثمینہ میرے ساتھ تھی۔ ہمیشہ کی طرح زندگی سے بھرپور انداز میں ہنس رہی تھی کہ طیارہ کریش ہو گیا۔"

"کیسے؟" ماہم نے سرسراتی سی آواز میں پوچھا۔

"صرف میری غلطی کی وجہ سے۔" وہ کچھ اس طرح بولا جیسے اس غلطی پر اپنے آپ کو ہلاک کر لینا چاہتا ہو مگر اس ارادے پر عمل نہ کر سکنے کی وجہ سے خود اپنی نظروں میں شرمندہ ہو۔ اس نے گویا بڑی دقت سے بات جاری رکھی۔ "شاید تمہیں یاد بھی ہو' اخباروں میں خبر چھپی تھی۔ نیو کیمپس کے قریب گرا تھا طیارہ.......... صرف اس لئے کہ میں چند منٹ کے لئے سنجیدگی چھوڑ کر حد سے زیادہ شیخی اور شوخی دکھانے پر اتر آیا تھا۔ نیو کیمپس کے گرلز ہوسٹل کے لان میں چند لڑکیاں کھڑی تھیں۔ میں انہیں بھی ڈرا رہا تھا اور ثمینہ کو بھی۔ میں طیارہ کچھ زیادہ ہی نیچے لے گیا اور کرتب دکھاتے ہوئے اس پر قابو نہ رکھ سکا۔ طیارہ کریش ہو گیا۔ میں بدنصیب صرف زخمی ہوا اور آج بھی تمہارے سامنے بیٹھا ہوں لیکن وہ نہیں بچ سکی۔"

رمیز کا سر خود بخود جھکتا چلا گیا۔ اس نے دوبارہ سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ رو نہیں رہا تھا مگر آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ آنسو اندر ہی اندر انگارے

بن کر اس کی روح کو جلا رہے ہیں۔ نہ بہہ سکنے والے آنسوؤں کی اذیت زیادہ شدید ہوتی ہے۔ یہ بات ماہم کو اچھی طرح معلوم تھی۔

"اس کے بعد میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکا۔" وہ بولا۔ "محبت کو کھو دینے کا دکھ تو اپنی جگہ تھا لیکن غلطی کا پچھتاوا اس سے بھی سوا تھا۔"

پھر وہ گویا آنسوؤں کے انگاروں کو حلق سے اتارتے ہوئے ایک اذیت زدہ سی سانس لے کر بولا۔ "اپنے آپ کو اور ثمینہ کی روح کو تسکین دینے کے لئے بھلائی کے چھوٹے بڑے کام کرتا رہتا ہوں۔ ایک اچھا انسان بننے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہوں، مگر وہ جو روح کی بے کلی ہے، وہ نہیں جاتی۔ سوچتا ہوں نہ جانے ثمینہ کی روح نے مجھے معاف کیا ہو گا یا نہیں؟"

"ثمینہ کو بھی آپ سے محبت تھی نا؟"

"ظاہر ہے۔"

"بس......... تو پھر آپ دکھی رہنا چھوڑ دیجئے رمیز صاحب محبت کرنے والوں کے ہاں تو معافی ہی معافی ہے ثمینہ کی روح بھلا آپ سے خفا کیسے رہ سکتی ہے؟" ماہم نے بڑے وثوق سے کہا۔

وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے جیسے گھن چھٹنے لگا۔ بہت دھیرے دھیرے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا اجالا بکھرا۔ خود کلامی کے سے انداز میں اس نے دہرایا۔ "محبت کرنے والوں کے ہاں تو معافی ہی معافی ہے واہ......... کیا اچھی بات کہی ہے تم نے، دل پر سے گویا منوں وزنی کوئی نادیدہ بوجھ ان چند لفظوں نے ہٹا دیا ہے، بہت شکریہ۔"

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ حادثے بعض لوگوں کو جسمانی طور پر معذور کر دیتے ہیں مگر مجھے ایک حادثے نے جذباتی طور پر معذور کر دیا ہے۔ وہ یہی حادثہ تھا۔ ثمینہ کے ساتھ ہی گویا میرے جذبات بھی مر گئے۔ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر اس نے دم توڑا تھا۔ خون میں لت پت تھی وہ اور اس کے بالوں میں آگ لگ گئی تھی۔ ریشم جیسے خوب صورت بالوں میں اور وہ ایک شکستہ گڑیا کی طرح پڑی

تھی۔ میں کچھ بھی نہ کر سکا........."

ماہم سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اتنا حساس ہو گا اور دل میں اتنا بڑا گھاؤ لئے پھر رہا ہو گا۔ اس نے اپنے آپ کو اس کے دکھ میں شریک محسوس کیا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "اس کے بعد جیسے میری حسیات مر گئیں۔ میں بس ایک روبوٹ بن گیا۔ شادی کے لئے ڈیڈی نے برسوں ضد کی لیکن بس، دل نہیں مانا اور دل آج تمہیں اپنانے پر راضی ہوا تو تم نہیں مانیں، تم نے ٹھکرا دیا۔ زندگی شاید اسی الٹ پھیر کا نام ہے۔"

وہ افسردہ سے انداز میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ قدرے چونکتے ہوئے بولا۔ "ایک اور بات بھی بتاتا چلوں۔ یہ جو رملہ ہے نا، جس کا تم نے ذکر کیا ہے، جو آج کل جمیل کے گلے کا ہار بنی ہوئی ہے۔ یہ پہلے درحقیقت اس خاکسار پر ہی دل و جان سے مہربان تھی۔ شادی کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس کے والدین بھی مجھ میں ہی زیادہ انٹرسٹڈ تھے۔"

"تو پھر؟" ماہم نے پوچھا گو کہ اسے جواب کا اندازہ تھا۔

"میں نے کہا نا کہ اپنا تو دل ہی برف زار بن گیا تھا اور پھر رملہ جیسے جعلی اور مصنوعی مصنوعی سے لوگ تو مجھے اس حادثے سے پہلے بھی کبھی اچھے نہیں لگے، اب کیسے اچھے لگ سکتے ہیں؟ ان کے دلوں میں جذبات نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ شاید سینوں میں دل ہی نہیں ہوتے۔ دل کی جگہ کیلکولیٹر فٹ ہوتا ہے۔ نفع نقصان کی بیلنس شیٹ فوراً نکال کر پیش کر دیتا ہے۔"

وہ استہزائیہ سے انداز میں مسکرایا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میری طرف سے مایوسی ہوئی تو رملہ کے کمپیوٹر یا کیلکولیٹر نے اسے مشورہ دیا ہو گا کہ چھوٹے بھائی پر ٹرائی کر کے دیکھو۔ وہاں کامیابی ہو گئی۔ اب وہ خوش ہے، اس کے والدین بھی خوش ہیں۔ جمیل بھی خوش ہے۔ ان لوگوں کے لئے خوشیاں حاصل کرنا کتنا آسان ہوتا ہے۔ تمہاری طرح نہیں ہیں یہ لوگ، مجھے شوہر خیرات میں نہیں چاہیے رمیز صاحب.........!" رمیز نے ماہم کی نقل اتاری۔

ماہم کو اس کا یوں نقل اتارنا برا نہیں لگا۔ وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے بولی
"اس صورت میں تو میرے ساتھ شادی کرنا آپ کے لئے اور بھی برا ہو گا۔"

"وہ کیوں؟" رمیز نے وضاحت چاہی۔

"اس لئے کہ اگر رملہ نے میرے اور جمیل کے معاملے کی وجہ سے کچھ تو محسوس کی ہو گی تو وہ اس کا حساب برابر کرنے کی کوشش ضرور کرے گی۔ میں ایک غلطی کر بیٹھی ہوں کہ جذباتی ہو کر اس کی موجودگی میں اپنی کمزوری ظاہر کر چکی ہوں' یہ بتا کر ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ جس پر نہ جانے اس نے یقین کیا ہے یا نہیں اور جانے جمیل نے اسے کیا بتا کر مطمئن کیا ہو گا' لیکن بہرحال اگر میری اور آپ کی شادی ہو جاتی ہے تو کل کو وہ بھی میرے بارے میں کہہ سکتی ہے کہ اس لڑکی نے پہلے چھوٹے بھائی کو اسکینڈل میں الجھانے کی کوشش کی اور جب اس پر داؤ نہیں چلا تو بڑے بھائی کو پھانس لیا۔"

"جب مجھے ان باتوں کی پروا نہیں ہے تو تمہیں بھی نہیں ہونی چاہیے۔" رمیز بے نیازی سے بولا۔

"ہمارے پروا کرنے یا نہ کرنے سے اس قسم کے معاملات میں صورت حال بدل نہیں جاتی۔ ہمیں زندگی تو اسی معاشرے میں گزارنی ہوتی ہے نا۔" ماہم قدرے تلخی سے بولی۔

"تمہاری تسلی کے لئے میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ مجھے اپنی نجی زندگی میں دخل دینے والوں سے نمٹنا خوب آتا ہے۔ خواہ وہ میرا سگا بھائی اور ہونے والی بھابی ہی کیوں نہ ہو۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہارا جواب اب بھی انکار میں ہی ہے؟"

"ہاں!" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور گھڑی دیکھ کر جھرجھری سی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اوہ' مجھے تو بہت دیر ہو گئی۔ امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔"

"لیکن اتنی پریشان نہیں ہوں گی جتنا اس وقت میں ہوں۔" رمیز بھی طویل سانس

لے کر اٹھتے ہوئے بولا۔ "تمہارا انکار اپنی جگہ سہی لیکن تم نے جو کہانی مجھے سنائی ہے' میں اس سلسلے میں اپنی سی کارروائی ضرور کروں گا۔"

"کیا کریں گے آپ؟" وہ اب چونکی۔ جذبات کے ایک عجیب سے موڑ پر پہنچ کر اس نے اپنی بپتا اسے سنا تو ڈالی تھی لیکن اب جب اس نے اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور ماہم نے اس کے لہجے کی مضبوطی کو محسوس کیا تھا تو وہ اندر ہی اندر اپنے کچھ خوف زدہ سی ہو گئی تھی۔

"میں پہلے اس سلسلے میں جمیل سے نمٹوں گا۔ پوری تحقیق کروں گا۔ اگر وہ شادی ٹھیک تھی' باقاعدہ نکاح ہوا تھا تو میں جمیل کو مجبور کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ باقاعدہ رخصتی کروا کے تمہیں لائے اور گھر بسائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکا تو اس سے باضابطہ طور پر تمہیں طلاق دلاؤں گا تاکہ تم خواہ مخواہ کے اس ناکارہ بندھن میں الجھ کر گھٹتی نہ رہو بلکہ اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے لئے آزاد ہو جاؤ۔ تمہارے دل و دماغ اور ضمیر سے ایک نادیدہ بوجھ ہٹ جائے۔"

ماہم اب ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنے مدلل انداز میں مسئلے کا تجزیہ کر رہا تھا اور اپنے لائحہ عمل کے بارے میں کس طرح قدم بہ قدم بڑھنے کی بات کر رہا تھا۔ اس کی زندگی یقیناً بڑے نظم و ضبط اور احساسِ ذمے داری سے عبارت تھی۔ وہ شاید ان ذمے داریوں کا بوجھ بھی محسوس کرتا تھا جو درحقیقت اس کی ذمے داریاں نہیں تھیں۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اور اگر یہ ثابت ہو گیا کہ وہ شادی نہیں' محض ڈرامہ ہی تھا تو' ظاہر ہے طلاق کی کارروائی کے جھنجٹ کی ضرورت نہیں ہو گی پھر میں اپنے ڈیڈی کو تمہارے ہاں بھیجوں گا' تمہاری امی سے باقاعدہ طور پر تمہارا رشتہ مانگنے کے لئے۔ اس دوران میں تمہیں بھی سوچنے کے لئے کافی دن مل جائیں گے۔ خوب سوچنا اور اگر دل چاہے تو میرے ڈیڈی کے سامنے بھی انکار کر دینا۔ میں یہ ذلت بھی برداشت کر لوں گا۔ کم از کم میرا ضمیر تو مطمئن ہو جائے گا کہ میرے بس میں جو کچھ تھا وہ میں نے کر لیا۔ میں تمہاری مدد کے لئے جس حد تک بھی جا سکتا تھا' چلا گیا۔"

پھر وہ ذرا دھیمے لہجے میں بولا۔ "ویسے میں اس شادی میں تمہارے مسئلے کا حل ہی نہیں' اپنی روح کی تسکین بھی ڈھونڈ رہا ہوں۔"

وہ اسے چھوڑنے باہر تک آیا۔ ڈرائیووے میں چار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ ایک مرسیڈیز کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "آؤ' میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔"

"نہیں' میں خود ہی چلی جاؤں گی۔" وہ گویا کسی خواب سے چونکتے ہوئے جھرجھری سی لے کر بولی۔ "دو تین فرلانگ کا تو فاصلہ ہے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" رمیز نے اصرار نہیں کیا اور واپسی کے لئے مڑتے ہوئے بولا۔ "ڈیڈی کبھی کبھار ہی اپنے پیروں پر چلنے کے قابل ہوتے ہیں۔ زیادہ تر وہیل چیئر ہی پر رہتے ہیں لیکن میں بہرحال انہیں تمہارے گھر ضرور بھیجوں گا' انتظار کرنا۔"

"پلیز........" وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ ایسا ہرگز نہ کرے مگر رمیز اس کی بات سنے بغیر اندر جانے کے لئے مڑ چکا تھا۔ ماہم گیٹ سے نکل کر چادر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر تیز تیز قدموں سے کالونی کی طرف چل دی۔

☆========☆========☆

وہ گویا ایک خواب تھا........ ایک انہونی تھی!

سیٹھ سہیل کی گاڑی جس روز کالونی کی گلی میں ماہم کے گھر کے سامنے آکر رکی' اس روز پوری گلی میں ہلچل سی مچ گئی۔ پرانے ورکرز کو بھی جہاں تک یاد پڑتا تھا' اس کالونی کے افتتاح کے بعد سے آج تک سیٹھ سہیل دوبارہ کالونی میں نہیں آئے تھے۔ افتتاح کے موقع پر وہ کارکنوں میں کوارٹروں کی چابیاں تقسیم کرنے کی تقریب میں آئے تھے۔ اس کے بعد کسی بھی موقع پر انہیں کالونی میں آتے نہیں دیکھا گیا تھا۔ اس لئے آج ان کا کالونی میں نظر آنا واقعی ایک بہت بڑی خبر تھی۔

ماہم نے ان دنوں فیکٹری میں ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست دے رکھی تھی۔ اس کی بہت چھٹیاں ڈیو چلی آرہی تھیں۔ اس نے محسوس کیا........ کہ چھٹیاں لینے کا یہ بہترین موقع ہے۔ وہ کچھ عرصہ منہ چھپا کر گزارنا چاہتی تھی۔ اس میں کسی کا بھی سامنا کرنے کی ہمت یا پھر شاید خواہش نہیں رہی تھی۔ جمیل' رملہ یا رمیز وہ کسی کی بھی

صورت دیکھنا نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی انہیں اپنی صورت دکھانا چاہتی تھی۔ اگر ذریعہ معاش کا مسئلہ نہ ہوتا تو وہ نوکری ہی چھوڑ کر کہیں اور چلی گئی ہوتی اور پھر اپنے سے زیادہ تو اسے ماں کی فکر تھی۔

اس وقت وہ اپنے کمرے میں لیٹی ایک کتاب پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر الفاظ تھے کہ بے معنی لکیروں کی طرح نظر کے سامنے سے گزرتے جا رہے تھے۔ ان دنوں اس کا یہی عالم تھا۔ دل و دماغ کسی چیز میں لگتے ہی نہیں تھے۔ وہ چیزوں کو دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہی ہوتی تھی۔

گلی میں ہلچل سی محسوس کرکے اس نے سلاخوں والی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ لمبی سی جھلملاتی' نیلی مرسیڈیز اس کے دروازے پر کھڑی تھی اور باوردی ڈرائیور سہارا دے کر سیٹھ سہیل کو گاڑی سے اتار رہا تھا۔

گاڑی سے اتر کر سیٹھ سہیل نے ڈرائیور کو ایک طرف ہٹایا اور سہارے کے بغیر ذرا تن کر سیدھے کھڑے ہو گئے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر یوں گہری گہری سانسیں لینے لگے جیسے کوئی قیدی بڑے عرصے بعد آزاد فضاؤں میں نکلا ہو۔

سیٹھ سہیل چاہے کتنے ہی بوڑھے اور بیمار رہے ہوں مگر ان کی شخصیت میں اب بھی ایک رعب اور وقار تھا۔ جسمانی طور پر بھی وہ کچھ ایسے نحیف و نزار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اچھے خاصے ڈیل ڈول کے آدمی تھے۔ کمر میں خم بھی نہیں تھا۔ کم از کم اس وقت تو نوجوانوں کی طرح ہی تن کر کھڑے تھے۔ بچے اور بڑے اپنے اپنے کوارٹروں کے دروازوں پر کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔

ماہم کا دل دھک سے رہ گیا۔ خوشی کے بجائے اسے ایک انجانا سا خوف محسوس ہوا۔ آخر رمیز نے اپنے ڈیڈی کو بھیج ہی دیا تھا۔

اس کا مطلب تھا کہ اس نے باقی معاملات طے کر لئے ہیں اپنی تسلی کر لی ہے۔ اس نے ماہم کو کوئی اطلاع بھی نہیں دی تھی۔ اس سے یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ اطلاع دینے کے قابل کوئی بات نہیں تھی۔

ماہم کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی اور اپنے کمرے کے دروازے کی اوٹ سے باہر

کا منظر دیکھنے لگی۔ اس کی امی نورالنساء بیگم' سیٹھ سہیل کو اپنے دروازے پر کھڑے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے تو دم بخود رہ گئی تھیں۔ انہیں تو پیشگی کسی کے ذریعے اشارہ تک نہیں ملا تھا کہ سیٹھ صاحب ان کے گھر آنے والے ہیں۔ ادھر ماہم بغیر کسی وجہ کے تین دن سے گھر بیٹھی ہوئی تھی۔

ان کے ذہن میں نہ جانے کیسے کیسے خیالات کی یلغار تھی۔ وہ بری طرح بوکھلا گئی تھیں۔ کبھی دوپٹہ سنبھالتی تھیں' کبھی پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتی تھیں کہ سیٹھ صاحب کو کہاں بٹھائیں۔ کوارٹر میں کوئی جگہ بھی تو ان کے شایانِ شان نہیں تھی۔

"سیٹھ صاحب.........! آپ اس غریب خانے پر؟" آخر نورالنساء بیگم ہکلائیں "آپ نے اتنی زحمت کیوں کی؟ مجھے بلوالیا ہوتا' خیریت تو ہے؟"

اس وقت بابر بھی گھر پر نہیں تھا۔ فیکٹری میں ان دنوں اس کی مزدور لیڈری زوروں پر تھی اور اس نے نہ جانے کن کن مطالبات کی حمایت میں مزدوروں کی اکثریت کو ہڑتال پر آمادہ کرلیا تھا۔ فیکٹری کی انتظامیہ کو اس نے ہڑتال کا نوٹس دے دیا تھا۔

جب وہ گھر پر ہوتا تھا تو ہر وقت مزدوروں کی آمدورفت جاری رہتی تھی اور بند کمرے میں نہ جانے کیا کیا اصلاح مشورے ہوتے رہتے تھے۔ نوالنساء بیگم گو کہ فیکٹری میں کام کر چکی تھیں مگر انہیں ان معاملات کی کوئی خاص سمجھ بوجھ نہیں تھی۔ وہ بابر کے ان معمولات سے تنگ تھیں لیکن مروت میں کچھ نہیں کہتی تھیں۔ وہ ایک وضع دار عورت تھیں۔

ان کے سیدھے سادے ذہن میں غالباً یہی آیا کہ بابر ہی کی پھیلائی ہوئی کسی گڑبڑ کی وجہ سے سیٹھ سہیل یہاں آنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ وہ سیٹھ صاحب کے کچھ کہنے سے پہلے ہی قدرے خوف زدہ سے لہجے میں بولیں

"بابر تو اس وقت گھر پہ نہیں ہے لیکن وہ کالونی میں ہی کہیں ہوگا۔ شاید کسی ہوٹل میں بیٹھا ہو۔ میں ابھی کسی بچے کو بھیج کر اسے تلاش کراتی ہوں۔"

"بابر.........؟ وہ کون ہے؟" سیٹھ صاحب نے گونجیلی آواز میں پوچھا۔

نورالنساء بیگم کو حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ وہ تو ڈر رہی تھیں کہ بابر کے پھیلائے ہوئے

فساد کی وجہ سے سیٹھ صاحب نہ جانے کتنے خفا ہوں گے لیکن وہ تو اس کے نام......... بلکہ شاید اس کے وجود سے ہی بے خبر تھے۔

بجائے اس کے کہ سیٹھ صاحب کی یہ لاعلمی دیکھ کر نورالنساء بیگم بھی یہ بات گول کر جاتیں' وہ بوکھلاہٹ اور سادگی سے کہتی چلی گئیں "وہ......... جی......... وہ میرا رشتے کا بھانجا ہے۔ آج کل مزدور لیڈر بنا ہوا ہے۔ سنا ہے اس نے ہڑتال کا نوٹس دیا ہوا ہے۔ کیا آپ اس سے ملنے نہیں آئے؟" وہ اب بھی ہکلا رہی تھیں۔

"بابر.........؟ مزدور لیڈر؟" سیٹھ صاحب نے دہرایا اور ان کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں جیسے وہ ذہن پر زور دینے اور یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ یہ نام پہلے کہاں سنا تھا۔

پھر انہوں نے سر ہلایا۔ "ہاں' نام تو کچھ سنا ہوا سا لگ رہا ہے۔ شاید جی ایم نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا لیکن یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔ انتظامیہ اس سے نمٹتی رہے گی۔ میں ان ہڑتالوں وڑتالوں سے کبھی خوف زدہ نہیں ہوا۔ ان چکروں میں' میں نے کبھی اپنی راتوں کی نیندیں حرام نہیں کیں۔ میں نے کبھی کسی کا حق نہیں مارا' اس لئے میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں دھڑلے سے اپنی فیکٹری اور دوسرے کاروبار چلاتا ہوں۔ بڑے بڑے بحران آئے اور گزر گئے۔" وہ بولتے چلے گئے گویا بہت عرصے بعد انہیں اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ملا تھا۔ ان کے لہجے میں اب بھی گھن گرج تھی۔ نورالنساء بیگم دم بخود ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

پھر اچانک ہی اس موضوع کو بیچ میں چھوڑ کر سیٹھ سہیل بالکل ہی بدلے ہوئے لہجے میں بولے۔ "تم مجھے بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہو گی؟ تمہیں آدابِ میزبانی کا قطعاً کوئی خیال نہیں؟"

نورالنساء جیسے کسی خواب سے چونکیں اور شرمندہ سی ہو کر بولیں۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا آپ کو کہاں بٹھاؤں سیٹھ صاحب.........!"

اس نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر وہ برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی کو ہی دوپٹے سے صاف کرنے لگیں۔ ماہم اپنے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھولے' اس کی اوٹ

سے یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ نکل کر باہر آتی۔

سیٹھ سہیل کرسی پر بیٹھنے کے بعد ایک طویل سانس لے کر بولے۔ "میں تم سے ملنے آیا ہوں' تم نورالنساء ہونا؟ حاجی نثار کی بیوہ؟ کبھی تم بھی ہماری فیکٹری میں کام کرتی تھیں؟ اسٹچنگ کے شعبے میں؟"

"جی..........جی ہاں' بالکل صحیح پہچانا آپ نے۔" نورالنساء جلدی سے بولیں۔

ماہم فیصلہ نہیں کرپارہی تھی کہ واقعی سیٹھ صاحب کی یادداشت اچھی تھی یا یہ تمام معلومات انہوں نے آنے سے پہلے جمع کی تھیں۔

نوالنساء بیگم کو جیسے آدابِ میزبانی کا کچھ اور خیال آیا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولیں۔ "آپ کیا پینا پسند کریں گے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "آج کل میں ڈاکٹروں کے مشورے کے بغیر کچھ بھی نہیں پی سکتا۔ تم ان چکروں کو چھوڑو۔ وہ آدابِ میزبانی والی بات میں نے صرف بیٹھنے بٹھانے کی حد تک ہی کی تھی۔ تم نے بیٹھنے کے لئے مجھے کرسی مہیا کردی' بس یہی کافی ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے یوں خاموش ہوئے گویا مناسب الفاظ تلاش کر رہے ہوں۔ پھر ملائمت سے بولے۔ "بات یہ ہے نورالنساء بیگم' میں وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتا' اس لئے اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔ حالانکہ آج کل میرے پاس وقت ہی وقت ہے کیونکہ میرے بیٹوں نے میری صحت کی خرابی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے ریٹائر کرکے گھر بٹھا دیا ہے۔ سیدھی' سچی اور مختصر بات یہ ہے کہ میں اپنے بیٹے رمیز کے لئے تمہاری بیٹی کا رشتہ مانگنے آیا ہوں' ماہم نام کی تمہاری کوئی بیٹی ہے نا؟"

نورالنساء بیگم کے لئے شاید یہ زندگی کی سب سے بڑی حیرت انگیز بات تھی۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

☆=======☆=======☆

عالیہ نے رکشے سے اتر کر کرایہ ادا کیا۔ رکشا دھوئیں کے کثیف بادل چھوڑتا اور اپنی آواز سے در و دیوار کو لرزاتا' اپنے جیسی دوسری گاڑیوں کے سیلاب میں مدغم ہو چکا تو

عالیہ نے گہری سانس لی۔ وہ شہر کا مرکزی علاقہ تھا۔ ٹریفک کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور گاڑیوں کے دھوئیں سے فضا سرمئی نظر آرہی تھی۔ یہ دھواں ایسا تھا کہ سانس کے ساتھ جسم میں جاتا تھا تو لگتا تھا کہ سانس کی نالیوں اور پھیپھڑوں پر خراشیں پڑ رہی ہیں۔ آنکھوں میں اس کی وجہ سے مرچیں سی لگتی محسوس ہوتی تھیں۔

عالیہ نے غیرارادی طور پر دوپٹے کا آنچل ہولے ہولے سے ناک پر ٹکاتے ہوئے سر اٹھا کر اپنے بائیں طرف' سڑک کے کنارے موجود اس پیلی عمارت کو دیکھا جس کا رنگ کچھ تو دھوئیں کی مسلسل یلغار اور کچھ کہنگی کی وجہ سے سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ اس کے اصل یعنی پیلے رنگ کی تہیں بھی جگہ جگہ سے اتر چکی تھیں اور وہ جگہیں کوڑھ کے داغوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

عمارت کے نیچے کی دکانوں میں موٹر سائیکلوں کے ساز و سامان کی دکانیں تھیں۔ انہی کے سامنے بیسیوں میکنک موٹر سائیکلیں مرمت بھی کر رہے تھے۔ ان موٹر سائیکلوں کی گھڑگھڑاہٹ اور پیں پیں' پاں پاں کی آوازیں گویا ٹریفک کے شور کو شکست دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ عمارت چار منزلہ تھی لیکن یوں لگتا تھا کہ اپنی حالتِ زار پر شرمندہ شرمندہ سی اور سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس لئے کچھ پستہ قد نظر آرہی تھی۔ اس کی پیشانی پر دُھندلا دُھندلا سا اس کا نام بھی نظر آرہا تھا۔ "میونسپل مارکیٹ۔"

گویا اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ صحیح جگہ پر پہنچی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود اس وزیٹنگ کارڈ کو دیکھا جو جمال پاشا صاحب نے اسے دیا تھا۔ اس وزیٹنگ کارڈ کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ برسوں پہلے کبھی چھپوایا گیا تھا۔ اس کا رنگ بھی عمارت کے رنگ کی طرح زرد نظر آرہا تھا۔ اس پر اسی عمارت کا پتا درج تھا۔ وہ بچوں کے جس رسالے کی مدیرہ مقرر ہوئی تھی' وہ اسی عمارت سے نکلتا تھا۔

مایوسی کی ایک خفیف سی لہر اس کے دل کے کسی تاریک گوشے سے ابھری۔ جمال پاشا صاحب کا اپنا بزنس آفس کلفٹن جیسے پوش علاقے میں' بہت بڑے چوڑاہے پر واقع کیسی شان دار عمارت میں تھا اور کیسا آراستہ و پیراستہ تھا۔ انہوں نے خود بھی اعتراف کیا تھا کہ وہ آج جو کچھ بھی تھے' بچوں کے اس رسالے کی وجہ سے ہی تھے اور یہ ان کے

لڑکپن کا خواب تھا' وغیرہ وغیرہ' لیکن اب جبکہ وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا تھا تو وہ اسے یہیں چھوڑ گئے تھے۔ اسی کہنگی' بوسیدگی' شوروغل اور ناگوار سی بو کے درمیان۔ اسی انتہائی غیرادبی بلکہ غیرانسانی فضا میں۔

"کیا وہ اپنے لڑکپن کے اس ساتھی کو بھی اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے تھے؟" عالیہ نے ہلکی سی افسردگی سے سوچا۔ "کیا وہ اسے بھی اپنے پوش آفس کے کسی گوشے میں تھوڑی سی جگہ نہیں دے سکتے تھے؟"

پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ "پگلی! تم تو اس دنیا میں واقعی بالکل مس فٹ ہو۔ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کو کون اپنے ساتھ گھسیٹتا پھرتا ہے۔ جمال پاشا شاید کبھی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے والے آدمی رہے ہوں' لیکن زندگی کے سفر میں نہ جانے کس موڑ پر ان کے دل کی دنیا بدل چکی ہے۔ اب تو وہ کٹر بزنس مین نظر آتے ہیں۔ یہی کیا کم ہے کہ وہ اس رسالے کی خاطر پچاس ہزار روپے مہینے کا نقصان برداشت کرتے ہیں۔ بزنس مین تو بلاوجہ پچاس روپے کا نقصان اٹھانا پسند نہیں کرتا۔ بس اتنی ہی قربانی کافی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اسی لئے اس کا دفتر اپنی نظروں کے سامنے نہ رکھتے ہوں کہ پچاس ہزار روپیہ مہینہ ضائع ہونے کا غم ہر وقت ہی تازہ نہ رہے۔ تم تو خوابوں کی دنیا میں کھوئی رہنے والی لڑکی ہو۔ تمہیں ان اسرار و رموز کا کیا پتا۔"

اس نے سر جھٹک کر گویا ان خیالات سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی اور محتاط سے انداز میں فٹ پاتھ پر چڑھ کر عمارت میں داخل ہوئی۔ اندر بھی دونوں طرف دکانوں کی قطاریں تھیں جن پر کوئی گاہک نظر نہیں آرہا تھا۔ اسے احساس تھا کہ فارغ بیٹھے سب دکان داروں نے تجسس سے اس کی طرف دیکھا تھا مگر وہ گردوپیش پر توجہ دیئے بغیر سر جھکائے گزرتی چلی گئی۔ اسے احساس ہوا کہ ہر بڑھتے ہوئے قدم کے ساتھ عمارت میں روشنی کم ہوتی جارہی تھی۔

سیڑھیاں عمارت کے وسط میں تھیں۔ ان تک پہنچتے پہنچتے عالیہ ملگجے اندھیرے میں آچکی تھی۔ دن چڑھے بھی سیڑھیوں میں بلب کی ضرورت محسوس ہورہی تھی لیکن چھت میں لگے خالی ہولڈر گویا اس کا منہ چڑا رہے تھے اور اسے بتارہے تھے کہ دن میں تو

کیا' وہاں رات کو بھی روشنی میسر نہیں ہوتی۔

اس نے چند سیڑھیاں طے کیں تو بدبو کا بھبکا اس کے نتھنوں سے ٹکرایا۔ اس نے بے اختیار ایک بار پھر دوپٹے کا کونا ناک پر رکھ لیا اور سوچے بغیر نہ رہ سکی۔ "خدایا! محسوسات میں خوشبوئیں بکھیرنے والے یہاں اس بدبو میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں؟" اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ عمارت میں بہت سے دفاتر تھے جن میں سے چند دوسرے رسائل کے بھی تھے جو خاصے کامیاب اور معروف تھے مگر منبع و مرکز ان کا بھی یہیں تھا۔

اس کا مطلوبہ کمرہ ٹاپ فلور پر تھا۔ ملگجے اندھیرے میں سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اس کا حوصلہ متزلزل ہونے لگا مگر اس نے خود کو سنبھال لیا اور جب وہ اِدھر اُدھر تلاش کرتی اپنے مطلوبہ کمرے کے دروازے پر جاکر رکی تو مایوس کن خیالات کو کافی حد تک اپنے ذہن سے جھٹک چکی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا ایک نیا موڑ تھا۔ وہ حوصلے اور عزم وہمت سے اس پر قدم رکھنا چاہتی تھی۔

دروازہ کھلا ہی ہوا تھا اور اسی کے ایک پٹ پر لگی ہوئی چھوٹی سی تختی سے تصدیق ہوئی کہ وہ بچوں کے اسی رسالے کا دفتر تھا جس کی وہ اب مدیرہ تھی۔ اندر دروازے کے قریب ہی اسٹول پر میلے سے کپڑوں میں ایک عمر رسیدہ شخص بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس نے ایک آنکھ کھول کر ترچھی نظر سے عالیہ کی طرف دیکھا اور اپنی پوزیشن میں کوئی تبدیلی لائے بغیر نیم بیزاری سے بولا۔ "جی فرمایئے۔"

"مجھے محسن مفتی صاحب سے ملنا ہے۔" عالیہ نے دھڑکتے دل سے چیف ایڈیٹر صاحب کا نام لیا۔ اسے انہی کی ماتحتی میں کام کرنا تھا۔

اسٹول پر بیٹھا ہوا عمر رسیدہ شخص حلیے وغیرہ سے چپڑاسی معلوم ہوتا تھا مگر شاید وہ بھی خود کو ایڈیٹر صاحب سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے ہلنے کی زحمت کیے بغیر ایک کیبن کی طرف اشارہ کردیا جس کا دروازہ بند نظر آرہا تھا۔

عالیہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں آگے بڑھ گئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ بڑا سا ایک ہال نما کمرہ تھا جس میں کئی کیبن بنا کر اسے تقسیم کردیا گیا تھا۔ کیبنوں کی دیواروں میں دھندلے شیشے لگے ہوئے تھے۔ دو کیبن تو باقاعدہ کیبن بھی نہیں تھے۔ محض پارٹیشن تھے اور

سامنے سے کھلے تھے۔ ایک میں ایک کاتب کرسی پر تقریباً اکڑوں بیٹھا کتابت کر رہا تھا۔ اُس کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ سر پہ میلی سی ایک وزنی ٹوپی تھی حالانکہ وہ سردیوں کے دن نہیں تھے۔ اس کی میز پر سیاہی کے اتنے دھبے تھے کہ اصل رنگ تقریباً چھپ کر ہی رہ گیا تھا۔

عالیہ کے قدموں کی آواز سن کر اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور یوں مسکرا دیا جیسے عالیہ کو بہت اچھی طرح جانتا ہو۔ عالیہ نے جلدی سے دوسرے پارٹیشن کی طرف دیکھا۔ ان میں بھی خاصی بڑی عمر کے ایک صاحب چند پیکٹ میز پر رکھے ایک رجسٹر میں کچھ اندارج کررہے تھے۔ ان کے عقب میں چوبی دیوار کے قریب رسالوں کے کئی بنڈل اوپر تلے پڑے تھے۔ عالیہ نے اندازہ لگایا کہ وہ سرکولیشن منیجر تھے۔ انہوں نے محض ایک نظر عالیہ کی طرف دیکھا اور دوبارہ اپنے کام میں منہمک ہوگئے۔ ان کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

کسی کیبن یا پارٹیشن پر کوئی تختی نہیں تھی جس سے پتا چلتا کہ کون کیا تھا۔ بہرحال' محسن مفتی صاحب کے کیبن کی طرف ازراہِ کرم اس کی رہنمائی کردی گئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر انگلی سے اس کے دھندلے شیشے پر ہلکی سی دستک دی۔

اندر پہلے تو کھانسی کی آواز ابھری' پھر کوئی کھرکھراتی اور بھاری سی آواز میں بولا۔

"بھئی' آج کس کی اخلاقیات اتنی بلند ہوگئی ہے کہ دستک دینے کی ضرورت پیش آگئی؟ آجاؤ........ آجاؤ۔"

عالیہ نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تو اسے یوں لگا جیسے وہ چھوٹے سے کسی کباڑ خانے میں پہنچ گئی ہے۔ کیبن زیادہ بڑا نہیں تھا اس لئے شاید اس میں اس سے زیادہ بے ترتیبی ممکن نہیں تھی جتنی نظر آرہی تھی۔ ردی کی ٹوکری بدہضمی کا شکار تھی۔ چھوٹے بڑے کاغذوں اور کاغذ کے گولوں کی شکل میں وہ جتنے "افکار پریشاں" ہضم کرسکتی تھی' کرچکی تھی' باقی اس میں سے نکل کر اس کے اردگرد بکھرے ہوئے تھے۔

ان کے علاوہ بھی فرش پر بہت سے کاغذ' ڈاک کے لفافے اور پھٹے ہوئے کچھ کتابت شدہ کاغذ بھی بکھرے ہوئے تھے۔ محسن صاحب کی میز خاصی بڑی تھی اور کیبن کا

بیش تر حصہ اسی نے گھیرا ہوا تھا لیکن اس پر ایک انچ خالی جگہ بھی تلاش کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ اس پر فائلوں کے ڈھیر تھے' مسودوں کے ڈھیر تھے' کتابت شدہ مواد کے ڈھیر تھے۔ انہی پر اسکیچ بکھرے ہوئے تھے۔ انہی کے نیچے سے ٹیلی فون فریادی کے سے انداز میں جھانک رہا تھا۔

کیبن میں کچھ شیلف اور محسن صاحب کے دائیں ہاتھ پر کیبنٹ وغیرہ بھی موجود تھے مگر ان کا حال بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ حتیٰ کہ کچھ چیزوں پر گرد بھی جمی ہوئی تھی۔ عالیہ کی باریک بین آنکھوں کو ایک کونے میں مکڑی کے جالے بھی لگے دکھائی دیئے۔ انہی سب چیزوں کے درمیان محسن صاحب اپنی ریوالونگ چیئر پر کچھ یوں موجود تھے جیسے وہ انہی انباروں میں دفن تھے مگر کچھ ہی دیر پہلے انہیں چیر کر آدھے باہر آگئے تھے۔

محسن صاحب کے بال' مونچھیں' حتیٰ کہ بھویں بھی برف کی طرح سفید تھیں۔ ناک پر موٹے موٹے اور گول گول شیشوں کی عینک ٹکی ہوئی تھی۔ باچھوں سے پان کی پیک تھوڑی سی باہر آئی ہوئی تھی۔ ایش ٹرے میں بغیر فلٹر کی ایک سستی سی سگریٹ سلگ رہی تھی جس کا تلخ دھواں کیبن میں چکرا رہا تھا جس کی وجہ سے عالیہ کو سانس لینا ناگوار محسوس ہورہا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ یہاں ایش ٹرے میں سگریٹ اکثر اسی طرح سلگتی رہتی ہوگی اور اگر کاغذوں کے اتنے انبار کے درمیان سلگتی ہوئی سگریٹ کے باوجود آج تک یہاں آتش زدگی کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا تو یہ ایک معجزہ ہی تھا۔

محسن مفتی صاحب منحنی سے آدمی تھے۔ سفید کلف لگے کُرتے پاجامے میں تھے مگر دونوں چیزیں بری طرح شکن آلود تھیں۔ ان کے برف سے بال بھی بے ترتیب تھے۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر عالیہ کی طرف دیکھا تو ان کی عینک ناک پر کچھ اور نیچے ڈھلک آئی۔ وہ کاغذوں کے انبار پر ایک کلپ بورڈ رکھے کچھ لکھ رہے تھے۔ عالیہ کی نظر اس کاغذ پر بھی چلی گئی اور محسن صاحب کی رائٹنگ دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ جس زاویے پر وہ کھڑی تھی کم از کم وہاں سے تو اسے ایسا ہی لگا جیسے کسی کن کھجورے کو سیاہی میں ڈبو کر کاغذ پر چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس کا خیال تھا کہ اگر کاغذ کو سیدھا بھی سامنے رکھ لیا جاتا تب بھی اس لکھائی کو پڑھنا تقریباً ناممکن تھا۔ اگر کوئی کاتب اس

لکھائی کو پڑھ کر صحیح کتابت کرلیتا تھا تو یہ یقیناً اس کے معجزہ فن کی دلیل تھی۔

عالیہ کا خیال تھا کہ اس قسم کی شخصیت کے مالک.......... اس قسم کا حلیہ رکھنے والے، اس انداز اور اس ماحول میں کام کرنے والے ایڈیٹر، صحافی یا رائٹر آج کے دور میں ناپید ہو چکے ہیں اور اس قسم کے کردار صرف ٹی وی کے ڈراموں میں ذرا مزاح پیدا کرنے کے لئے دکھائے جاتے ہیں لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ کسی کونے کھدرے سے اب بھی ایک آدھ ایسا بچا کھچا نادر روزگار نمونہ سامنے آسکتا ہے۔

"جی، فرمائیے..........!" محسن صاحب کی کھرکھراتی اور بھاری سی آواز ابھری جثے کے برعکس ان کی آواز خاصی بارعب تھی۔

"جی، میں عالیہ ہوں.........."

عالیہ کو مزید کچھ کہنے کی مہلت نہیں مل سکی۔ محسن صاحب اس کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔ "اچھا، اچھا! ہاں، پاشا صاحب نے صبح مجھے فون کیا تھا آپ کے بارے میں، تو آپ ہیں میری اسسٹنٹ اور اس رسالے کی نئی ایڈیٹر۔"

انہوں نے عینک ناک پر درست کرتے ہوئے یوں عالیہ کا سر تا پا جائزہ لیا جیسے وہ کوئی ڈیکوریشن پیس ہو اور وہ گھر لے جانے سے پہلے اس کے بارے میں سوچ رہے ہوں کہ وہ سجاوٹ کے لئے مناسب بھی رہے گا یا نہیں۔ عالیہ اندر ہی اندر گویا کچھ سکڑ سمٹ کر رہ گئی۔ غنیمت تھا کہ محسن صاحب کا جائزہ مختصر ہی رہا۔

وہ سرہلاتے ہوئے بولے۔ "خوش آمدید، خوش آمدید! تشریف رکھیے۔"

عالیہ نے دیکھا، کیبن میں محسن صاحب کی ریوالونگ چیئر کے علاوہ صرف ایک ہی کرسی تھی۔ وہ بھی ایک کونے میں گویا بڑی مشکل سے پھنسائی گئی تھی۔ اس پر بھی کچھ پرانے رسالے پڑے تھے اور گرد کی ہلکی سی تہہ بھی جمی ہوئی تھی۔ اسے محسن صاحب کے سامنے گرد جھاڑنا اچھا محسوس نہ ہوا۔ وہ صرف رسالے اٹھا کر بیٹھ گئی۔

محسن صاحب اپنی ہولناک لکھائی میں جو کچھ لکھ رہے تھے وہ انہوں نے روک دیا۔ قلم ایک طرف رکھ دیا اور اس کی جگہ سگریٹ اٹھالی۔ عالیہ کو اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ بے خیالی میں سگریٹ سے لکھنے کی کوشش نہ کر ڈالیں لیکن وہ اتنے غائب دماغ ثابت نہیں

ہوئے۔ انہوں نے ایک گہرا کش لے کر کڑوے دھوئیں کا مرغولہ عالیہ کی طرف روانہ کیا اور خود کھانسنے لگے۔ عالیہ بمشکل اپنی ناگواری چھپائے بیٹھی رہی۔ اسے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں اسے بھی کھانسی شروع نہ ہو جائے مگر خیریت ہی رہی۔

"آپ نے جو درخواست اس ملازمت کے لئے پاشا صاحب کو روانہ کی تھی وہ میرے پاس آگئی تھی۔ آپ کے کوائف میرے علم میں ہیں۔" محسن صاحب نے کھانسی تھمنے پر اسے مطلع کیا اور پھر گویا اسے خوش خبری سنائی۔ "کام وام تو یہاں کوئی خاص نہیں ہے، زیادہ تر کام تو آپ کے آنے کے بعد بھی میں ہی کروں گا۔ آپ کو فی الحال میرا ہاتھ بٹانا ہوگا۔ کیونکہ آپ نے تازہ تازہ ماس کمیونی کیشنز میں ایم اے کیا ہے اور جو لوگ یہ ڈگری لے کر نکلتے ہیں انہیں عملی طور پر درحقیقت کچھ بھی نہیں آتا۔ سیکھنے کا اصل عمل تو تبھی شروع ہوتا ہے جب وہ کسی اخبار یا رسالے میں کام شروع کرتے ہیں۔ تو یوں سمجھئے کہ فی الحال آپ کی بھی سیکھنے کی ابتدا ہو رہی ہے۔"

عالیہ نے حتی الامکان انکساری سے ان کی تائید میں سرہلایا۔ محسن صاحب نے بات جاری رکھی۔ "لیکن بہرحال، جب آپ کام کو پوری طرح سمجھ جائیں گی۔ رسالے کو سنبھالنے کے قابل ہو جائیں گی تو پھر درحقیقت یہ رسالہ آپ ہی کو سنبھالنا ہوگا۔ ہمارا تو اب چل چلاؤ کا زمانہ ہے۔"

محسن صاحب کے لہجے میں اب خاصی نرمی اور ملائمت آگئی تھی۔ عالیہ خلوص سے بولی۔ "ایسا نہ کہئے۔ میری دعا ہے کہ آپ کی سرپرستی مجھے زیادہ سے زیادہ عرصے تک حاصل رہے تاکہ میں زیادہ سے زیادہ سیکھ سکوں۔"

"ارے بی بی.......... دعائیں اپنی جگہ ہیں، حقائق اپنی جگہ۔ ہم اپنا دور گزار چکے۔ ہم نے تو اسے جتنے عروج پر پہنچانا تھا، پہنچالیا۔ اب عرصے سے اس پر زوال ہی زوال ہے۔ ہم نے اپنی سی سب تدبیریں کر کے دیکھ لیں۔ الٹی ہوگئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا۔ پاشا صاحب کا خیال ہے کہ شاید نیا خون، نئی نسل، رسالے کو نئی زندگی دے دے۔ میں بھی ان کا دل رکھنے کو ان کے خیال سے متفق ہو گیا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے بی بی! اور ہمارا تجربہ ہمیں یہی بتاتا ہے کہ ایک بار جو رسالہ نیچے آگیا اسے دوبارہ اوپر لانا نیا

رسالہ نکالنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ شاید ہی ایسی کوئی مثال موجود ہو کہ ایک بار جس رسالے یا اخبار پر بہت زیادہ زوال آگیا ہو اس نے دوبارہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرلیا ہو۔"

"بہرحال، ہمیں اپنی سی کوشش تو کرنی چاہیے۔" عالیہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"ہم نے تو اپنے خیال میں کوئی کوشش چھوڑی نہیں لیکن اگر آپ کے ترکش میں کچھ نئے تیر ہوں تو آزما لیجئے گا۔" ان کا لہجہ کچھ استہزائیہ سا ہو گیا جیسے اصل میں وہ کہنا چاہتے ہوں۔ "بی بی! اگر آپ خود کو زیادہ بقراط سمجھتی ہیں تو آپ بھی اپنا شوق پورا کر لیجئے۔ ہمیں معلوم ہے آپ نے بھی منہ کی کھانی ہے۔"

"کسی اخبار یا رسالے میں کام کرنا میرا خواب ہے۔" عالیہ نے دھیمے سے لہجے میں حقیقت بیان کردی۔ "اور خاص طور پر اس رسالے میں کام کرنے کو تو میں چیلنج سمجھ کر قبول کر رہی ہوں۔"

"بہت خوب.......... بہت خوب.........." محسن صاحب کے لہجے میں استہزائیہ رنگ کچھ اور نمایاں ہو گیا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی بچے کے منہ سے ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کا دعویٰ سن رہے ہوں۔ عالیہ کو ان کا یہ رنگ بدلتا انداز کچھ عجیب لگا۔ ایک طرف وہ گویا میدان میں اس کے لئے جگہ خالی کر رہے تھے کہ وہ آئے اور اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ دوسری طرف وہ گویا پہلے ہی اس کی طرف سے مایوس تھے کہ وہ کچھ بھی نہیں کرسکتی، رسالے کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکتی۔

عالیہ کو فی الحال کوئی بھی بات کرتے وقت ہچکچاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اسی ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولی۔ "میں نے باہر ایک کاتب کو بیٹھے دیکھا ہے اور میں یہ میز پر پڑے کتابت شدہ صفحات بھی دیکھ رہی ہوں۔ یہاں ابھی تک ہاتھ سے ہی کتابت ہو رہی ہے۔ اب تو کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔ زیادہ تر رسالوں اخباروں کے دفتروں میں کمپیوٹر آگئے ہیں اور کتابت کی جگہ کمپوزنگ ہونے لگی ہے۔ اس سے رسالے میں ایک visual خوب صورتی آجاتی ہے۔ ویسے بھی جب دوسرے رسالے کمپیوٹر کی کمپوزنگ دے رہے ہوں تو ان کے درمیان ہاتھ کی کتابت والا رسالہ کچھ زیادہ ہی بدنما اور فرسودہ لگنے لگتا ہے۔"

محسن صاحب نے ترحم آمیز سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا، سگریٹ ایش ٹرے میں مسلی اور گہری سانس لے کر بولے۔ "اب آپ آگئی ہیں تو شاید کمپیوٹر بھی آجائے۔ میں نے تو کبھی اس لئے پاشا صاحب پر زور نہیں دیا کہ رسالہ پہلے ہی بہت سے تجربات میں بہت سے بڑے نقصان بھی اٹھا چکا ہے اور مستقل ماہوار نقصان بھی اٹھا رہا ہے۔ میرا اب ان پر مزید کوئی بوجھ ڈالنے کو جی نہیں چاہتا اور پھر سچی بات یہ ہے کہ میری نظر میں ان چیزوں کی اہمیت نہیں۔ رسالے ان چیزوں سے نہیں چلتے۔"

"تو پھر کن چیزوں سے چلتے ہیں؟" عالیہ نے نرم لہجے میں فوراً ہی سوال کیا۔

محسن صاحب نے عینک کے عقب سے ذرا سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ایک اور گہری سانس لی پھر ایک نئی سگریٹ سلگا کر بولے۔ "رسالے مواد پر چلتے ہیں۔ Contents پر چلتے ہیں۔"

"ہم اس پر بھی توجہ دیں گے۔" عالیہ فوراً بولی۔

محسن صاحب گویا اس کی بات سنے بغیر بولے۔ "اس کے علاوہ میرے تجربے نے مجھے بتایا ہے کہ رسالے بھی مسلمانوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کا اپنا بھی ایک مقدر ہوتا ہے جس طرح بعض انسان بہت زیادہ صلاحیت ہونے کے باوجود دنیا میں کامیاب نہیں ہوتے اسی طرح بعض رسالے بہت اچھا مواد چھاپنے کے بعد بھی نہیں چل پاتے۔"

ایک اور کش لے کر وہ بولے۔ "آپ کمپیوٹر کی بات کر رہی ہیں۔ کمپیوٹر انسان کا نعم البدل کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے اپنے مسائل ہیں۔ ہمارے اس چھوٹے سے دفتر میں کمپیوٹر کے آنے سے بڑی اکھاڑ پچھاڑ ہوگی۔ اس کے علاوہ پرانے کارکنوں کو نہ نکالنا بھی ہماری پالیسی ہے۔ ہمارا کاتب عبدالرشید ہمارا بہت پرانا ساتھی ہے اور وہ کچھ اس قسم کا آدمی ہے جو کسی اور ادارے میں چل بھی نہیں سکتا اور اب تو ویسے ہی کاتبوں کی کھپت تقریباً ختم ہو گئی ہے۔ سینکڑوں کاتب بے چارے بے روزگار ہو چکے ہیں۔ کتابت کا پیشہ ہی دم توڑ رہا ہے۔ کوئی کاتب کتابت چھوڑ کر لنڈے کے کوٹ بیچ رہا ہے۔ کوئی اپنے گاؤں واپس جاکر سبزیاں اُگا رہا ہے۔ اگر آپ محسوس کرسکیں تو یہ بھی ایک ٹریجڈی ہے۔ کسی بھی پرانی قدر کا ختم ہو جانا ایک ٹریجڈی ہے۔ مگر اس تیز رفتار، بھاگتی دوڑتی دنیا میں کس کو

اس بات کا احساس ہے کہ راتوں رات......... بیٹھے بٹھائے' بیک جنبش قلم کوئی کاروبار ختم ہو جاتا ہے۔ کوئی نئی سائنسی ایجاد سامنے آنے سے کوئی پیشہ دم توڑ جاتا ہے۔ ہزاروں گھرانے فاقہ کشی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس المیے پر ہمدردی کے دو بول کہنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔"

محسن صاحب کے لہجے میں جذباتیت جھلک آئی۔ ان کی سانس پھولنے لگی۔ انہوں نے بے تابی سے سگریٹ کا مزید ایک کش لے ڈالا۔

عالیہ گھبرا کر بولی۔ "اللہ سب کا رازق ہے۔ ایک در بند ہوتا ہے تو دوسرا کوئی نہ کوئی در کھل ہی جاتا ہے اور پھر میں یہ نہیں کہہ رہی کہ کمپیوٹر آنے کے بعد کاتب کو بالکل ہی فارغ کر دیا جائے۔ غلطیاں درست کرنے اور بعض سرخیاں وغیرہ لکھنے کے لئے اسے رہنے دیا جائے۔"

"بہت خوب!" محسن صاحب کے ہونٹوں پر ایک بار پھر استہزائیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ "یعنی آپ ادارے پر دہرا خرچ ڈالنے کی بات کر رہی ہیں۔ پہلے کمپیوٹر اور اس کے لوازمات پر بھاری رقم خرچ ہو' پھر اس کا آپریٹر رکھا جائے اور ادھر پرانا کاتب بھی موجود رہے۔ اس طرح رسالوں کی منصوبہ بندیاں نہیں ہوتیں بی بی!"

شاید پہلی ہی تجویز کا یہ حشر ہونے پر عالیہ کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر ابھرا تھا کہ محسن صاحب بات ادھوری چھوڑ کر جلدی سے بولے۔ "خیر' یہ باتیں' بحث مباحثے اور رسالے کی بہتری کے لئے تجاویز تو ڈسکس ہوتی رہیں گی۔ فی الحال آپ کام تو شروع کیجئے بلکہ ابھی تو آپ کام کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ آج تو آپ کا پہلا دن ہے۔"

ان کا مزید بھی کچھ کہنے کا ارادہ تھا مگر اسی لمحے دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ عالیہ نے دیکھا' کاتب عبدالرشید عجیب آڑے ترچھے انداز میں دروازے پر کھڑا اپنے مخصوص پُراسرار سے انداز میں مسکرایا اور اجازت طلب کئے بغیر اندر آگیا۔ تب عالیہ کو معلوم ہوا کہ وہ ایک گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر خاصا لنگڑا کر چلتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کتابت شدہ صفحات تھے جو اس نے لا کر خاموشی سے محسن صاحب کی میز پر رکھ دیئے۔ مگر وہ بدستور عالیہ کی طرف دیکھ رہا تھا اور مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر گویا جامد ہو کر رہ گئی تھی۔ عالیہ

کو اس سے کچھ خوف سا محسوس ہو۔

"ٹھیک ہے' تم جا کر بیٹھو۔" محسن صاحب نے اسے ہدایت کی۔ "میں ابھی کوئی دوسرا مسودہ دیکھ کر تمہیں بھجواتا ہوں۔"

وہ اسی طرح عالیہ کی طرف دیکھتا اور مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا۔ محسن صاحب گویا عالیہ کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اسے تسلی دینے کی غرض سے بولے۔ "اس کے انداز سے آپ پریشان مت ہوئیے گا۔ ذہنی طور پر بے چارہ تھوڑا سا کھسکا ہوا ہے لیکن بالکل بے ضرر اور معصوم ہے۔ ویسے تو بقول شاعر' کہتے ہیں جس کو عشق' خلل ہے دماغ کا مگر اس کے دماغ میں عشق پہلے گھسا اور خلل بعد میں آیا۔ جوانی میں کسی حسینہ کے عشق میں مبتلا ہو کر اور ناکام ہو کر اس حال کو پہنچ گیا ہے۔"

"اوہ.........!" عالیہ نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ اطمینان اسے یہ جان کر ہوا تھا کہ وہ بے ضرر اور معصوم انسان تھا ورنہ اس کی مسکراہٹ نے تو عالیہ کو ڈرا ہی دیا تھا۔

یہ بھی عجیب ہی اتفاق تھا کہ کاتب اور کتابت کا ذکر چل رہا تھا تو وہ آن موجود ہوا تھا۔

محسن صاحب گویا اصل کام کی طرف آتے ہوئے بولے۔ "اب آپ ایسا کیجئے کہ ایک تو اس مہینے کی ڈاک پڑھ لیجئے۔ آپ کو قارئین بچوں کے مزاج کا اندازہ ہو جائے گا۔ کچھ خطوط چھاپنے کے لئے منتخب کر کے ایڈیٹ بھی کر لیجئے گا۔ بچے بہت لمبے لمبے خط لکھتے ہیں۔ انہیں بالکل مختصر کر لیجئے گا۔ اب تک جو مواد کتابت ہو چکا ہے اس کی پروف ریڈنگ کر لیں اور ہو سکے تو ایک آدھ کہانی خود بھی لکھنے کی کوشش کریں' لیکن اس کے لئے پہلے چند پچھلے شماروں پر ایک نظر اور ڈال لیجئے گا۔ مجھے اندازہ ہے کہ بچپن کے بعد آپ نے اس رسالے کو نہیں پڑھا ہو گا۔ اب ذرا دوبارہ اس سے ذہنی رابطہ استوار کیجئے۔"

وہ کاغذات کے انباروں اور فائلوں وغیرہ میں ہاتھ مار کر ڈاک تلاش کرنے لگے۔ وہ ایک چیز اٹھاتے تھے تو دوسری گر جاتی تھی۔ دوسری پکڑتے تھے تو تیسری ہاتھ سے چھوٹ جاتی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں ہلکا سا رعشہ بھی تھا۔ عالیہ کو یہ بھی کچھ ستم ظریفی سی لگ رہی تھی کہ بچوں کے رسالے کا ایڈیٹر اتنا عمر رسیدہ ہے لیکن پھر اسے یاد آیا' بعض لوگ

کہتے ہیں کہ بڑھاپے میں بھی انسان بچوں جیسا ہی ہو جاتا ہے۔ شاید اس لئے اس عمر میں وہ بچوں کے مزاج کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

بڑی مشکل سے وہ مطلوبہ چیزیں جمع کر کے عالیہ کو دینے میں کامیاب ہو سکے۔ اس کام میں خود عالیہ کو بھی ان کی کچھ مدد کرنا پڑی اور وہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ اگر سب چیزیں سلیقے، قرینے اور ترتیب سے رکھی ہوتیں تو کام کتنا آسان ہو جاتا اور کتنے کم وقت میں چیزیں تلاش کی جا سکتی تھیں۔ بلکہ تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ ہر چیز کے بارے میں معلوم ہوتا کہ وہ فلاں جگہ رکھی ہے۔

ڈاک، کتابت شدہ میٹر اور مسودے وغیرہ لے کر وہ اپنے کیبن میں آگئی۔ کیبن میں آتے جاتے وقت اسے دائیں بائیں کاتب عبدالرشید اور سرکولیشن مینیجر ناز صاحب بیٹھے دکھائی دیتے۔ اس اثنا میں اس کا ان سے بھی تعارف ہو چکا تھا۔ اس کا کیبن اس کے خوابوں سے بہت مختلف تھا۔ اس میں کوئی شان دار میز اور ریوالونگ چیئر نہیں تھی۔ نہایت معمولی اور پرانی سی ایک میز تھی۔ نہایت غیر آرام دہ سی ایک کرسی تھی۔ ایئر کنڈیشنر کے بجائے ایک طرف دیوار پر لگا ہوا بریکٹ فین تھا۔

شاید اس کی آمد کے پیشِ نظر خاص طور پر اس کیبن.......... کی صفائی کی گئی تھی۔ اس میں کوئی کاٹھ کباڑ نظر نہیں آرہا تھا لیکن کونے کھدروں میں اب بھی عالیہ کو تھوڑی بہت گرد جمی نظر آگئی۔ وہاں کے ماحول میں ایک عجیب بوسیدگی، سیلن اور بو رچی ہوئی تھی۔ اس کی میز پر فون تو کیا، انٹرکام بھی نہیں تھا۔ محسن صاحب اپنے کیبن سے اسے آواز دے کر یا پھر بیچ والا دھندلا شیشہ کھٹکھٹا کر بلا سکتے تھے۔ اس کے عقب میں کھڑکی کھلی تھی جس سے نیچے سڑک کا بے پناہ شور چوتھی منزل پر بھی سنائی دے رہا تھا۔ اس نے کھڑکی بند کی تو گرمی لگنے لگی۔ بریکٹ فین آن کیا تو کاغذ اُڑنے لگے۔

بڑی مشکل سے وہ اپنے آپ کو اس نئے ماحول کے ساتھ اس حد تک ایڈجسٹ کر سکی کہ کام شروع کر سکے۔ اس نے رسالے کے چند شماروں پر نظر ڈالی، اس کے مزاج کو سمجھا، ڈاک دیکھی اور حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس زوال کے دور میں بھی رسالے کو اچھی خاصی ڈاک آتی تھی۔ اس نے کچھ خطوط منتخب کر کے ان کی کاٹ چھانٹ بھی کی

کچھ کتابت شدہ کہانیوں کی پروف ریڈنگ بھی کر ڈالی۔ غلطیاں تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے ان کہانیوں کے مسودوں پر نوٹ بھی لکھ دیئے کہ اس مضمون یا کہانی میں یہ خامی ہے، اگر اسے یوں لکھ لیا جاتا تو بہتر ہوتا۔

یہ سب کچھ کرنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو شاباش دی اور اس کے اپنے حساب سے، خاصے مایوس کن ماحول میں یہ اچھی کارکردگی تھی۔ پانچ بجنے کو تھے۔ اسے کچھ تھکن بھی محسوس ہونے لگی تھی لیکن آج چونکہ اس نے اپنا من پسند کام کیا تھا، اس لیے وہ تھکن کو خاطر میں نہیں لا رہی تھی لیکن بہرحال اس کے خیال میں اب جانے کا وقت ہو گیا تھا۔

اس نے قدرے فخریہ انداز میں وہ تمام پلندے لے جا کر محسن صاحب کی میز پر موجود انباروں پر رکھ دیئے۔ اس کے خیال میں وہ اپنی پہلے دن کی کارکردگی پر مبارک باد کی مستحق تھی لیکن محسن صاحب نے اس کے پلندوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ اب بھی کلپ بورڈ سامنے رکھے، کاغذ پر کیڑے مکوڑے بنانے میں مصروف تھے۔ عالیہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ کون سا ایسا طولانی قسم کا مقالۂ خصوصی قلم بند کر رہے تھے جو ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ تو بچوں کے رسالے کے چیف ایڈیٹر تھے اور اس میں اکثر چیزیں مختصر ہی ہوتی تھیں۔

وہ جانے کے لئے مڑی تو محسن صاحب چونکے۔ انہیں گویا کچھ یاد آیا۔ جلدی سے بولے۔ "ارے، کچھ اور ڈاک .... اور کچھ میٹر بھی نکل آیا ہے ذرا اسے بھی دیکھ لو۔"

"یا خدایا..........!" عالیہ نے دل ہی دل میں سوچا۔ "کیا مہینے بھر کا کام آج ہی کرالیں گے؟ ایسا لگتا ہے گویا تازہ شمارہ آج ہی مجھ سے تیار کرا کے صبح چھپوا ڈالیں گے۔"

تاہم وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ اس نے وہ پلندا بھی تھام لیا جو محسن صاحب اس کی طرف بڑھا رہے تھے۔ پلندا لے کر وہ دوبارہ اپنے کیبن میں آبیٹھی۔ اپنی دانست میں تو وہ چھٹی کر کے جانے لگی تھی لیکن لگتا تھا کہ محسن صاحب تو گھڑی کی طرف دیکھنے کے عادی ہی نہیں تھے۔

وہ نیا پلندا سامنے رکھے دیر تک کنپٹیاں مسلتی رہی۔ ابھی اس نے گویا کام کی دوسری شفٹ شروع ہی کی تھی کہ پارٹیشن والے شیشے پر دستک سی ہوئی اور محسن صاحب کی کھر کھراتی آواز سنائی دی۔ "مس عالیہ! ذرا میرے کمرے میں آیئے۔"

عالیہ کو ان کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ محسوس ہوئی۔ وہ کیبن سے نکلی تو رشید کاتب نے تو حسبِ معمول پُراسرار سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا ہی مگر اس بار سرکولیشن مینیجر نیاز صاحب بھی عجیب سے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

وہ یک دم کچھ پریشان سی ہو گئی۔

عالیہ کا دل بُری طرح سے دھڑک رہا تھا۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر محسن صاحب کا اس طرح بلانا کیا مطلب رکھتا ہے۔ "کیا مجھ سے کہیں غلطی سرزد ہو گئی ہے؟" اس نے سوچا۔

جب وہ محسن صاحب کے کمرے میں پہنچی تو وہ سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے عقب سے عالیہ کو گھورتے رہے۔ ان کے برف جیسے سفید بال حسبِ معمول بکھرے ہوئے تھے۔ وہ مسودے بھی ان کے سامنے میز پر بکھرے ہوئے تھے جن پر عالیہ نے اپنی دانست میں تصحیح کی تھی۔ محسن صاحب نے اسے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔

"یہ کیا کیا ہے آپ نے؟" محسن صاحب نے میز پر رکھے مسودوں پر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔

"جج.......... جی! کیا کیا ہے میں نے۔"

"آپ نے اے گریڈ ماس کمیونی کیشنز میں ایم اے کیا ہے اور آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کتابت ہونے کے بعد مسودوں پر تصحیح نہیں کی جاتی۔" وہ ایک دم ہی عالیہ پر برس پڑے۔

"میں نے تو یہ.......... ایک طرح سے تجاویز پیش کی تھیں کہ اگر ان مضامین اور کہانیوں میں یہ تبدیلیاں کر لی جائیں تو ان کا معیار بہتر ہو جائے گا۔" عالیہ نے پھنسی پھنسی

سی آواز میں کہا۔

"میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔" محسن صاحب نے اپنے بالوں کو تقریباً نوچتے ہوئے کہا۔ "میری عمر گزر گئی اسی دشت کی سیاحی میں' گھاس نہیں کھودی میں نے اب تک۔ صحافت میں آپ کی پہلی ملازمت کا یہ پہلا دن ہے اور آپ مجھے سکھا رہی ہیں کہ کہانیوں اور مضامین کا معیار کیسے بہتر بنایا جا سکتا ہے؟ اب مجھے آپ کی شاگردی کرنی پڑے گی۔ مجھے آپ سے سیکھنا پڑے گا کہ بہتر معیار.........."

"نن.......... نہیں سر! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔" عالیہ نروس ہو گئی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اپنی صفائی پیش کرے۔ مضامین اور کہانیوں کی تصحیح کرتے وقت واقعی اس کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اسے محسن صاحب اپنی توہین سمجھیں گے۔

اسے مناسب یہی محسوس ہوا کہ بات کو طول دینے کے بجائے وہ معافی مانگ لے۔ وہ قدرے مرتعش سے لہجے میں بولی۔ "میں معذرت چاہتی ہوں سر! میں ابھی نئی ہوں نا.......... تھیوری اور پریکٹیکل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

اس کے الفاظ اور لہجے سے محسن صاحب کی برہمی کچھ کم ہوئی تاہم وہ اپنا لہجہ بدستور سخت رکھتے ہوئے بولے۔ "آپ کی یہ تصحیح وغیرہ بالکل بے مقصد ہے۔ اب اس مواد کو دوبارہ کتابت تو نہیں کرایا جا سکتا۔ کتابت پر پیسے خرچ ہوتے ہیں اور ہمیں اخراجات میں کسی طرح کمی لانی ہے۔ رسالہ تو ویسے ہی نقصان میں جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں ہماری پوری کوشش ہے کہ رسالہ مارکیٹ میں تو وقت پر پہنچ جانا چاہیے۔"

"سوری سر! آئندہ ایسی شکایت پیدا نہیں ہو گی۔" عالیہ نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔

"یہ تو شکر ہے کہ پاشا صاحب کو کوئی مالی پریشانی نہیں ہے۔ ان کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار اچھا جا رہا ہے اور یہ رسالہ ان کے لڑکپن کا شوق اور عملی زندگی میں داخل ہونے کا پہلا زینہ ہے۔ جس کا انہیں بھی شدت سے احساس ہے۔ اس لیے وہ مسلسل نقصان کے باوجود اس رسالے کو ابھی تک جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ورنہ یہ جانے

کب کا بند ہو چکا ہوتا۔"

کپکپاتی انگلیوں سے انہوں نے دوسرا سگریٹ سلگایا اور اتنی ڈانٹ پھٹکار کو ناکافی سمجھتے ہوئے ایک گہرا کش لے کر مزید کہا۔ "آپ کو......... مسودوں کی تصحیح کے لئے فی الحال کسی نے کہا بھی نہیں ہے۔ آپ کا کام صرف کالموں کی ڈاک الگ کرنا اور پروف ریڈنگ کرنا ہے۔ باقی کام آپ ہم پر چھوڑ دیجئے۔ آخر کار ہم برسوں سے سب کچھ اکیلے ہی کرتے آ رہے ہیں۔ یہ تو پاشا صاحب کو اسسٹنٹ رکھنے کا نہ جانے کیا خیال چرایا ہے۔ کام تو جیسے تیسے چل ہی رہا تھا۔" یہ کہہ کر انہوں نے اگالدان میں پیک تھوکی اور ایک مسودے پر جھک گئے۔ یہ گویا خاموشی کی زبان میں اشارہ تھا کہ اب وہ جا سکتی ہے۔ عالیہ اپنے کیبن میں واپس آ گئی۔

اس کے خوابوں کے شیش محل تو اس شکستہ کیبن میں بیٹھتے ہی ٹوٹ چکے تھے۔ اب ان کی کرچیاں اسے لہولہان کرنے لگیں۔ بہت دیر تک وہ کیبن میں گم صم بیٹھی رہی اور سامنے رکھی کتابت اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار دھندلاتی رہی۔

اس کے حالات کی ناسازگاری اور زندگی کی مشقتوں نے اس کی بہت سی توانائی نچوڑ لی تھی اور اس کے ذہن کو بڑی حد تک شل کر دیا تھا۔ اس کے باوجود جب وہ یونیورسٹی سے نکلی تو اس کے ذہن میں بپھرے ہوئے خیالات کا ایک آتش فشاں مچل رہا تھا۔ آئیڈیاز کا ایک سمندر بہہ نکلنے کے لئے راستہ تلاش کر رہا تھا۔ وہ بہت عرصے سے اخبارات و رسائل پڑھتی آ رہی تھی۔ جتنے خریدنے کی توفیق ہوتی خرید لیتی تھی' باقی لائبریریوں سے یا اِدھر اُدھر سے حاصل کر کے پڑھتی تھی اور بہت سی چیزوں کے بارے میں بارہا اس کے ذہن میں آتا تھا کہ انہیں اگر یوں کیا جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔

وہ سوچا کرتی تھی کہ زندگی جب اسے مہلت دے گی' تقدیر جب اسے موقع فراہم کرے گی اور وہ عملی زندگی میں قدم رکھ کر اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرے گی تو لوگ دنگ رہ جائیں گے۔ وہ سوچتی تھی کہ اس کے ذہن میں جو آئیڈیاز کلبلا رہے ہیں ان کے اظہار کا اسے بس ایک موقع ملنا چاہیے پھر اس کے آگے جانے کی......... بہت آگے جانے کی راہیں خود بخود ہموار ہوتی چلی جائیں گی لیکن خوابوں اور تصورات کی دنیا سے نکل کر جب

اس نے حقیقی دنیا میں قدم رکھا اور عملی زندگی میں اس نے آنکھیں کھولیں تو اسے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

آخر کسی طرح اس نے دل پر پتھر رکھ کر خود کو ایک گارمنٹ فیکٹری میں محض ایک چیکر کے طور پر کام کرنے پر آمادہ کیا تھا پھر اپنا استعفا دیتے وقت کتنے فخر سے مس ماہم سے اس نے کہا تھا کہ اس نے مجبوراً یہاں کام تو کر لیا تھا لیکن یہ اس کی منزل نہیں تھی۔

"منزل!" اس نے بڑے کرب سے سوچا۔

اس نے خوابوں کے شیش محل اور تصورات کی دنیا تک جانے والی راہ پر قدم رکھا ہی تھا کہ پہلے قدم پر اسے زبردست ٹھوکر......... لگی تھی۔ اسے جھاڑ پھٹکار کر ایک طرف بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ شکستہ دل اور نم آنکھیں لیے سوچ رہی تھی کہ کیا اس نے زندگی کا ایک طویل عرصہ' اپنی عمر کے سنہرے برس اس لیے کتابوں' پریکٹیکلز اور دیگر چیزوں میں صرف کیے تھے کہ ایک غیر معروف رسالے کے دفتر میں ایک چھوٹے سے کیبن میں بیٹھ کر پروف ریڈنگ کرتی رہے؟

بالآخر وہ کافی دیر بعد اپنے آپ کو سمجھانے میں کامیاب ہو گئی کہ درس گاہ میں دیکھے گئے خوابوں اور عملی زندگی میں بڑا فرق ہوتا ہے اور یہ تو اس کا ابتدائی دور ہے' اگر وہ ابھی سے دل شکستہ ہو گئی اور ناامید ہو کر بیٹھ گئی تو شاید اسے زیادہ برے حالات کا سامنا کرنا پڑے۔ اس نے دل مضبوط کیا اور افسردگی کو ذہن سے جھٹک کر ایک بار پھر کام میں جت گئی۔

اس دفتر سے اس نے صرف ایک ہی تنخواہ وصول کی جو اسے پانچ دن کی تاخیر سے ملی۔ دوسرا مہینہ وہاں گزارنے کی اسے ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کیونکہ اسی دوران اسے ایک اور ملازمت مل گئی جو رسالے والی ملازمت سے کچھ نہ کچھ بہتر تھی۔ دفتر بہت بہتر تھا۔ تنخواہ بھی کچھ زیادہ تھی اور انٹرویو کے دوران ہی اس نے محسوس کر لیا تھا کہ یہاں ڈانٹنے ڈپٹنے والا کوئی نہیں ہو گا۔ حتیٰ کہ اس کا باس بھی رعب وغیرہ جھاڑنے کا زیادہ شوقین معلوم نہیں ہوتا تھا۔

یہ بجلی کی مصنوعات بنانے والی ایک فرم تھی جس کا ایک غیر ملکی فرم کے ساتھ

اشتراک تھا۔ اس کے دفاتر شان دار اور ملازموں کے لیے حالات بھی بہت اچھے تھے۔ عالیہ کو یہاں اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز مینیجر کے طور پر ملازمت ملی تھی۔ اسامی کا نام خاصا لمبا چوڑا تھا لیکن تنخواہ اتنی زیادہ نہیں تھی کیونکہ اسسٹنٹ کی یہاں بھی کوئی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ تاہم عالیہ نے اسے غنیمت سمجھا اور یہاں پہنچ کر اس نے قدرے سکون کی سانس لی تھی۔

کمپنی وقتاً فوقتاً اپنی سرگرمیوں کے بارے میں اخبارات کے لیے پریس ریلیز جاری کرتی تھی۔ عالیہ کو ان کی نوک پلک درست کر کے ان کی کاپیاں تیار کرنی ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی اخبارات کے خصوصی ضمیمے چھپتے تھے تو ان میں کمپنی کے اشتہارات کے علاوہ اس کے بارے میں مضامین بھی چھپتے تھے۔ یہ سب عالیہ کے ہاتھ سے گزر کر جاتے تھے اور کمپنی کے بارے میں چھپنے والی ہر چیز اور ہر اشتہار کا ریکارڈ رکھنا بھی عالیہ کی ذمے داری تھی۔

پی آر ایم' یعنی پبلک ریلیشنز مینیجر اس کا باس تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا' ادھیڑ عمر آدمی تھا اور دفتر کے کاموں کے علاوہ بھی جانے کہاں کہاں مصروف رہتا تھا۔ اس نے کبھی عالیہ کے سر پر مسلط ہونے' اسے غیر ضروری ہدایات دینے یا بار بار اپنے دفتر میں بلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ عالیہ کا اس سے زیادہ رابطہ انٹر کام پر ہی رہتا تھا۔

کافی عرصہ وہ اس نئی جگہ پر خوش رہی لیکن پھر رفتہ رفتہ جیسے اس کا دل بھرنے لگا۔ اس نے اپنی بددلی کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ بڑے ٹھنڈے دماغ کی لڑکی تھی۔ جب بھی اس کے محسوسات میں کوئی تبدیلی آتی تھی وہ اس کا تجزیہ کرنے اور اس کی وجوہات سمجھنے کی کوشش کرتی تھی۔ دل سے زیادہ دماغ کے مشوروں پر عمل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ اس لیے بددل ہو رہی تھی کہ یہاں بھی اسے اپنی ذات اور اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع میسر نہیں تھے۔ وہ کمپنی کے سینکڑوں ملازموں میں سے بس ایک ملازم تھی۔ اس کی کوئی خصوصی اہمیت نہیں تھی۔ کوئی نمایاں حیثیت نہیں تھی۔ اس کی اپنی صلاحیتوں کے استعمال کا یہاں بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ بلکہ بے کار کے

کاموں کا بوجھ اس پر خواہ مخواہ بڑھ گیا تھا۔

ابتدا میں اس کے پاس لکھے لکھائے پریس ریلیز آتے تھے کہ وہ صرف جائزہ لے کہ ان میں کوئی غلطی تو نہیں رہ گئی۔ پھر جب اس کے باس نے دیکھا کہ وہ ان کی نوک پلک بہت عمدگی سے درست کر لیتی ہے تو پھر اس کے پاس صرف پوائنٹس ہی لکھے ہوئے آنے لگے کہ ان کی مدد سے پریس ریلیز یا مضمون وہ خود ہی تیار کر لے۔ پھر رفتہ رفتہ اشتہاروں کے لئے آئیڈیاز بھی وہی دینے لگی۔

ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ عملی طور پر پبلک ریلیشنز مینیجر کا سارے کا سارا کام عالیہ ہی کرنے لگی' لیکن نام اور دستخط انہی کے چلتے تھے اور مصروف بھی وہ بے پناہ نظر آتے تھے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ عالیہ کے خیال میں اب وہ کمپنی کا کوئی بھی کام نہیں کرتے تھے۔ ساری ذمہ داری عالیہ کے سر پڑ چکی تھی۔

لیکن وہ جلد ہی ان سے کوئی شکوہ اس لیے نہ کر سکی کہ وہ ایک طرح سے ان کی شکر گزار بھی تھی۔ انہوں نے عالیہ کی طرف سے بے نیاز رہ کر اور اس پر کام کا بوجھ زیادہ سے زیادہ بڑھا کر اپنی ذمہ داریاں تو کم کی تھیں لیکن اس سے عالیہ کو بھی بہت فائدہ پہنچا تھا اس میں سوجھ بُوجھ اور خود اعتمادی پیدا ہوئی تھی۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ کیا کچھ کر سکتی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ احساس اہم تھا کہ وہ شاید اس سے آگے بھی بہت کچھ کر سکتی ہے۔

اسی شرا شری میں وہ خاصے عرصے تک کولہو کے بیل کی طرح کام میں جتی رہی۔ لیکن بالآخر ایک روز اس کا صبرو ضبط جواب دے گیا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ "پراپر چینل" کیا ہوتا ہے۔ اسے کس طرح بات کرنا چاہیے' کیا حکمت عملی اختیار کرنا چاہیے۔ وہ بس سیدھی پی آر ایم صاحب کے کمرے میں جا پہنچی۔ وہ اس وقت کمرے میں تنہا ہی تھے۔

"سر! میں صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ مجھے میرا حق کب ملے گا؟" عالیہ نے بلا تمہید کہا۔

"حق! کیسا حق؟"

"میں تو اب تک اس لیے خاموش تھی کہ شاید آپ کو خود ہی خیال آجائے گا۔" عالیہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کس بات کا خیال؟" بیگ صاحب نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ "کھل کر بات کیجئے مس عالیہ! میں سمجھا نہیں آپ کی بات' خدانخواستہ یہاں آپ کی حق تلفی ہو رہی ہے؟"

"سر' آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کے حصے کا سارا کام میں کرتی ہوں لیکن مجھے تنخواہ وہی ملتی ہے جو شروع سے مل رہی تھی۔" عالیہ بولی۔ "میرے خیال میں یہ کوئی انصاف کی بات نہیں ہے۔ سر' میں کوئی شوقیہ ملازمت نہیں کرتی۔ میں ضرورت مند ہوں اور اسی لیے خوشی سے ہر بڑھتی ہوئی ذمے داری قبول کرتی جا رہی تھی کہ اس سے مجھے کوئی فائدہ پہنچے گا۔ میرا عہدہ خواہ یہی رہے لیکن میری تنخواہ میں تو اضافہ ہونا چاہئے سر! یہ میرا حق بنتا ہے۔"

"اگر اضافہ نہ ہوا تو.........؟" بیگ صاحب کے لہجے میں خشکی آگئی۔

"تو پھر میں یہاں کام نہیں کروں گی......... یہ نوکری چھوڑ دوں گی سر!" عالیہ نے حتمی لہجے میں کہا۔

بیگ صاحب ایک لمحے چپ رہے اور عالیہ نظر جھکائے کھڑی رہی۔ اس نے یہ ساری باتیں گویا اپنی تمام تر ہمت اور جرأت مجتمع کر کے کہی تھیں۔ ورنہ اس کو اتنی باتیں کرنا کہاں آتی تھیں۔ اب اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

"ٹھیک ہے' میں ڈائریکٹر صاحب سے بات کروں گا۔" بالآخر بیگ صاحب بولے۔ "ایک ہفتے بعد معلوم کرنا......... اور ہاں اس ایک ہفتے کے دوران میں تم اپنی انگریزی اور بہتر بنانے کی کوشش کرو۔ اس سے تمہیں ہماری کمپنی میں ترقی کرنے میں مدد ملے گی۔"

"بہت بہتر سر!" عالیہ نے طمانیت سے کہا۔ اسے خوشی تھی کہ اسے کھڑے پیروں نوکری سے نکال نہیں دیا گیا تھا۔ کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا کہ اگر اس کی تنخواہ میں اضافہ نہ ہوا تو وہ نوکری چھوڑ دے گی لیکن اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ نوکری چھوڑ کر

وہ جائے گی کہاں؟ آج کل تو اخبارات میں اس کی نظر سے ایسی ملازمتوں کے اشتہار بھی نہیں گزر رہے تھے جو اسے اپنے لئے موزوں محسوس ہوتیں۔

اس نے بیگ صاحب کی ہدایت پر سعادت مندی سے عمل کیا اور انگریزی کے سلسلے میں سخت محنت شروع کر دی۔ لکھنے کی حد تک تو انگریزی میں وہ ٹھیک ہی تھی اور اس کا زیادہ تر کام لکھنے ہی کا ہوتا تھا لیکن اس نے بولنے کے سلسلے میں بھی محنت شروع کر دی کیونکہ اسے مختلف کاموں کے سلسلے میں انگریزی اخباروں کے دفاتر میں جانا پڑتا تھا اور وہاں زیادہ تر لوگ انگریزی ہی میں گفتگو کرتے تھے۔ ان کی اپنی کمپنی میں ایگزیکٹو بھی گویا انگریزی کے بغیر دو قدم نہیں چلتے تھے۔ اس کے علاوہ دفتر میں کئی غیر ملکی بھی کام کرتے تھے۔ اس نے انگریزی روانی سے بولنے کے لیے سخت محنت شروع کر دی۔

عالیہ کی عادت تھی کہ اس پر کسی کام کی دھن سوار ہوتی تھی تو وہ اسے کر کے ہی دم لیتی تھی۔ انگریزی بہتر بنانے کے لیے بھی اس نے کسی کنورسیشن کلاس میں داخلہ نہیں لیا' کتابوں کے انبار نہیں خریدے۔ بس اپنے طور پر ہی محنت کرتی رہی۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بولنے کی مشق کرتی رہی اور سب سے زیادہ محنت اس نے اس بات پر کی کہ اپنے اندر چھپے ہوئے احساسِ کمتری اور جھجک سے کسی طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے۔

وہ اپنی ان کوششوں میں کافی عرصے بعد جا کر کامیاب ہوئی تاہم اس کی تنخواہ میں اضافہ اس سے پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن وہ اس اضافے پر خوش نہیں تھی۔ اضافہ بے حد معمولی تھا۔ بیگ صاحب نے حسبِ وعدہ ایک ہفتے بعد اسے اپنے کمرے میں بلوا کر تنخواہ میں اضافے کی خوش خبری سنائی تھی اور عالیہ کے دل کو اس وقت ٹھیس لگی جب بیگ صاحب نے یہ جتایا کہ یہ اضافہ ان کی سفارش پر ہوا ہے۔ انہوں نے یہ تاثر دیا تھا کہ اس کی تنخواہ میں اضافے کے لیے انہیں ڈائریکٹر صاحب سے بڑی بحث کرنی پڑی تھی۔ بیگ صاحب نے یقیناً ڈائریکٹر صاحب کو یہ نہیں بتایا ہو گا کہ ان کے حصے کا کام بھی عالیہ ہی کرتی ہے۔

اس نے بیگ صاحب سے اس سلسلے میں مزید بحث و تکرار نہیں کی لیکن اس کا دل اس جگہ سے اکھڑ گیا۔ اب وہ وہاں خوش نہیں تھی کیونکہ اسے اتنا نہیں مل رہا تھا جتنی وہ

محنت کر رہی تھی اور جتنا وہ اپنا حق سمجھتی تھی۔ تاہم اس نے ملازمت جاری رکھی کیونکہ یہ اس کی مجبوری تھی۔ البتہ اب اس نے بہتر ملازمت کی تلاش میں نظر دوڑاتے رہنا اپنا معمول بنا لیا تھا۔

ایک روز ایک انگریزی اخبار میں ایک اشتہار اس کی نظر سے گزرا اور وہ اچھل پڑی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اشتہار خاص طور پر اسی کے لئے چھپا ہے۔

ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو اکاؤنٹ ایگزیکٹو کی ضرورت تھی۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں میں جنہیں اکاؤنٹ ایگزیکٹو کہا جاتا ہے ان کا درحقیقت اکاؤنٹس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ ایجنسی کے کلائنٹس سے معاملات طے کرتے ہیں لیکن پھر بھی اسے ان ایگزیکٹوز کے کام کا پورے طور پر اور صحیح طور پر اندازہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود اسے نہ جانے کیوں یقین سا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس پوسٹ پر کام کر لے گی۔

اشتہار میں کہا گیا تھا کہ صحافت میں ایم اے خاتون کو ترجیح دی جائے گی اور مطلوبہ معیار پر پوری اترنے والی خاتون کو قابلِ رشک تنخواہ دی جائے گی اور یہ "قابل رشک" کے الفاظ عالیہ کے ذہن سے چپک کر رہ گئے تھے۔

اگلے ہی روز وہ ایجنسی کے دفتر جا پہنچی۔ دفتر ڈیفنس کے ایک عالی شان بنگلے میں تھا اور ڈیفنس کا علاقہ عالیہ نے اچھی طرح دیکھا ہوا نہیں تھا۔ رکشے میں کافی دیر اِدھر اُدھر بھٹکنے بھٹکانے کے بعد وہ اس بنگلے تک پہنچی۔ اس وقت تک اس کے حواس خراب ہو چکے تھے۔

بمشکل اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے وہ بنگلے کی چار دیواری میں داخل ہوئی۔ چاروں طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ جیسے وہاں کوئی ذی روح موجود ہی نہ ہو لیکن ڈرائیو وے میں تین شان دار کاریں اور چند اسکوٹر کھڑے تھے۔

بڑا دروازہ کھول کر وہ اندر پہنچی تو سامنے ہی استقبالیہ کاؤنٹر تھا لیکن اس وقت وہ خوب صورت کاؤنٹر خالی پڑا تھا۔ لاؤنج میں بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بائیں طرف کے بند دروازے کی طرف بڑھی اور

دروازہ کھولا۔ ایک معطر سا جھونکا عالیہ کی ناک میں گدگدی سی کرتا ہوا گزر گیا۔ اس کمرے کی ہوا میں بھی مہک تھی۔

کمرے کے وسط میں صرف ایک بڑی خوب صورت اور نفیس میز تھی جس پر کسی بھی قسم کے دفتری لوازمات موجود نہیں تھے۔ صرف ایک ٹیلی فون سیٹ رکھا ہوا تھا۔ میز کے عقب میں نہایت شان دار ریوالونگ چیئر نظر آ رہی تھی جو اس وقت ترچھی تھی۔ اس پر ایک نوجوان اس طرح نیم دراز تھا کہ اس نے ٹانگیں میز پر ٹکائی ہوئی تھیں۔

عالیہ کو یہ انداز نہایت بے ہودہ لگا۔ وہ ایک نہایت وجیہہ نوجوان تھا۔ گھنگھریالے بھورے بال قدرے بے ترتیب نظر آ رہے تھے۔ موٹی موٹی خواب ناک سی آنکھیں جیسے دور کہیں کسی غیر مرئی چیز کو دیکھ رہی تھیں اور عالیہ نے محسوس کیا کہ اس کا ذہن بھی اس کمرے سے دور کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔

اس کا رنگ اور نقوش تیکھے تھے۔ اس وقت وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پُرخیال انداز میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہا تھا جیسے کسی اہم مسئلے پر سوچ بچار کر رہا ہو۔ دروازہ کھلنے کی خفیف سی آواز پر وہ چونکا نہیں تھا بلکہ بدستور اپنے خیالات میں غرق رہا۔

عالیہ یہ سوچ کر ڈرتی آئی تھی کہ وہاں امیدوار لڑکیوں کا ایک ہجوم سا لگا ہو گا لیکن یہاں اتنی ویرانی دیکھ کر ایک طرح سے خوشی ہوئی تھی۔ شاید وہ بہت جلدی آ گئی تھی اس کا خیال تھا کہ کبھی کبھی محض جلدی آنے سے بھی کامیابی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

وہ شخص جب عالیہ کی طرف متوجہ ہی نہ ہوا تو اس نے ایک انگلی سے ہولے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تب وہ چونکا اور اس کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری جھلک آئی جیسے اپنی سوچوں کی بھول بھلیوں سے واپس آنا اسے اچھا نہ لگا ہو اور عالیہ کو دیکھ کر اس کے ماتھے پر شکنیں مزید گہری ہو گئیں۔ اس نے رسماً بھی معمولی سی خوش اخلاقی کا مظاہرہ ضروری نہ سمجھا اور نہ ہی ٹانگیں میز سے ہٹائیں۔

اسی طرح بیٹھے بیٹھے اپنی ریوالونگ چیئر کو معمولی سی حرکت دے کر اس نے گونجیلی سی آواز میں پوچھا۔ "جی، فرمایئے؟" اس کی آواز ریڈیو کے کسی مقبول صداکار کی آواز معلوم ہوتی تھی لیکن لہجے میں صداکاروں سے کہیں زیادہ نخوت تھی۔

"وہ.......... میں.......... ملازمت کے سلسلے میں آئی تھی۔ اکاؤنٹ ایگزیکٹو کے سلسلے میں اشتہار دیا تھا نا آپ نے؟" عالیہ کچھ ہکلا کر رہ گئی۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا اور عالیہ کو اس سے نظر ملا کر بات کرنا مشکل محسوس ہو رہا تھا۔

"اکاؤنٹ ایگزیکٹو کی پوسٹ کے لیے ہم نے اشتہار تو یقیناً دیا تھا لیکن اس پوسٹ کے لیے.......... اور آپ..........؟" اس نے استہزائیہ سے لہجے میں کہا اور ایک بار پھر گویا از سر نو عالیہ کا سر تا پا جائزہ لیا پھر وہ بلا تامل یوں ہنس دیا جیسے عالیہ نے اسے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔ اس ہنسی میں سفاکی بھی تھی اور تحقیر بھی۔ عالیہ کو اپنی کانوں کی لویں تپتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

وہ گویا بمشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولا۔ "آپ کو شاید کسی نے یہ نہیں بتایا کہ ایڈورٹائزنگ کے بزنس میں اکاؤنٹ ایگزیکٹو کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے روایتی اور غیر روایتی' رسمی اور غیر رسمی فرائض کیا ہوتے ہیں اور اس کے لیے کس قسم کی شخصیت درکار ہوتی ہے۔ آپ نے بس اشتہار پڑھا اور چلی آئیں۔ خوب' بہت خوب!" وہ ایک بار پھر ہنسا۔

"لگتا ہے۔ میں نے آپ کو کوئی بہت ہی زبردست لطیفہ سنا دیا ہے۔" عالیہ جل کر بولی۔

"ہاں' میرے لیے یہ لطیفے سے کم نہیں۔" وہ ہنسی روکتے ہوئے بولا۔

"چلیے آپ ہی بتا دیجیے کہ آپ کے ہاں اکاؤنٹ ایگزیکٹو کی کیا اہمت ہوتی ہے؟ اور اس کے لیے کس قسم کی شخصیت کی ضرورت ہو گی؟" عالیہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے' میں ایک مصروف آدمی ہوں۔ میرا ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور سنجیدہ ہوتے ہی اس کی شخصیت کچھ بھاری بھرکم اور بارعب سی نظر آنے لگی۔ حالانکہ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔

"جی ہاں' مصروفیت تو آپ کی مجھے نظر آ رہی ہے۔" عالیہ نے خالی میز پر اس کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کی طرف اشارہ کیا۔ "زیادہ مصروفیت کے عالم میں غالباً آپ اسی اسٹائل میں کام کرتے ہیں۔"

"میں کوئی کلرک یا اسٹینو نہیں ہوں جو فائلوں اور کاغذات پر سر جھکائے بیٹھا رہوں۔" وہ قدرے برہمی سے بولا۔ "میری مصروفیت یہاں ہوتی ہے' یہاں نہیں۔" اس نے اپنی کنپٹی پر انگلی ماری۔

عالیہ بے ساختہ کہنے لگی تھی۔ "اچھا..........! تو اس جگہ کچھ موجود ہے؟ میں تو سمجھی تھی کہ آپ کی یہ اوپر کی منزل خالی پڑی ہوئی ہے۔" لیکن عالیہ نے اپنے آپ کو یہ کہنے سے باز رکھا۔ وہ شخص طنز برداشت کرنے کا عادی معلوم نہیں ہوتا تھا اور ایک آدھ چبھتے ہوئے جملے پر ہی برہم نظر آ رہا تھا۔

تاہم عالیہ نے جاتے جاتے اتنا تو کہہ ہی دیا۔ "میں سمجھ گئی ہوں کہ آپ کے ہاں اکاؤنٹ ایگزیکٹو کے لیے کس قسم کی شخصیت درکار ہو گی۔ غالباً اس کی چار ٹانگیں اور لمبے لمبے کان ہونا ضروری ہوں گے۔ شاید سر پر سینگ اضافی خصوصیت سمجھی جاتی ہو گی۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر آ گئی۔ دروازہ اس نے ایک جھٹکے سے بند کیا۔ عین اسی لمحے جب وہ جانے کے لیے پلٹ رہی تھی اس نے دیکھا کہ کرسی پر نیم دراز اس شخص کے تاثرات تیزی سے بدلے تھے اور اس نے ایک جھٹکے سے میز پر رکھی اپنی ٹانگیں سمیٹ لی تھیں۔

گو کہ اس شخص کا نام جاننے کا کوئی فائدہ نہیں تھا لیکن غیر ارادی طور پر عالیہ دروازے پر لگی ہوئی نیم پلیٹ دیکھے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ پیتل کے حروف والی ایک بڑی خوب صورت نام کی تختی تھی۔ اس پر صرف نام ہی لکھا ہوا تھا "ہمایوں سرور" اس کے ساتھ کوئی ڈگری یا کوئی عہدہ وغیرہ نہیں تھا۔ معلوم نہیں وہ کون تھا اور اس ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں اس کی کیا حیثیت تھی۔

"ممکن ہے وہ ایجنسی کا مالک ہی ہو۔" عالیہ نے سوچا لیکن اس نے دیکھا کہ اداروں کے مالکوں کے نام کے ساتھ منیجنگ ڈائریکٹر یا ڈائریکٹر وغیرہ ضرور لکھا ہوتا تھا۔

عالیہ اسے دل ہی دل میں لعنت ملامت کرتی بنگلے سے باہر آ گئی۔ باہر دور دور تک کسی رکشے وغیرہ کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔ یہ مرے پہ سو دُرّے مارنے والی بات تھی۔ دھوپ میں اسے کافی پیدل چلنا پڑا۔ روہانسی تو وہ پہلے ہی ہو رہی تھی' اب تو اس کا باقاعدہ

دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ وہ بمشکل خود کو سنبھالے رکشے کی تلاش میں چلتی رہی۔

بالآخر ایک چوراہے پر اسے رکشا ملا اور وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اس میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ ورنہ اس کا ارادہ تھا کہ انٹرویو سے فارغ ہو کر دفتر چلی جائے گی۔ ہاف ڈے کر کے بھی کچھ نہ کچھ کام تو نمٹ ہی جائے گا۔ مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ انٹرویو کے نام پر اس کے مقدر میں توہین اور ذلت لکھی ہوئی ہے۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ جہاں وہ اپنی دانست میں "انٹرویو" دینے جا رہی ہے وہاں اس کے ساتھ یہ سلوک ہوگا تو وہ کبھی اُدھر کا رخ نہ کرتی۔

"بعض لوگ اتنے سفاک کیوں ہوتے ہیں؟" وہ سوچ رہی تھی۔ "کیا وہ کسی کا دل رکھنے کے لئے بھی ذرا سا نرم رویہ اختیار نہیں کر سکتے؟ ایسے شان دار دفاتر میں بیٹھنے والے بظاہر پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے لوگ کسی لڑکی کے ساتھ ایسا جاہلوں کا سا رویہ رکھیں اور پھر بھی معزز اور باعزت کہلاتے ہیں' بے شک وہ کسی کی عزت نہ کریں۔"

کتنی تضحیک.......... کتنی تحقیر تھی اس کی نظروں میں۔ عالیہ کو بار بار یاد آ رہا تھا اور ہر بار گویا اس کا دل بھر آتا تھا۔ اس کے حلق میں آنسوؤں کی کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ ہمایوں سرور کے الفاظ بھی تو کس قدر کھردرے تھے۔ اگر محسوسات کا کوئی وجود ہوتا تو شاید وہ ان لفظوں سے لہولہان ہو چکی ہوتی۔ عالیہ اپنے وجود میں اندر کہیں خون سا رستا محسوس کر رہی تھی۔ شاید یہ اس دل مجروح کا خون تھا۔

گھر پہنچ کر وہ سیدھی اپنے کمرے میں گھس گئی اور اپنے بیڈ پر گر کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ اسے گھٹن کا سا احساس ہوا تو اٹھ کر گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ وہ کافی دیر تک کھڑکی کے سامنے باہر کا منظر دیکھتی رہی۔

موسم خزاں کی خشک ہواؤں نے ہر شے کی تازگی چھین لی تھی۔ گلی میں پھیلے ہوئے خشک پتے بے ربط جھونکوں کی زد میں تھے۔ یہ پتے سماعت پر گراں گزرنے والا ساز بجاتے ہوئے کبھی دائرے کی صورت میں رقص کرنے لگتے اور کبھی قطار در قطار دور تک دوڑتے چلے جاتے۔ جیسے یک بیک کوئی آفتِ ناگہانی ان کے پیچھے لگ گئی ہو۔ پھر اچانک

گلی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بے کراں سناٹا طاری ہو جاتا' ہر شے ساکت ہو جاتی۔ خشک پتے اور ردی کاغذ گلی کے کونوں کھدروں میں یوں چپ سادھ لیتے گویا سانس روکے یہ دیکھنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ ہوا کس طرف سے حملہ آور ہو گی۔ لمحاتی سکوت کے بعد ہوا کا ایک خشک جھونکا اچانک کسی نامعلوم گوشے سے گلی میں داخل ہوتا اور ہر طرف ایک ہلچل مچ جاتی۔ خشک پتے اور ردی کاغذ شور مچاتے' آہ و فغاں کرتے ہوا کے دوش پر گھسٹتے چلے جاتے۔

عالیہ نے سوچا اس کے اندر اور باہر کا موسم کتنا یکساں ہے۔ وہ آج بہت اداس اور دل گرفتہ تھی۔ وہ دھیرے سے پلٹی اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ آئینے میں یوں اپنا جائزہ لینے لگی جیسے کوئی اجنبی دوسرے اجنبی کا جائزہ لے رہا ہو۔

عالیہ کے سامنے ایک عجیب دقیانوسی قسم کی لڑکی کھڑی تھی۔ جس کی رنگت تو گوری تھی اور آنکھیں غزالی تھیں مگر اس نے اپنے اوپر گویا فرسودگی کا خول چڑھا رکھا تھا۔ سیدھی مانگ اور تیل میں چپڑے سر سے چپکے ہوئے بال' پھیکے پھیکے لب و رخسار' آنکھیں دہشت زدہ سے انداز میں پھیلی ہوئی گویا دنیا کی تیز رفتاری دیکھ کر حیران ہوں۔ گھر پر خود اپنا ہی سیا ہوا معمولی سے کپڑے کا قمیض شلوار جس میں اس کے جسم کے نشیب و فراز نہ جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔ ہاتھ میں دبا ہوا گھسا پٹا سا ایک پرس۔

یہ تھی عالیہ عزیز۔ ایم اے۔

"بے چاری!" عالیہ نے اپنے آپ پر ترس کھایا۔

"اکاؤنٹ ایگزیکٹو کی پوسٹ کے لیے.......... اور آپ.........! بہت خوب.......... آپ نے بس اشتہار پڑھا اور چلی آئیں۔ ہاہاہا۔ آپ کو شاید کسی نے نہیں بتایا کہ اس کے لیے کس قسم کی شخصیت درکار ہوتی ہے۔ میرے لیے یہ بات لطیفے سے کم نہیں۔ ہاہاہا۔" اسے ہمایوں سرور کے الفاظ کسی تیز دھار نشتر کی طرح چبھنے لگے۔ ذہن کے مقبرے میں اس سفاک شخص کے زہریلے اور استہزائیہ جملے خیالات کی بازگشت بن کر گونجنے لگے۔

لیکن دوسرے ہی لمحے ایک بار پھر اس کی رگ و پے میں چنگاریاں سی تیز ہو گئیں۔

"مانا کہ میں ایک غریب نظر آنے والی لڑکی ہوں۔ میرا لباس دلکش اور متاثر کن نہیں۔ میرا چہرہ سپاٹ ہے۔ میری شخصیت بے کیف نظر آتی ہے۔ شاید مجھ میں کوئی بھی پرکشش بات نہیں لیکن' اس کے باوجود کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ میرا مذاق اڑائے۔ میری تحقیر کرے۔ کیا مجھ جیسی لڑکیوں کو دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں؟ کیا انہیں کسی بہتر پوسٹ کی طرف بڑھنے یا ترقی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کی قطعاً اجازت نہیں؟ کیا فیصلہ صرف ہمایوں سرور جیسے لوگوں کے اختیار میں ہے کہ کون سی لڑکی کس جاب کے لیے مناسب ہے اور کس کے لیے نہیں؟"

وہ سوچتی رہی اور سلگتی رہی۔

دوپہر کو اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ شام تک وہ ملول اور افسردہ اپنے کمرے میں پڑی تھی۔ پاپا کے پوچھنے پر اس نے یہی بتایا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

رات کو سوچوں کے جنگل میں بھٹکتے بھٹکتے اچانک اسے ایک دلکش راستہ دکھائی دیا۔ ایک عجیب سا خیال اس کے ذہن میں سر اٹھا رہا تھا۔ پہلے تو یہ بات اسے افسانوی سی لگی لیکن جوں جوں اس نے اس سلسلے میں سوچا اسے سب کچھ بے حد آسان اور قابلِ عمل محسوس ہوا۔ کچھ بھی تو مشکل نہیں تھا۔ وہ سب کچھ جو وہ سوچ رہی تھی۔

☆======☆======☆

دوسری صبح عالیہ ایک نئے عزم کے ساتھ گھر سے نکلی۔ پہلے اس نے ایک قریبی پبلک فون سے اپنے دفتر کال کی۔ دوسری طرف بیگ صاحب تھے۔

"عالیہ! خیریت تو ہے؟ کل تم دفتر نہیں آئیں۔"

"سر! آج بھی نہیں آسکوں گی۔" عالیہ نے کہا۔

"کیوں؟" بیگ صاحب کے لہجے میں ہلکی سی تشویش تھی۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اوہ! اچھا' ٹھیک ہے تم آرام کرو۔" بیگ صاحب نے کہا۔

"تھینک یو سر!"

پھر وہ اس بینک پہنچی جہاں اس کا سیونگ اکاؤنٹ تھا۔ کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے اس نے گزشتہ کئی برس میں خاصی رقم جمع کر رکھی تھی۔

خیال یہی تھا کہ اس قسم کی بچتیں آڑے وقت میں کام آتی ہیں اور لاشعوری طور پر ذہن کے کسی تاریک گوشے میں یہ روشن خیال بھی موجود تھا کہ شاید آڑے وقت کے بجائے زندگی میں کوئی خوشی کا وقت بھی آجائے اور تب یہ رقم بھی کام آجائے۔ مگر اب اسے محسوس ہونے لگا کہ شاید تنہا لڑکیوں کی زندگی میں وہ خوشی کا وقت مشکل سے ہی آتا ہے خصوصاً وہ تنہا لڑکیاں جو خود کسی طرف پیش قدمی کرنا نہیں جانتیں اور کسی پرچھائیں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اپنی ذات میں کچھ اور سکڑ سمٹ جاتی ہیں۔ جب خود اپنی افتادِ طبع یہ ہو' ماں کا انتقال ہو چکا ہو اور باپ دنیا کے تمام معاملات سے لاتعلق ہو کر بے دست و پا پلنگ پر پڑا بس گویا موت کے انتظار میں سانسیں گن رہا ہو تو پھر ایسے میں کسی خاص خوشی کا انتظار فضول سا ہی لگتا ہے۔ یہ رائے اس نے گزشتہ شب ہی قائم کی تھی۔

اپنے اکاؤنٹ سے اس نے چھ ہزار روپے نکلوائے اور طارق روڈ کے بیوٹی پارلر میں جا پہنچی۔ اس بیوٹی پارلر کے سامنے سے وہ روزانہ دفتر جاتے وقت گزرتی تھی لیکن اس نے کبھی اس جگہ کو اپنی نظریں کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور نہ ہی کبھی سوچا تھا کہ وہ خود بھی کبھی اس بیوٹی پارلر میں آئے گی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی زندگی میں اس قسم کے نخرے بازیوں کی کوئی گنجائش نہیں۔

شیشے کا دروازہ کھول کر وہ اندر پہنچی تو ایئرکنڈیشنر کی مدھم سی سرسراہٹ اور خنک ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ پارلر میں اس وقت بے رونقی سی تھی۔ لمبے چوڑے آئینوں میں سے ایک کے سامنے پھولے پھولے گالوں اور رنگے ہوئے بالوں والی ایک موٹی سی بیگم صاحبہ تشریف فرما تھیں اور بیوٹیشن لڑکی سے بحث کر رہی تھیں کہ ان کے بالوں کا اسٹائل وہ نہیں بن سکا جو وہ چاہتی تھیں۔ سامنے کاؤنٹر پر ایک انگریزی رسالہ بھی کھلا رکھا تھا اور وہ بار بار اس کی کسی تصویر کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ ان کا میک اپ کرنے والی سانولی لیکن نہایت اسمارٹ لڑکی بڑے تحمل سے انہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

دوسری دو اسمارٹ بیوٹیشن لڑکیاں خالی کرسیوں کے پاس منتظر سے انداز میں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر عالیہ کا استقبال کیا۔

"آئیے......... تشریف رکھئے۔" لڑکی نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نہایت خوش اخلاقی سے کہا۔

عالیہ ہچکچاتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی۔

لڑکیوں کو سوالیہ انداز میں اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر عالیہ دھیمی آواز میں بولی۔ "میں اپنا حلیہ یکسر تبدیل کرانا چاہتی ہوں۔ اگر آپ ضروری سمجھیں تو میرے بال تراش دیں اور کوئی نہایت ہی خوب صورت ہیئر اسٹائل بنا دیں جو میرے چہرے کے ساتھ سوٹ کرتا ہو۔ میں اپنا میک اپ نہایت اچھا کرانا چاہتی ہوں۔"

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ بھی بتا دیں کہ آپ کس قسم کی تقریب میں شامل ہونے کے لیے........."

بیوٹیشن لڑکی نے خلیق مسکراہٹ سے کہا لیکن عالیہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں کسی تقریب میں نہیں جا رہی ہوں۔ آپ ایسا میک اپ کر دیں جو کسی بہت بڑے دفتر کے ایگزیکٹو کی میٹنگ میں شرکت کرنے کے لئے موزوں ہو......... اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ میں بالکل ایک مختلف لڑکی نظر آنا چاہتی ہوں۔" یہ سب کچھ اس نے رازدارانہ سے لہجے میں کہا تھا حالانکہ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

بیوٹیشن لڑکی کے ہونٹوں پر لمحے بھر کے لیے خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی لیکن فوراً ہی معدوم ہو گئی اور وہ بڑے مؤدبانہ اور خلیق لہجے میں بولی۔ "میں آپ کا مطلب سمجھ گئی۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔"

اور عالیہ گویا اپنا مسئلہ اس کے سپرد کر کے مطمئن ہو گئی۔

اس کے بالوں کو مختلف زاویوں سے تھوڑا تھوڑا تراشا گیا پھر انہیں شیمپو کیا گیا اور ہیئر ڈرائیر سے خشک کیا گیا پھر بہت دیر میں جا کر اس کا ہیئر ڈو مکمل ہوا اور میک اپ شروع ہوا۔

اس کا چہرہ اور اس کے بال اتنے مراحل سے گزرے کہ وہ تھک سی گئی۔ لڑکی نے

معذرت کے ساتھ اس سے درخواست کی تھی کہ اگر وہ اپنی شکل و صورت کی تبدیلیوں سے پوری طرح محظوظ ہونا چاہتی ہے تو میک اپ کے دوران میں آئینہ نہ دیکھے بلکہ میک اپ مکمل ہونے کے بعد دیکھے۔

تمام مراحل مکمل ہونے کے بعد بیوٹیشن لڑکی نے آخری بار تنقیدی نظر سے، ہر زاویے سے اس کا جائزہ لیا اور پھر گویا اس نے وہی اطمینان محسوس کیا جو کوئی مصور اپنا شاہکار مکمل کرنے کے بعد محسوس کرتا ہے۔ پھر اس نے آئینے سے پردہ ہٹایا اور عالیہ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر مبہوت سی ہو گئی۔

چند لمحے وہ دم بخود سی بیٹھی رہی۔ وہ اپنے آپ کو پہچان نہیں پا رہی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"کیا واقعی یہ میں ہوں؟" وہ بار بار دل ہی دل میں اپنے آپ سے پوچھے جا رہی تھی۔

لوگوں کو اپنی شکل و صورت کے بارے میں عام طور پر غلط فہمی یا خوش فہمی ہوتی ہے۔ انہیں اپنے چہرے میں وہ خوبیاں بھی نظر آجاتی ہیں جو درحقیقت موجود ہی نہیں ہوتیں لیکن عالیہ کو تو اپنے بارے میں کبھی "وہم" بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ خوب صورت بھی کہلا سکتی ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ اسے اپنی ذات کے بارے میں غور کرنے کی کبھی مہلت ہی نہیں ملی تھی ورنہ ایسی کوئی نئی چیز تو اس کے چہرے میں شامل نہیں ہوئی تھی، وہی آنکھیں تھیں، وہی ناک، وہی لب و رخسار۔ سب کچھ اس کے پاس پہلے بھی موجود تھا۔ بس اب جیسے یکایک ہی اس کے چہرے پر پڑا ہوا کوئی نقاب اٹھ گیا تھا۔ آج گویا اسے دریافت کیا گیا تھا۔ اب تک اس کی ذات ایک حسین مگر نا دریافت شدہ گوشے کی طرح تھی۔ اس کی صورت پر جیسے دھول کی دبیز تہیں جمی تھیں جو آج ہٹ گئی تھیں۔

جب وہ اس انجانے سے سحر سے نکل آئی تو اس نے تشکر بھری نظروں سے بیوٹیشن لڑکی کی طرف دیکھا اور نہایت دھیمی آواز میں کہا۔ "آپ نے تو میری صورت ہی بدل دی۔"

"صورت بدلنا ہمارے اختیار میں کہاں۔" لڑکی دھیرے سے مسکرائی۔ "میں نے آ صورت کو صرف سنوارا ہے۔ قدرت نے آپ کو اچھا بھلا چہرہ دے رکھا ہے لیکن میں معذرت کے ساتھ کہوں گی کہ آپ نے اسے بگاڑ رکھا تھا۔"

"میں نے نہیں شاید حالات نے بگاڑ رکھا تھا۔" عالیہ نے دل ہی دل میں سوچا۔ "جس کی ذات کے اندر تنہائی' افسردگی اور احساسِ کمتری کا راج ہو وہ باہر سے کیسے خوب صورت نظر آسکتا ہے؟"

بل ادا کر کے وہ بیوٹی پارلر سے نکلی اور ایک قریبی بوتیک میں جا پہنچی۔ اس بوتیک کی مالک بھی ایک خاتون تھیں۔

بہت دیر تک عالیہ چاروں طرف لٹکے ہوئے ملبوسات کے درمیان حیران پریشان سی پھرتی رہی۔ اس نے بارہا عورتوں کو اس قسم کے ملبوسات پہنے دیکھا تھا لیکن کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ان تک اس کی رسائی بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے گویا دل ہی دل میں حتمی طور پر فیصلہ دے رکھا تھا کہ اس قسم کے پہناوے صرف دولت مند عورتوں کی میراث ہیں۔

بڑی مشکل سے اس نے اپنے لیے تین لباس منتخب کیے اور ٹرائی روم میں جا کر انہیں پہن کر دیکھا۔ تیسرا لباس اس نے آج کے لیے منتخب کیا۔ باقی دو لباس اور اپنا پرانا جوڑا اس نے پیک کروا کے وہیں رکھوا دیا کہ دن میں پھر کسی وقت واپسی میں لے جائے گی۔

بوتیک سے نکلنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر قدِ آدم آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہ اب تک قطعی مختلف شخصیت نظر آرہی تھی لیکن ابھی تھوڑی سی کسر باقی تھی۔

ملبوسات کی ادائیگی کر کے وہ بوتیک سے نکلی تو جوتوں کی دکان میں گھس گئی۔ نہایت خوب صورت اور نئے ڈیزائن کی جوتیاں منتخب کر کے اس نے پرانی وہیں چھوڑ دیں اور پھر ایک دکان پر جا کر فینسی قسم کا ایک بیگ خریدا۔ میک اپ درست کرنے کے لئے چند چیزیں خرید کر اس نے اس بیگ میں ڈالیں اور اسے کندھے پر لٹکا لیا۔

دکان سے نکل کر وہ فٹ پاتھ پر آئی تو چند لمحوں کے لیے تو جیسے چلنا ہی بھول گئی۔ اس کی چال بدل سی گئی تھی۔ وہ اپنی چال پر قابو پانے اور قدموں میں توازن رکھنے کی

کوشش کرنے لگی۔ کئی خالی رکشے اور ٹیکسیاں اس کے قریب سے گزر چکی تھیں مگر اس نے کسی کو نہ روکا۔ اس کے خیال میں پہلے اپنی چال کو درست کر لینا اور اپنے آپ کو نئے حلیے اور نئی چیزوں سے مانوس کر لینا بے حد ضروری تھا۔

بظاہر وہ دکانوں کے شوکیس دیکھتی جا رہی تھی لیکن درحقیقت پُروقار انداز میں چلنے کی مشق کر رہی تھی۔

"ارے' عالیہ.........!" ایک متحیر آواز سن کر وہ ٹھٹکی اور پلٹ کر دیکھا۔ ایک دکان سے' بنڈلوں اور لفافوں سے لدی پھندی لڑکی نکل کر اسے حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر دیکھ رہی تھی۔ "تم عالیہ ہو نا؟؟"

عالیہ سنبھل کر مسکرائی اور اس کی طرف بڑھی۔ "اور آپ فرح ہیں' اب غالباً فرح سعید۔"

فرح تین مہینے قبل تک اسی دفتر میں ریسپشنسٹ تھی جس میں وہ اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز کے طور پر ملازم تھی۔ اس نے استعفا دے دیا تھا کیونکہ اس کی شادی ہونے والی تھی۔ کوئی ڈاکٹر سعید صاحب تھے جو جرمنی میں رہائش پذیر تھے۔ فرح نے اسے بتایا کہ محض وقت گزاری کی خاطر وہ یہ ملازمت کرتی ہے۔ اب شادی کے بعد سعید کے ساتھ جرمنی چلی جائے گی۔

"آپ کو تو اس وقت جرمنی میں ہونا چاہیے تھا۔" عالیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں' ہم اسی ہفتے جرمنی چلے جائیں گے۔" فرح نے جواب دیا۔ "کچھ ضروری خریداری کرنے آئی تھی مگر عالیہ یقین کریں آج تو میں آپ کو پہچان ہی نہیں پائی تھی۔ بس شبہ سا ہوا تھا۔ دفتر میں تو آپ بس.........!"

فرح نے ستائشی نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ "کسی تقریب میں جانے کے لیے.........." پھر جیسے وہ کسی خیال سے چونکتے ہوئے بولی۔ "کہیں آپ کی بھی شادی تو نہیں ہو گئی۔"

"ارے نہیں بھئی۔" عالیہ نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "ایک تقریب میں ہی جانا ہے۔"

"اگر کہیں جانے کی جلدی نہ ہو تو آئیے کہیں بیٹھ کر کافی پیتے ہیں۔" فرح نے کہا۔

عالیہ نے لمحہ بھر سوچا اور اس کے ساتھ قریبی کافی ہاؤس میں جا بیٹھی۔ آدھے گھنٹے بعد کافی ہاؤس سے نکلی تو اس نے اپنے آپ کو خاصا پُرسکون اور پُراعتماد محسوس کیا۔ اس کی چال میں وقار آگیا تھا اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ اب وہ اسی انداز میں چل سکتی ہے۔ فرح کے ساتھ آدھے گھنٹے تک ہلکی پھلکی گپ شپ کے ساتھ کافی پینے کے بعد وہ ذہنی طور پر آئندہ پیش آنے والے مرحلے سے گزرنے کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ فرح کا یوں اچانک ملنا بھی غنیمت تھا۔ اس مختصر سی ملاقات نے اس کے ذہنی تناؤ کو کم کر دیا تھا۔ کافی پیتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس وقت اسے اس چیز کی سخت ضرورت تھی۔ فرح سے رخصت ہو کر وہ قریب کھڑے خالی رکشے میں بیٹھ گئی اور اسے ڈیفنس چلنے کی ہدایت کی۔

کچھ دیر بعد وہ ایک بار پھر اسی ایڈورٹائزنگ کمپنی کے دفتر میں داخل ہو رہی تھی جہاں سے کل وہ اپنی انا کے وجود پر ایک گہرا زخم لے کر گئی تھی۔ برآمدے کے فرش پر اس کے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ بڑے ردھم کے ساتھ ابھر رہی تھی۔

دروازہ کھول کر وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو اس کی گردن بڑی نخوت اور تمکنت سے اٹھی ہوئی تھی۔ کچھ اس طرح اس نے لاؤنج کا جائزہ لیا گویا بہ زبانِ خموشی کہہ رہی ہو۔

بازیچہ اطفال ہے دنیا میرے آگے

کاؤنٹر پر آج نہ صرف ریسپشنسٹ لڑکی موجود تھی بلکہ ہمایوں سرور بھی اس کے قریب ہی کاؤنٹر پر کہنی ٹکائے کھڑا تھا۔ لڑکی اسمارٹ لک‘ سانولی اور کم رُو تھی۔ وہ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ عالیہ پر نظر پڑتے ہی وہ گویا مبہوت سے رہ گئے۔ ہنسنا بھول گئے۔ عالیہ نے ایک مختصر سے لمحے میں دیکھ لیا تھا کہ ان کی آنکھوں میں محویت تھی۔ پسندیدگی تھی۔ مرعوبیت تھی۔

عالیہ نے ہمایوں سرور کی طرف گویا آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور لہجہ ذرا سا بگاڑ کر انگریزی میں ریسپشنسٹ لڑکی سے مخاطب ہوئی۔ ”کل کے اخبار میں آپ لوگوں کا جو اشتہار چھپا تھا‘ میں اس کے سلسلے میں آئی ہوں‘ مجھے کس سے ملنا چاہیے؟“

”ریذیڈنٹ ڈائریکٹر سے۔“ لڑکی نے مرعوب سے لہجے میں انگریزی میں جواب دیا۔ ”وہ اوپر بیٹھے ہیں۔“ اس نے بائیں طرف اشارہ کیا جدھر سے بل کھاتا ہوا زینہ اوپر جا رہا تھا۔

”شکریہ۔“ عالیہ نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور اپنے شولڈر بیگ پر ہاتھ ٹکائے ایک ادائے بے نیازی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

اوپر پہنچ کر ایک کمرے کے دروازے پر ریذیڈنٹ ڈائریکٹر کی تختی دیکھ کر وہ رکی۔ کمرے کے سامنے پڑا ہوا چپڑاسی کا اسٹول خالی پڑا تھا۔ اس لیے اس نے دروازے پر انگلی سے ہولے سے دستک دی اور ”یس.......... کم اِن۔“ کی آواز سن کر اندر داخل ہو گئی۔

ایک بڑی سی میز کے عقب میں ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر کے صاحب بیٹھے تھے۔ ایک انگریزی رسالہ ان کے سامنے رکھا ہوا تھا اور وہ ایک خوب صورت سے طلائی قلم کی نوک دانتوں میں دبائے ہوئے تھے۔ عالیہ کا سر تا پا جائزہ لے کر وہ کچھ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی کرختگی اور تناؤ دور ہو گیا اور اس کی جگہ بڑی خلیق سی مسکراہٹ آگئی۔

عالیہ نے اپنے کاغذات کی فائل ان کے سامنے رکھ دی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر قدرے جھکتے ہوئے بولی۔ ”یہ میرے کوائف ہیں.......... اور یہ میں ہوں۔“ اس نے بڑی ادا سے دونوں ہاتھوں سے اپنی طرف اشارہ کیا جیسے کوئی اداکار اپنے آپ کو اسٹیج پر متعارف کرا رہا ہو۔ دراصل اب اسے یقین آگیا تھا کہ دنیا واقعی ایک اسٹیج ہے اور سب لوگ اداکار ہیں۔

.... اور آج وہ اپنے اندر اداکاری کا اعتماد محسوس کر رہی تھی۔ شاید اس کے لیے اس کا بہروپ مکمل تھا۔ اس کے بہروپ کی پہلی کامیابی یہ تھی کہ آج اسے ہمایوں سرور نے بھی نہیں پہچانا تھا۔ عالیہ نے بظاہر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا لیکن وہ اس کے تاثرات کو محسوس کر سکتی تھی۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آنے لگی تھی تو اس نے ایک اچٹتی سی نظر ہمایوں سرور پر ڈالی تھی۔ وہ یوں ہونٹ سکیڑے کھڑا تھا جیسے سیٹی بجاتے بجاتے رہ گیا ہو۔ ستائش اس کی آنکھوں میں جا گزیں تھی۔ عالیہ نے اس وقت یہی جانا تھا

کہ وہ اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ شاید اسے گمان تک نہیں گزرا تھا کہ یہ وہی کل والی دقیانوسی لڑکی ہے۔

سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے ہوئے وہ تذبذب کا شکار رہی کہ کیا واقعی ہمایوں سرور نے اسے نہیں پہچانا۔ حالانکہ اسے یہ خیال بھی آرہا تھا کہ طارق روڈ پر فرح نے اسے پہچان لیا پھر اس نے خود کو تسلی دی کہ فرح اس کے دفتر میں کام کر چکی تھی۔ دن میں کئی بار سامنا ہوتا تھا' گفتگو ہوتی تھی۔ اس کا اسے اس روپ میں بھی پہچان جانا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ اس نے آخر میک اپ کرایا تھا اور بال ترشوا کر ڈھنگ کا لباس ہی تو زیب تن کیا تھا' کوئی پلاسٹک سرجری تو نہیں کرائی تھی کہ بارہا ملنے والے بھی اسے نہ پہچان پاتے۔

البتہ ہمایوں سرور کے اسے نہ پہچاننے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اس نے اسے محض ایک بار دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے خیالات میں غرق تھا اور وہ خود دروازے پر کھڑی تھی۔ کوریڈور میں جلنے والی ٹیوب لائٹ اس کے عقب میں تھی اور ہمایوں سرور دفتر میں عین ٹیوب لائٹ کے نیچے بیٹھا تھا اور اس نے اسے غور سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس کے مفلس حلئے اور میک اپ سے بے نیاز سادہ سے چہرے پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر اسے نظرانداز کر دیا تھا۔ اس وقت وہ ایک دقیانوسی لڑکی کے روپ میں تھی اور ہمایوں سرور نے اسے قابلِ غور چیز سمجھا ہی نہیں تھا۔ آج اس کے خواب و خیال میں بھی نہ ہو گا کہ یہ وہی لڑکی ہو گی جسے کل اس نے تضحیک کا نشانہ بنا کر واپس کر دیا تھا۔

عالیہ دل ہی دل میں خوش تھی کہ اس کا بہروپ مکمل ہے اور ہمایوں سرور واقعی اسے نہیں پہچان پایا تھا۔

عالیہ نے ہمایوں سرور کو ذہن سے جھٹک دیا اور مسکرا کر ریذیڈنٹ ڈائریکٹر صاحب کی طرف دیکھا جو سحرزدہ سی نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”کیا آپ مجھے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہیں گے؟“ عالیہ نے آرڈی صاحب پر مسکراہٹ کی کچھ اور بجلیاں گرائیں۔

”اوہ.......... ضرور' تشریف رکھیے پلیز۔“ آرڈی صاحب نے گویا چونک کر حواس

کی دنیا میں واپس آتے ہوئے کہا اور کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”میں آپ کے کل والے اشتہار کے سلسلے میں آئی ہوں۔“ عالیہ نے بڑی نزاکت سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔“ آرڈی صاحب نے گہری سانس لی۔ ”میں تو سمجھا تھا کہ آپ ماڈلنگ کے سلسلے میں تشریف لائی ہیں۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ اگر آپ ماڈلنگ کی دنیا میں قدم رکھ دیں تو تہلکہ مچ جائے گا۔“

”جی نہیں' مجھے ایسا کوئی شوق نہیں۔“ عالیہ نے نخوت سے ناک چڑھا کر کہا۔ ”ماڈل کے پاس عموماً صرف ایک خوب صورت چہرہ ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات تو وہ بھی نہیں ہوتا۔ محض ایک فوٹو جینک چہرہ ہی ہوتا ہے جبکہ میرے پاس چہرے کے علاوہ بھی بہت سی صلاحیتیں ہیں جنہیں میں استعمال کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے اپنی خوب صورتی سے زیادہ اپنی ذہانت اور اہلیت کو ثابت کرنے کا شوق ہے۔ ذہانت کی چھوڑی ہوئی یادگاریں زیادہ پائیدار ہوتی ہیں بہ نسبت حسن کی چھوڑی ہوئی یادگاروں کے.......... کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“ اس نے آرڈی صاحب کی آنکھوں میں جھانکا۔

”درست فرمایا آپ نے۔“ آرڈی صاحب نے گویا ریشہ خطمی ہوتے ہوئے کہا۔

”میں حیران ہوں۔“ عالیہ نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بڑی ادا سے کہا۔ ”میرا تو خیال تھا کہ اس پوسٹ کے لیے لڑکیوں کا ہجوم ہو گا لیکن یہاں تو کوئی بھی نظر نہیں آرہی۔“

”کل بہت سی خواتین آئی تھیں۔“ آرڈی صاحب سنبھلتے ہوئے بولے۔ ”لیکن ہمارے معیار پر کوئی بھی پوری نہیں اتری۔“

”مجھے لگتا ہے کہ یہ پوسٹ میرا انتظار کر رہی ہے۔“ عالیہ نے بڑے اعتماد سے کہا اور ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ آج اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کی ہنسی مترنم تھی لیکن آج سے پہلے اسے ہنسنے والی باتوں پر بھی ہنسنے کی عادت نہیں تھی۔

”مجھے بھی یہی لگ رہا ہے کہ اس پوسٹ کے لئے ہمیں آپ کا ہی انتظار تھا۔“ آرڈی صاحب بلا تامل بولے۔ پھر انہوں نے عالیہ کی فائل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

کاغذات اور سرٹیفکیٹ وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہوئے وہ ہولے ہولے سر ہلاتے رہے۔ وہ کاغذات کا مطالعہ کر رہے تھے اور عالیہ بغور ان کے چہرے کا مطالعہ کر رہی تھی۔ بالآخر وہ ایک گہری سانس لے کر سر اٹھاتے ہوئے بولے۔ ”تمام چیزیں ہمارے مطلوبہ معیار کے مطابق ہیں۔ بہرحال میں اب آپ سے ایک نارمل سا انٹرویو لینا چاہوں گا۔“

”ضرور‘ ضرور۔“ عالیہ نے اطمینان سے کہا۔ آج وہ اپنے آپ کو ہر امتحان میں پورا اترنے کا اہل محسوس کر رہی تھی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ وہ ہمایوں سرور کی شکر گزار تھی۔ اگر وہ اس کی انا کو مجروح نہ کرتا تو شاید کبھی اس کی وہ خوابیدہ صلاحیتیں بیدار نہ ہوتیں جن کی موجودگی سے وہ خود بھی بے خبر تھی۔

پورے اعتماد سے اس نے ہر سوال کا جواب دیا۔ آئیڈیاز دیئے۔ حالانکہ اسے تشہیری مہم چلانے اور کلائنٹس سے معاملات طے کرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن اپنی صحافتی تعلیم اور تھوڑے بہت اِدھر اُدھر کے مطالعے کی وجہ سے بہت سے معاملات کا اندازہ ضرور تھا۔ اس لیے جب اس ضمن میں اسے کریدا گیا تو اس نے کسی قسم کی کمزوری یا اناڑی پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ویسے بھی آج سب سے بڑا کردار تو اس کی خود اعتمادی ادا کر رہی تھی۔

اس کے رویے میں اس چیز کی جھلک موجود تھی کہ اسے ملازمت کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے اور اس کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ وہ پہلے ہی ایک ملازمت کر رہی تھی اور عالیہ نے محسوس کیا تھا کہ جو لوگ ملازمتوں سے خاصے بے نیاز نظر آتے ہیں انہیں عموماً ملازمتیں مل جاتی ہیں اور جو بے چارے انتہائی ضرورت کے عالم میں در در پھرتے ہیں ان پر ہر دروازہ بند ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ جو جتنا ضرورت مند ہوتا ہے شاید اس کی آزمائش اتنی ہی طویل ہوتی ہے۔

ایک گھنٹے بعد عالیہ جب آرڈی صاحب کے کمرے سے نکلی تو اپائنٹ منٹ لیٹر اس کے ہاتھ میں تھا۔ فی الحال اسے صرف تین ماہ کے لیے آزمائشی طور پر ملازمت دی گئی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ یہ کچی ملازمت پکی ملازمت میں بدل ہی جائے گی۔ تین ماہ کا عرصہ

اپنی صلاحیتیں ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔

اسی یقین کے ساتھ اس نے اپنی ملازمت سے استعفا دے دیا اور ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں آگئی۔ یہ اس کی زندگی کا ایک نیا باب تھا۔

☆=====☆======☆

پہلے تین روز تو اسے اپنے کام کو سمجھنے اور دفتر کے دوسرے لوگوں سے متعارف ہونے میں ہی گزر گئے۔ اس کا اندازہ درست تھا کہ ہمایوں سرور نے اسے پہچانا نہیں تھا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ عالیہ پہلے دن آئی اور اسی روز اسے ملازمت مل گئی۔

آرڈی صاحب نے جب اس سے عالیہ کا تعارف کرایا تھا تو وہ بڑی ادا سے قدیم رومن انداز میں جھک کر گویا اسے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ آئیں‘ آپ نے دیکھا........ اور آپ نے فتح کر لیا۔ میں ذاتی طور پر ایسی شخصیتوں کا بڑا قدردان ہوں جو پہلی ہی کوشش میں بڑے بڑے مضبوط قلعے فتح کر لیتی ہیں۔“

اس وقت وہ اپنے کمرے میں اپنی میز کے قریب کھڑا تھا اور کسی یونانی دیوتا کی طرح خوب صورت نظر آرہا تھا۔ عالیہ کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی تو اس خراجِ تحسین پر کم از کم مسکراتی ضرور‘ لیکن عالیہ نے محض سرد مہری سے اس کی طرف دیکھا اور رکھائی سے بولی۔ ”میری نظر میں یہ کوئی فتح نہیں ہے۔ میری تو زندگی کے میدانِ جنگ میں جنگ ہی ابھی شروع ہوئی ہے۔ فتوحات تو ابھی بہت دور ہیں۔“

اور وہ بس گہری گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔

چوتھے روز آرڈی صاحب نے عالیہ کو اپنے کمرے میں بلایا اور کافی منگوانے کے بعد کہا۔ ”ہمارے ایک کلائنٹ ہیں صدیقی صاحب‘ دو کروڑ کی لاگت سے انہوں نے لفافوں میں پیک ہونے والے دودھ کا پلانٹ لگایا تھا۔ بدقسمتی سے مارکیٹ میں ان کی پراڈکٹ چل نہیں سکی۔ حالانکہ ان کی پبلسٹی کا سارا کام ہمارے پاس تھا اور جس کمپنی کی پبلسٹی ہمارے پاس ہو اس کی پراڈکٹ عام طور پر چل ہی جاتی ہے لیکن صدیقی صاحب کی پراڈکٹ کے معاملے میں ہم بھی ناکام رہے ہیں‘ لیکن خدا کا شکر ہے کہ صدیقی صاحب ہم سے زیادہ [illegible] ہوتے اور انہوں نے ہم سے پبلسٹی کا کام واپس نہیں لیا۔ وہ سمجھ رہے ہیں

پبلسٹی ٹھیک ٹھاک ہی تھی۔ پراڈکٹ کے فیل ہونے کی وجوہات دوسری ہیں اور ان کا یہ خیال درست بھی ہے۔ بہرحال تیس چالیس ہزار روپے روزانہ کا نقصان ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے وہ اس صورتِ حال سے بہت پریشان ہیں۔ اس قسم کی صورتِ حال میں ہمایوں سرور ہمارے کام آتا ہے۔"

ہمایوں سرور کا نام سن کر ایک لمحے کے لیے اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی لیکن وہ فوراً ہی اپنی دھڑکنوں کی اس بے ترتیبی پر قابو پالیتی تھی۔

"آج آپ ہمایوں سرور کے ساتھ ایک میٹنگ کر لیجئے۔" آر ڈی صاحب کہہ رہے تھے۔ "وہ آپ کو صدیقی صاحب کی کمپنی کے سلسلے میں کچھ نئے آئیڈیاز دے گا۔ صدیقی صاحب کے پلانٹ وغیرہ کے بارے میں تمام معلومات اس کے پاس موجود ہیں۔ وہ اس پراجیکٹ پر پچھلے پندرہ دن سے مسلسل غور و خوض کر رہا ہے اور بالآخر اس نے نہ صرف پبلسٹی کے لئے نئی حکمتِ عملی تیار کر لی ہے بلکہ وہ پلانٹ کو چلانے اور ڈسٹری بیوشن وغیرہ کے سلسلے میں بھی صدیقی صاحب کو مشورے اور آئیڈیاز دینا چاہتا ہے۔ آپ اس کے ساتھ ایک میٹنگ کر کے اس کی ساری باتیں سمجھ لیں۔ وہ تمام مشورے اور آئیڈیاز صدیقی صاحب تک آپ پہنچائیں گی۔ کل صدیقی صاحب کو ہم نے یہاں دفتر میں ہی لنچ پر مدعو کیا ہے۔ لنچ کے بعد آپ کی ان سے میٹنگ ہو گی اور کمپنی کی طرف سے آپ تمام نئے معاملات صدیقی صاحب سے ڈسکس کریں گی۔ آپ کے پاس تقریباً چوبیس گھنٹے ہیں۔ ان چوبیس گھنٹوں میں آپ ہمایوں سرور کی تیار کردہ تجاویز اور آئیڈیاز پر مزید غور و خوض کر سکتی ہیں۔ انہیں مزید بہتر بنانے کی کوشش کر سکتی ہیں۔ صدیقی صاحب ایک بار پھر اس پراجیکٹ میں کافی رقم جھونک کر ایک قسم کا جوا کھیلنے کے لئے تیار ہیں۔ اگر ہم انہیں کوئی متاثر کن پروگرام تیار کر کے نہ دے سکے تو ایک خاصا بڑا کلائنٹ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

"کلائنٹ کی تو آپ فکر مت کیجئے۔" عالیہ گہری سانس لے کر بولی۔ "لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکی کہ اس کمپنی میں ہمایوں سرور کی حیثیت کیا ہے اور اس کے کام کی نوعیت کیا ہے۔"

"ہاں......... یہ سوال کمپنی میں آنے والے ہر نئے ملازم کو ضرور تھوڑا سا پریشان کرتا ہے۔" آر ڈی صاحب مسکرائے۔ "میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ سرور کا عہدہ ویسے تو یہاں کری ایٹو ڈائریکٹر کا ہے لیکن درحقیقت کمپنی میں میرے بعد سب سے اہم آدمی وہی ہے۔"

"اوہ........." عالیہ نے ہونٹ سکیڑے۔ اس کے لیے یہ ایک انکشاف تھا کہ ہمایوں سرور کمپنی میں اتنی اہمیت رکھتا ہے۔

"تنخواہ بھی میرے بعد سب سے زیادہ اسی کی ہے۔" آر ڈی نے کہا۔ "شروع شروع میں وہ صرف اشتہاروں اور کمرشل فلموں کے لئے آئیڈیاز دیتا تھا لیکن بعد میں ہم پر اور خود اس پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ بہت اچھا منصوبہ ساز بھی ہے۔ اسے فیکٹریوں' کمپنیوں اور دیگر کاروباری اداروں کو چلانے کی بڑی سمجھ بُوجھ ہے۔ حالانکہ وہ خاندانی بزنس مین یا کارخانے دار نہیں ہے لیکن بس یہ اس کی خداداد صلاحیت ہے۔ وہ کسی کاروباری ادارے کی ناکامی کی وجوہات بڑی جلدی سمجھ جاتا ہے اور اس ناکامی کو کامیابی میں بدلنے کے لیے اس کے ذہن میں بڑے اچھوتے خیالات آتے ہیں۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ ہماری معرفت اس نے کئی ناکام اور ڈوبتے ہوئے اداروں کو کچھ مشورے دیئے اور وہ ایک بار پھر کامیابی سے بزنس کرنے لگے۔"

آر ڈی صاحب' ہمایوں سرور کی خصوصیات اس فخر سے بیان کر رہے تھے جیسے وہ خود اپنے کارناموں کی تفصیلات بیان کر رہے ہوں۔ عالیہ غور سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد آر ڈی صاحب نے کہا۔ "ہمایوں سرور کی ان صلاحیتوں کے باعث اس کا نام تجارتی اور کاروباری حلقوں میں بہت معروف ہے اور اس کے بارے میں زیادہ تر جاننے والے اسے "بیمار کمپنیوں کا مسیحا" بھی کہتے ہیں۔ کئی بڑے صنعتی اداروں نے اسے بھاری تنخواہ پر بطور ایڈوائزر اپنے ہاں بلانا چاہا لیکن ہم نے اس سے زیادہ تنخواہ دے کر اسے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ وہ بظاہر ایڈورٹائزنگ کی لائن کا آدمی معلوم نہیں ہوتا' لیکن ہم اس کی قدر جان گئے ہیں۔ ہمیں اس کی ذات سے بڑا

فائدہ ہے۔ ہم بظاہر ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہیں لیکن ہمارا کام صرف ایڈورٹائزنگ تک ہی محدود نہیں۔ ہمایوں سرور کی وجہ سے ہم نئی بننے والی کمپنیوں اور ڈوبتی ہوئی کمپنیوں کو سنبھالا دینے کا کام بھی کرتے ہیں۔ اس سے ایک تو ہمیں اضافی آمدنی بھی ہوتی ہے اور ایڈورٹائزنگ کا کام بھی ہمیں دوسروں سے زیادہ ملتا ہے۔ اس معاملے میں ہماری شہرت سن کر بڑے بڑے ادارے خود ہمارے پاس آتے ہیں اور اسی لیے فی الحال ہم ملک کی سب سے بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہیں اور ہماری شاخیں تمام بڑے اور اہم شہروں میں ہیں۔"

"بہت خوب!" عالیہ نے گہری سانس لی۔ "تبھی ہمایوں صاحب کو خود پر اتنا گھمنڈ ہے۔"

"بھئی اس کا حق بنتا ہے خود پر فخر کرنے کا۔" آر ڈی صاحب سگار کا کش لے کر بولے۔ "بہت اچھی عمر میں اس نے کاروباری حلقوں میں ایک مقام بنالیا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس کی فیلڈ کا کوئی مخصوص نام نہیں ہے۔ یعنی ہم اس کے عہدے کو کوئی صحیح نام نہیں دے سکتے، اور یہ نہیں بتا سکتے کہ اس نے درحقیقت کس چیز میں اسپیشلائز کیا ہے۔ بس وہ بذات خود ایک اسپیشل انسان ہے۔ ایسے نوجوانوں کی ہمارے ملک میں بڑی کمی ہے۔ آپ کے خیال میں اسے اپنے آپ پر گھمنڈ ہے، جبکہ میرا خیال ہے کہ اس کا کوئی پرزہ تھوڑا سا کھسکا ہوا ہے......."

آر ڈی صاحب نے یہ کہتے ہوئے انگلی سے کنپٹی کی طرف سے اشارہ کیا، لیکن پھر خود ہی بولے۔ "تاہم یہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔ ہر جینئس آدمی کا کوئی نہ کوئی پرزہ تھوڑا بہت کھسکا ہوا ضرور ہوتا ہے یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔"

عالیہ یہ سب کچھ بڑے غور سے سن رہی تھی اور اس سے اسے ہمایوں سرور کو سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ اس کے ذہن میں ایک تصویر سی تھی جو اب واضح ہو گئی تھی۔

وہ بڑی سادگی سے بولی۔ "ساری تجاویز ہمایوں صاحب کی ہوں گی تو وہ خود ہی انہیں صدیقی صاحب کے سامنے کیوں نہیں پیش کرتے؟ یہ تو گویا میرے منہ میں ان کی زبان بول رہی ہو گی۔ اس میں بھلا کیا مصلحت ہے؟"

آر ڈی صاحب کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا کر مسکرائے اور دھیمے لہجے میں بولے۔ "مس عالیہ! اگر انٹرویو کے دوران میں مجھے شبہ بھی ہو جاتا کہ آپ اس حد تک سادہ اور کم فہم لڑکی ہیں تو میں کبھی آپ کو منتخب نہ کرتا۔ آپ ایک میچور لڑکی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ ان معاملات کو بڑی اچھی طرح سمجھتی ہیں اور اب ایڈورٹائزنگ کی لائن میں آنے کے بعد تو اور بھی اچھی طرح سمجھنے لگیں گی۔"

"ہو سکتا ہے کہ میں سمجھتی ہوں۔" عالیہ نے مدھم لہجے میں کہا اور اس کے چہرے پر بدستور سادگی طاری رہی۔ "لیکن میں آپ کے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔"

آر ڈی صاحب گویا اس کی فرمائش پوری کرنے کی خاطر وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ "مرد خواہ کسی بھی عمر کا ہو، کسی بھی ذوق کا ہو، ایک عورت کی اور خصوصاً ایک خوب صورت عورت کی بات زیادہ توجہ سے سنتا ہے اور اس کی تجاویز کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہے۔ بعض نہایت اچھے اور معقول منصوبے جو کسی وجہ سے منظور نہیں ہو پاتے، محض نفیس اور سلیقہ مند خواتین کے پیشکش کے انداز سے منظور ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے بڑی کمپنیوں میں خوب صورت، نفیس، سلیقہ مند اور ایٹی کیٹس سے واقف عورتوں کی اہمیت کو محسوس کیا جاتا ہے اور ایڈورٹائزنگ تو ویسے بھی ایک طرح کا شو بزنس ہے۔ صدیقی صاحب کے ساتھ آپ کی میٹنگ ہو گی تو انہیں بھی اچھی طرح معلوم ہو گا کہ یہ تجاویز دفتر کی طرف سے ہیں بلکہ شاید یہ بھی معلوم ہو گا کہ پورا پلان ہمایوں سرور نے تیار کیا ہو گا لیکن پھر بھی وہ سب کچھ آپ کی زبانی سن کر خوشی محسوس کریں گے، کم بحث کریں گے، جلدی منظوری دیں گے۔"

آر ڈی صاحب نے ایک گہری نظر عالیہ پر ڈالی۔ سگار کا ایک گہرا کش لیا اور پھر سلسلۂ کلام آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ "ویسے خود ہمایوں بھی بڑے سے بڑے لوگوں کو قائل کرنے اور بات منوانے میں کم سلیقہ مند نہیں ہے۔ خطابت اور دلیل بازی میں اس کا بھی کوئی جواب نہیں لیکن پھر بھی بہرحال......... فرق اپنی جگہ برقرار رہتا ہے۔ یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ کیونکہ ہم ایڈورٹائزنگ کے بزنس میں برسوں سے ہیں۔ دوسری ایڈورٹائزنگ ایجنسیاں بھی چاہیں تو ہمایوں جیسا کوئی شخص تلاش کر لیں۔ خوب صورت

اور پُرکشش خواتین کی بھی ان کے ہاں کوئی کمی نہیں ہوتی لیکن ان سے کام کس طرح لیا جانا چاہیے' یہ سلیقہ بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ ہم اسی لیے تو سب سے آگے ہیں کہ ہمیں لوگوں کی صلاحیتوں کو صحیح وقت اور صحیح جگہ پر استعمال کرنے کا سلیقہ ہے۔"

"لیکن سر!" عالیہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ "مانا کہ آپ کی نظر میں میرا چہرا حسین اور شخصیت پُرکشش ہے......... لیکن میں محض اپنے حُسن اور کشش کی بنیاد پر کوئی کام کرنا نہیں چاہتی۔ یہ حُسن اور کشش میرا سرمایہ نہیں ہے۔" اور اس وقت وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ ایک ہفتہ پہلے تو اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ اس کی ذات کے صحرا میں حسن و کشش کا کوئی دفینہ چھپا ہوا ہے۔ حالات نے کبھی اتنی مہلت ہی نہیں دی تھی کہ وہ اپنے آپ کو دریافت کر سکتی۔ وہ تو کسی کی حقارت بھری ٹھوکر نے مدفون خزانوں پر سے خاک ہٹا دی۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "سر! آپ کی نظر بڑی جوہر شناس سہی لیکن پھر بھی مجھے شبہ ہے کہ آپ نے میری صلاحیتوں کو پہچانا نہیں۔ ویسے بھی کسی کے سرٹیفکیٹ اور مختصر سے کیریئر کا ریکارڈ اس کی ساری صلاحیتوں کا پتا نہیں دے سکتا۔ میں اپنی صلاحیتوں پر انحصار کرنا چاہتی ہوں۔"

"مجھے آپ کی صلاحیتوں کا بہت اچھی طرح اندازہ ہے مس عالیہ!" آر ڈی صاحب نے سگار کا طویل کش لے کر کہا۔ "اور ہم ان سے پورا پورا استفادہ کریں گے لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ہر کام میں کچھ وقت لگتا ہے نا۔"

"ہر کام میں تو نہیں' کسی کسی کام میں سر!" عالیہ نے گویا تصحیح کی۔ "بعض کاموں میں تو دیر کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" آر ڈی صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"سر! میری خواہش ہے کہ میں اپنی صلاحیتوں کے اظہار میں اب ایک دن بھی ضائع نہ کروں۔" عالیہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "آپ صدیقی صاحب کے پلانٹ' عملے اور دیگر تمام چیزوں کی تفصیلات پر مشتمل فائل مجھے دے دیں۔ میں اپنے طور پر ان کے لیے تجاویز تیار کروں گی۔ اگر انہیں پسند آگئیں تو ٹھیک ہے ورنہ بعد میں آپ ہمایوں مرزا

سے صدیقی صاحب کی میٹنگ کروا دیجئے گا۔ اس میں آپ کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ مجھے بھی اپنی صلاحیتوں کا امتحان لینے کا موقع مل جائے گا اور آپ کو بھی کافی حد تک درست اندازہ ہو جائے گا کہ میں آئندہ چل کر آپ کے لیے کس حد تک کار آمد ثابت ہو سکتی ہوں۔"

چند لمحے کے لیے کمرے میں قطعی سکوت چھا گیا۔ آر ڈی صاحب ایک ٹک عالیہ کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن ان کا ذہن غالباً کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ شاید وہ عالیہ کی تجویز کے اچھے اور برے پہلوؤں پر غور کر رہے تھے۔

بالآخر وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔ "آپ کے پاس چوبیس گھنٹے سے بھی کم وقت ہے اور اس دوران آپ کو سونا بھی ہے۔ اتنا وقت تو فائل کے مطالعے کے لیے بھی شاید کم ہو۔"

"کسی کام کو چیلنج سمجھ کر قبول کرنا اسی کو تو کہتے ہیں۔" عالیہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "مطلوبہ وقت میں کام مکمل کرنا تو عام سی اور روٹین کی بات ہے۔"

"کیا یہ آپ کی شدید خواہش ہے کہ آپ یہ تجربہ ضرور کریں؟" آر ڈی صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" عالیہ نے بلا تامل جواب دیا۔

"آپ کو یہ بھی اندازہ ہے کہ صدیقی صاحب ہمارے لیے کتنے اہم کلائنٹ ہیں؟ اگر انہوں نے پبلسٹی کا کام ہم سے واپس لے لیا تو' اور وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گئے تو......... اس سے کمپنی کو بہت زیادہ نقصان تو نہیں ہو گا لیکن ہماری ساکھ ضرور متاثر ہو گی۔" آر ڈی صاحب نے اس مسئلے کے منفی نتائج سے آگاہ کیا۔

"میں نے کہا نا سر' کہ کلائنٹ کی آپ فکر نہ کریں۔" عالیہ نے یقین سے کہا۔

آر ڈی صاحب نے ایک لمحے کو کچھ سوچا۔ بالآخر گہری سانس لے کر بولے۔ "اچھا' ٹھیک ہے۔ تجربے کرنا ہماری کمپنی کی روایت رہی ہے۔ ایک یہ تجربہ بھی سہی۔"

"شکریہ سر!" عالیہ نے اپنے اندرونی ہیجان کو دباتے ہوئے کہا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس نے کسی بڑی جنگ کے پہلے مرحلے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ "ایک بات اور سر.........! میں چاہوں گی کہ صدیقی صاحب سے میری میٹنگ کے دوران ہمارے میڈیا مینجر شکیل احمد صاحب بھی میرے ساتھ موجود رہیں۔"

"کیوں......... اس میں کیا مصلحت ہے؟" آر ڈی صاحب نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں بالکل تخلیے میں صدیقی صاحب سے میٹنگ نہیں رکھنا چاہتی سر!" وہ بے خوف انداز میں براہ راست آر ڈی صاحب کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "میری وضاحت پر مجھے معاف فرمایئے گا' لیکن میں کھل کر بات کرنا بہتر سمجھتی ہوں۔ اگر صدیقی صاحب نے میری تجاویز منظور کر لیں تو میں نہیں چاہتی کہ بعد میں کوئی یہ سمجھے کہ شاید صدیقی صاحب میری کسی اور ادا پر ریجھ گئے تھے اس لیے انہوں نے ہر بات کی ہامی بھر لی۔"

آر ڈی صاحب نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے ان کے سامنے کوئی ناسمجھ بچی بیٹھی ہو جس نے نہایت بچکانہ بات کہہ دی ہو پھر وہ ہنس کر بولے۔ "مس عالیہ! آپ بچکانہ قسم کے اندیشوں میں مبتلا نہ ہوں۔ ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں میں اس قسم کی باتیں نہیں ہوتیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سر.........! دفتروں کے ماحول کو تھوڑا بہت میں بھی جانتی ہوں لیکن پھر بھی سر! میں چاہتی ہوں کہ دل میں ایسا خیال نہ آئے۔" عالیہ نے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں اصرار کیا۔

"اگر آپ اس تشویش میں مبتلا رہنے لگیں کہ لوگوں کے دلوں میں کیا خیالات آتے ہیں یا آسکتے ہیں تو پھر زندگی آپ کے لیے بہت دشوار ہو جائے گی اور شاید ایڈورٹائزنگ کی لائن میں کام کرنا تو بہت کٹھن ہو جائے گا۔" آر ڈی صاحب گہری سنجیدگی سے بولے۔

"انسان سبھی لوگوں کے ذہنوں میں آنے والے سبھی خیالات کو تو نہیں روک سکتا لیکن کسی کے ذہن میں آنے والے کسی خیال کو روکنا بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے۔" عالیہ نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اچھا چلیئے ہم آپ کی یہ بات بھی مان لیتے ہیں۔" آر ڈی صاحب بولے۔ "ہم اس امید پر آپ کی باتیں مانتے جا رہے ہیں کہ شاید آپ کی آمد کمپنی کے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہو۔ ہمایوں سرور کے بعد ہمارے ہاں کوئی ایسی شخصیت نہیں آئی جس کی وجہ سے کمپنی کو انقلابی قسم کی کامیابیاں نصیب ہوئی ہوں۔ بس روٹین میں ہی کام ہوتے ہوتے بزنس اتنا پھیل گیا ہے۔"

"میں کوئی دعویٰ کرنے کی قائل نہیں ہوں۔ دیکھتے ہیں وقت کیا دکھاتا ہے۔" عالیہ بہت دیر بعد مسکرائی۔ "آپ مجھے وہ فائل منگوا دیجئے جس میں صدیقی صاحب کے پلانٹ وغیرہ کی تفصیلات ہیں۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

عالیہ جب آر ڈی صاحب کے کمرے سے نکلی تو اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا لیکن بظاہر وہ پرسکون تھی۔ اس دفتر میں چند دن گزارنے کے بعد ہی اس کی شخصیت میں خود بخود ہی اتنا اعتماد آیا تھا کہ بڑے بڑے کاموں میں ہاتھ ڈالنے کو اس کا دل مچلنے لگا تھا۔

مگر وہ جو اس کے اندر دور کہیں ایک ڈرپوک' سادہ سی لڑکی چھپی ہوئی تھی' وہ اب بھی اسے ڈرانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن عالیہ نے سر جھٹک کر اس کی آواز پر کان نہیں دھرے۔ اس نے دل ہی دل میں مصمم فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ خود کو منوا کر رہے گی۔

بہرحال' صرف چوبیس گھنٹے بعد اس کا فیصلہ ہو جانا تھا۔

☆=====☆=====☆

نورالنساء بیگم کی حیرت بجا تھی۔

"ایسا کبھی ہو سکتا ہے کہ آسمان اپنی جگہ چھوڑ کر زمین کو گلے لگا لے۔ یہ کیسے ممکن تھا ذرہ چاند کا جھومر بن جائے.........؟ سیٹھ سہیل جیسے لوگ تو مخمل میں مخمل کے پیوند کے بھی قائل نہیں ہوتے کجا یہ کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانا پسند کریں۔" نورالنساء بیگم نے سوچا۔

سیٹھ سہیل ان کی خاموشی اور حیرت کی پروا کیے بغیر بولے۔ "دیکھو بھئی.........! میں کبھی پوز نہیں کرتا۔ اپنا ظاہر و باطن ایک رکھنے کی کوشش کرتا ہوں‘ چاہے کسی کو اچھا لگے یا برا۔ شاید میں کوئی بہت اچھا انسان نہیں ہوں لیکن مجھے یہ اطمینان ہے کہ میں کم از کم منافق نہیں ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں غریبوں میں بہت زیادہ گھل مل کر بیٹھنے والا آدمی ہوں‘ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں طبقاتی فرق کا قائل ہوں۔ میں نے اپنے اور ورکنگ کلاس کے درمیان ہمیشہ فاصلہ رکھا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرا زیادہ لائق بیٹا ایک مزدور بیوہ کی بیٹی اور اپنے مل کی ایک ملازمہ سے شادی کا فیصلہ کرلے گا اور مجھے اس کا رشتہ لے کر اس کالونی کے ایک کوارٹر میں آنا پڑے گا۔ شاید خدا اسی طرح انسانوں کو اپنی قدرت کا قائل کرتا ہے۔ خیر‘ خدا کو اگر اسی طرح منظور ہے تو اسی طرح سہی۔ میں اور تم اس معاملے میں بھلا کیا کرسکتے ہیں۔ قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔"

انہوں نے گردن کو خفیف سا جھٹکا دیا۔ ایک گہری سانس لے کر وہ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "میں اپنا اصل بیٹا تو رمیز کو ہی شمار کرتا ہوں۔ میری زیادہ تر امیدیں اسی سے وابستہ ہیں اور وہ ہمیشہ میری امیدوں پر پورا اترا ہے۔ میرا دوسرا بیٹا جمیل تو اللہ

تعالیٰ نے یونہی خانہ پری کے لئے عطا کیا ہے۔ بہت نالائق ہے وہ.........کوئی کریکٹر نہیں ہے اس کا‘ تھالی کا بینگن ہے۔ متلون مزاج اور ناقابلِ اعتبار‘ بے اصولا بھی ہے۔ اسی لیے اندر سے بودا ہے لیکن رمیز پر مجھے فخر ہے۔"

ماہم نے سسکی سی لی۔ اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ اس کے وجود میں نفرت اور غصے کی چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ نفرت اسے جمیل سے محسوس ہو رہی تھی لیکن اس سے کہیں زیادہ اسے خود پر غصہ آرہا تھا۔ "میں کتنی آسانی سے بے وقوف بن گئی۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ جمیل نے کیسی چالاکی سے اسے محبت کا فریب دے کر‘ محبت کے نام پر شیطانی کھیل کھیلا تھا۔

"کوئی کریکٹر نہیں ہے اس کا۔ تھالی کا بینگن‘ ناقابلِ اعتبار‘ بے اصولا ہے۔" جمیل کے لیے اس کا باپ یہ الفاظ ادا کر رہا تھا۔ ماہم کا پورا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بار بار بھینچ رہی تھی اور کھول رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی‘ اسی وقت جائے اور جمیل کی بوٹیاں نوچ لے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سیٹھ سہیل نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور قدرے دھیمے لہجے میں بولے۔ "مگر ایک پہلو سے رمیز نے مجھے پریشان کیا۔ شادی نہیں کرتا تھا احمق کہیں کا۔ چالیس سال کی عمر ہونے کو آرہی ہے۔ میں نے اسے رعب دکھایا‘ لالچ دیا‘ منت کی۔ کسی طرح مانا ہی نہیں۔ ایک سے ایک اونچے گھرانے کی لڑکی دکھائی۔ اثر و رسوخ والے گھرانوں کی خوب صورت اور دولت مند لڑکیاں۔ مگر وہ تو شادی کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ چھبیس برس کی عمر میں کہیں اسے چھوٹا سا حادثہ پیش آگیا تھا۔ اپنی کسی دوست لڑکی کو ساتھ بٹھا کر چھوٹا جہاز اڑا رہا تھا کہ جہاز گر پڑا۔ لڑکی مرگئی۔ اس کے غم کو اب تک سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔ کسی قیمت پر شادی کے لیے راضی نہیں ہوتا تھا۔"

سیٹھ سہیل اس واقعے کا تذکرہ یوں کر رہے تھے جیسے وہ کوئی اہم بات ہی نہیں۔

پھر وہ گہری سانس لے کر بولے۔ "اور اب راضی ہوا بھی تو کہاں۔ میں نے اسے اب بھی بہت سمجھایا۔ بہت سی لڑکیاں تجویز کیں لیکن اس کی بس ایک ہی فرمائش تھی۔ بالآخر میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھالیا کہ کوئی بات نہیں۔ میں ہی

اپنے نظریات کی قربانی دے دیتا ہوں۔ کم از کم وہ رضامند تو ہوا۔ پتھر میں جونک تو لگی ہے۔ ورنہ مجھے تو امید ہی نہیں رہی تھی کہ وہ کبھی شادی کرے گا۔ چلو گھاٹے کا سودا ہی سہی لیکن اس کا گھر تو آباد ہو جائے گا۔ ویسے بھی اب ہمارا کاروبار اتنا پھیل چکا ہے کہ ہم سوچ لیں گے کہ اگر ایک بہو کے آنے سے ہماری صنعتوں' ہماری دولت' ہمارے اثر و رسوخ میں کوئی اضافہ نہ ہوا تو کوئی بات نہیں' میرے بیٹے کی خوشی تو پوری ہو جائے گی۔"

نورالنساء بیگم کتنی ہی حیران اور بدحواس سہی لیکن جتانے کا یہ انداز انہیں چبھ گیا' پسند نہیں آیا۔

"سیٹھ صاحب! میں آپ کے نظریات سے متفق ہوں۔ یعنی میں بھی طبقاتی فرق کی قائل ہوں کہ انسان اپنی حدود میں ہی رہے' اسی میں عافیت ہے۔ آپ کے اور ہمارے درمیان آسمان اور زمین جتنا فاصلہ ہے۔" نورالنساء بیگم نے دھیمے لہجے میں کہا لیکن الفاظ کی گہرائی میں گویا جذبات کا ایک سمندر ٹھاٹیں مار رہا تھا۔ سیٹھ نے ان کی انا کے شیشے کو ٹھیس پہنچائی تھی' وہ اس سے بیٹی کا رشتہ اس طرح مانگ رہے تھے گویا ان کی سات پشتوں پر احسان کر رہے ہوں۔

"میری غریب بیٹی کو آپ کے گھر میں کہاں عزت مل سکے گی۔" نورالنساء بیگم نے خود کو قدرے سنبھالتے ہوئے کہا' لیکن ان کے لہجے میں پختگی اور اعتماد تھا۔ "اور جہاں عزت نہ ہو وہاں سکھ کیسے ہو سکتا ہے؟ میرا خیال ہے' ہم دونوں بڑوں کو مل کر چھوٹوں کی اس بات کو یہیں ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کم از کم ہماری اور آپ کی بہتری اسی میں ہے۔"

نورالنساء بیگم کی بات سن کر سیٹھ سہیل نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا مگر پھر جلدی سے دل پر ہاتھ رکھ کر ذرا سہمے سے لہجے میں بولے۔ "میرا خیال ہے مجھے اتنے زور سے نہیں ہنسنا چاہیے۔ ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے۔ نورالنساء بیگم! تم تو بہت ہی ڈرپوک عورت نکلیں۔ انسان اپنی زندگی میں خود پہاڑ سر نہ کر سکا ہو تو کم از کم اپنی اولاد میں تو پہاڑ سر کرنے کا حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کرے۔"

"پہاڑ سر کرنے کے لئے بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے سیٹھ صاحب!" نورالنساء بیگم نے کہا۔ "ہم جیسے غریبوں کے لئے تو عزت سے زندگی گزارنا بھی کسی پہاڑ کو سر کرنے سے کم نہیں۔ ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا پڑتا ہے اور جب جوان بیٹی کا ساتھ ہو تو ہر لمحے یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگلا قدم کہیں غلط نہ پڑ جائے۔ میں واقعی بہت ڈرپوک عورت ہوں سیٹھ صاحب! میری زندگی کا محور میری بیٹی ہی تو ہے جس نے ایک چھوٹے سے گھر میں ہوش سنبھالا' غربت کے ماحول میں پلی بڑھی۔ وہ آپ کی کوٹھی میں آپ کی بہو بن کر آپ کو کیسے خوش رکھ سکے گی۔ ہم تہی دست لوگ ہیں۔ سوائے دعاؤں کے ہم بیٹی کو بھلا دے بھی کیا سکتے ہیں۔ ایسے میں کیا.......... آپ کے صاحب زادے اسے عزت کے ساتھ خوش رکھ سکیں گے؟"

نورالنساء بیگم نے آخری جملہ کہتے کہتے بدل دیا تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھیں کہ "ایسے میں کیا میری بیٹی کو طعنے نہیں سہنے پڑیں گے؟" لیکن کچھ سوچ کر انہوں نے جملہ بدل دیا۔

"جس انداز سے رمیز نے تمہاری بیٹی سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا ہے اس سے مجھے یقین ہے کہ وہ زندگی بھر اسے خوش رکھے گا۔ وہاں دوسرا اور کون ہے جو اسے کوئی دکھ دینے کی کوشش کرے گا؟ تمہاری بیٹی کا ساس سے پالا نہیں پڑے گا۔ وہ بے چاری تو ساس کہلانے کا زمانہ آنے سے برسوں پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔ میری کوئی بیٹی بھی نہیں ہے۔ میرا اپنا کوئی بھروسا نہیں ہے' پتا نہیں تم سے بات ختم کر کے گھر بھی واپس جا سکوں یا نہیں۔ جمیل شادی کرے گا تو بالکل الگ تھلگ رہے گا۔ دونوں بھائیوں کا ایک دوسرے کی زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اتنا بڑا گھر ہے کہ میرے دس بیٹے بھی ہوتے تو الگ تھلگ اپنی اپنی جگہ آرام سے رہ سکتے تھے۔ بس تم اپنی بیٹی کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دینا۔ میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے اور زندگی میں کبھی اسے یہ طعنہ نہیں ملے گا کہ وہ بھاری جہیز لے کر نہیں آئی تھی یا وہ کسی غریب گھرانے کی لڑکی ہے۔ اس کا اسے احساس بھی نہیں ہو گا۔ یہ میں وعدہ کرتا ہوں اور بولو؟ کیا اندیشہ ہے تمہیں؟"

"بس میرا دل ڈر رہا ہے۔" نورالنساء بولیں۔

"دل کو گولی مارو۔" سیٹھ سہیل تیزی سے بولے۔ "یہ دل بڑا دغاباز ہوتا ہے۔ اس کے کہنے پر زیادہ مت چلا کرو۔ مجھے دیکھو' کس عمر میں آکر یہ کم بخت دل میرا ساتھ چھوڑنے پر تلا ہوا ہے۔ بڑی مشکل سے بہلا پھسلا کر ساتھ چلاتے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جب سے میں نے اس کی بات زیادہ ماننی شروع کر دی ہے تب سے ہی یہ زیادہ نخرے دکھانے لگا ہے۔"

"مجھے ماہم سے بھی پوچھنا پڑے گا۔" نورالنساء بیگم بدستور متذبذب تھیں۔

"وہ بچی ہے' اسے منانا مشکل نہیں ہوگا۔ اصل مشکل تو میرے اور تمہارے جیسے بڈھے کھوسٹوں کی ہوتی ہے۔ وہ مان گئے تو سمجھو' مشکل حل ہو گئی۔ تمہاری بیٹی میرے سفید بالوں اور ڈوبتے دل کا کچھ تو خیال کرے گی۔ میں پہلے بھی انکار سننے کا عادی نہیں تھا' اب اس عمر میں تو بالکل نہیں رہا ہوں۔"

ماہم اپنے کمرے کے دروازے سے لگی سب باتیں سن رہی تھی۔ اس کا جسم کسی خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک عجیب دوراہے پر کھڑا محسوس کر رہی تھی۔ ایک راستے پر اندھیرے اس کے منتظر تھے اور دوسرے راستے پر کوئی اس کا ہاتھ تھامنے کے لئے ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کا دل اندھیرے راستے پر کہیں کھو گیا تھا اور عقل اسے دوسرے راستے کی طرف دھکیل رہی تھی۔ لرزتے وجود اور دھڑکتے دل کے ساتھ کھڑی وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کیا فیصلہ کرنا چاہیے؟

اس کی سانس گویا سینے میں اٹکنے لگی' وہ پلٹی اور دھم سے اپنے بیڈ پر آگری اور تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ باہر اس نے سیٹھ سہیل کی آواز سنی۔ "جاؤ' اپنی بیٹی سے پوچھ لو اور مجھے ابھی جواب دو' میں بار بار آنا افورڈ نہیں کر سکتا۔"

ماہم نے اپنے آنسو پونچھ لئے۔ چند لمحے بعد اس نے دروازے کے کھلنے کی آواز سنی۔ نورالنساء بیگم دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے قریب آکھڑی ہوئیں۔ چند لمحے کمرے میں گہرا سکوت رہا۔ ماہم نے تکیے میں ہی منہ چھپائے رکھا۔

بالآخر نورالنساء بیگم دھیمے لہجے میں بولیں "اگر ایسی کوئی بات تھی تو تم نے کم از کم

مجھے تو بتا دیا ہوتا بیٹی!"

تب ماہم کو سر اٹھانا پڑا۔ وہ بولی تو اس کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا۔ "آپ غلط سمجھ رہی ہیں امی! ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ رمیز سے چند دن پہلے تک تو شاید میری کبھی بات بھی نہیں ہوئی تھی بس انہوں نے مجھے دیکھا اور پسند کر لیا۔ میرا اس میں کیا قصور ہے؟"

نورالنساء بیگم نے گہری سانس لی۔ گویا اس جواب سے انہیں اطمینان ہوا ہو پھر وہ ملائمت سے بولیں۔ "سچی بات تو یہ ہے ماہم بیٹی.......... کہ میں تھوڑا سا ڈر ضرور رہی ہوں لیکن میں اس رشتے پر بہت خوش ہوں اور میری خواہش ہے کہ تم ہاں کردو۔ ویسے تو بیٹی کی شادی کہیں بھی کرو' یہ ایک جواء ہی ہوتا ہے۔ کسی بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی۔ بعض اوقات لڑکا' اس کا گھرانا اور سب لوگ بہت اچھے نظر آتے ہیں۔ ہر چیز آئیڈیل دکھائی دیتی ہے مگر شادی ناکام ہو جاتی ہے جبکہ بعض اوقات' بعض والدین بہت مجبوری کی حالت میں ڈرتے ڈرتے کسی نامناسب سی جگہ شادی کرتے ہیں مگر لڑکی کی زندگی سکھ سے گزرتی ہے' سب کچھ خود بخود ہی ٹھیک ہو جاتا ہے۔ یہ مقدروں کے سودے ہوتے ہیں۔ جب جواء ہی کھیلنا ہے تو پھر اونچی جگہ کھیلنے میں کیا حرج ہے؟"

ماہم نے ماں کا چہرہ دیکھا۔ اس پر امیدوں کے سائے لرز رہے تھے۔ اس نے چشم تصور سے سیٹھ سہیل کا چہرہ دیکھا۔ وہ بہت بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے اس دروازے پر آکر ایک غریب ماں بیٹی کو اعزاز بخشا تھا۔ اس نے چشم تصور سے رمیز کا چہرہ دیکھا۔ وہ نیک دل اور نیک خو معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ایک لٹی پٹی' تہی داماں لڑکی کو اتنے باعزت طریقے سے اپنانے کا فیصلہ کر کے بے شک بڑی جرأت' بڑے حوصلے کا ثبوت دیا تھا۔ کیا وہ مسلسل انکار کر کے عقل مندی کا ثبوت دے رہی ہے؟

فیصلہ کرنا اس کے لئے بہت مشکل تھا۔ خیالات بگولوں کی طرح اس کے دماغ میں چکرا رہے تھے۔ یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبنے لگا تھا کہ جمیل نے اسے بے وقوف بنایا تھا۔ محبت کا فریب دے کر اور شادی کے نام پر جمیل نے اسے دھوکا دیا تھا۔ وہ چوری چھپے شادی' چند لوگوں کی موجودگی میں نکاح' قاضی.......... کیا سب ڈرامہ تھا؟ اسے یقین

ہونے لگا تھا کہ وہ محبت کے جھانسے میں آکر جمیل کے ہاتھوں لٹ گئی تھی۔ اس معاملے کی تحقیق کے بعد ہی رمیز نے اپنے والد کو اس کے رشتے کے لئے بھیجا تھا۔

نورالنساء بیگم آہستگی سے بولیں۔ ”کیا تمہاری خاموشی کو میں تمہاری رضا مندی سمجھوں؟“

ماہم نے خود کو سنبھالا۔ دھندلی نظروں سے ماں کی طرف دیکھ کر گردن جھکالی۔ یکایک اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا اور بہت دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے سوچا کہ خلا میں معلق رہنے سے کم از کم کسی ایک طرف ہو جانا پھر بھی کچھ بہتر ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس کے دل سے کچھ بوجھ ضرور کم ہو گیا تھا۔

ماہم اپنے اس فیصلے کے بعد کئی دنوں تک گم صم رہی۔ رفتہ رفتہ اس کے دل کو قرار آہی گیا' وہ تن بہ تقدیر ہو گئی۔ اس نے سوچا مقدر کے لکھے کو بھلا کون ٹال سکتا ہے۔ جمیل سے زندگی کا بدترین دھوکا کھانے کے بعد ماہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا صنم خانہء دل پھر کبھی آباد ہو سکتا ہے۔ کسی کی محبت میں گرفتار ہونا تو درکنار' اسے تو یہ بھی امید نہیں تھی کہ وہ ظاہری طور پر ایک نارمل زندگی ہی گزار سکے گی مگر مری اور سوات وغیرہ میں سنوفال کے موسم میں ہنی مون گزار کر واپس آنے پر وہ یہ محسوس کر کے حیران رہ گئی کہ وہ رمیز سے محبت کرنے لگی ہے اور اس محبت میں اس سے کہیں زیادہ شدت تھی جس کا احساس اسے جمیل سے تعلق داری کے زمانے میں رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ محبت کے حقیقی مفہوم سے آشنا ہی اب ہوئی ہے۔ اس سے پہلے تو اس نے محض ایک گھناؤنے سراب کے سہارے روز و شب گزارے تھے۔

جمیل کی محبت میں ناکام ہونے اور اس حقیقت کے انکشاف کے بعد کہ جمیل نے اپنی ناپاک خواہشات کی تکمیل کے لئے ایک نہایت ہی گھناؤنی حرکت کی تھی' اس نے محبت جیسے آفاقی جذبے اور شادی جیسے مقدس بندھن کو آڑ بنا کر بدفطرتی کا مظاہرہ کیا تھا ماہم پر مایوسی' یاس اور افسردگی حملہ آور ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ دل پر لگے اس گھاؤ سے عمر بھر ٹیسیں اٹھتی رہیں گی لیکن رمیز کی رفاقت میں وہ جمیل کی زیادتی کو بھولنے لگی تھی۔ یہ سوچ کر اسے حیرت ہوتی کہ دل کی بستی ایک بار اجڑنے کے بعد پھر

آباد ہو سکتی ہے؟

شادی سے پہلے اسے جو اندیشے لاحق تھے' وہ بھی حقیقت کا روپ دھار کر اس کے سامنے نہیں آئے تھے۔ جمیل سے اسے اندیشہ تھا کہ وہ اس کی زندگی کو تلخ بنانے کی کوشش کرے گا اور رملہ کے بارے میں تو اسے یقین تھا کہ وہ اسے باقاعدہ بلیک میل کرے گی اور کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گی' مگر اس سلسلے میں بھی ماہم کو کچھ زیادہ پریشانی نہیں اٹھانی پڑی تھی۔ شاید یہ بھی رمیز ہی کا کمال تھا۔ شاید اسی نے ان دونوں کی زبانیں بند رکھنے کا کوئی بندوبست کیا تھا۔ شاید جمیل نے شکر ادا کیا ہو کہ ایک خواہ مخواہ کے بوجھ سے اس کی جان تو چھوٹی۔

شادی کی تقریبات کئی دن تک جاری رہی تھیں۔ بہت دھوم دھام سے شادی ہوئی تھی۔ مل اور کالونی کی تاریخ کی وہ سب سے بڑی تقریب تھی۔ اس دوران میں جمیل سے ماہم کا صرف ایک مرتبہ سامنا ہوا تھا۔ ولیمے والے دن وہ اسے منہ دکھائی دینے آیا تھا۔ ایک نئی گاڑی کی چابیاں اس نے ماہم کو پیش کی تھیں اور موقع پا کر طنزیہ انداز میں بولا تھا۔

”یہ منہ تو میرا کئی بار کا دیکھا ہوا ہے۔ بہرحال رسم دنیا ہے.........“

ماہم نے اس کی بات کاٹ کر دھیمے ہی لہجے میں کہا تھا۔ ”لیکن افسوس کہ میں تمہارا اصل چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی۔ شیطان ایسے ہی تو روپ بدل کر دھوکا دیتا ہے۔“

جمیل کے چہرے پر ایک رنگ سا لہرا گیا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”ویسے تم نے بدلہ خوب لیا ہے مجھ سے' میرا جھوٹا میرے ہی خاندان کو کھلا دیا۔“

ماہم نے تڑپ کر کوئی جواب دینا چاہا تھا مگر وہ جلدی سے اس کے پاس سے کھسک گیا تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

رملہ نے بھی طنز کا ایسا ہی تیر چلایا تھا۔ وہ تو اس رات ہی اسے دیکھنے آئی تھی جب ماہم رخصتی کے بعد سسرال پہنچی تھی۔ اس نے تحفے میں سونے کے کنگن پیش کیے اور زہریلے لہجے میں سرگوشی میں کہا تھا۔ ”بھئی مان گئے تمہیں' بہت اچھی رہیں تم! ایک بھائی کی داشتہ رہیں دوسرے سے بیاہ رچالیا۔“

ماہم کا دل لہو لہان ہو گیا تھا۔ وہ بھاری بھر کم عروسی لباس میں تھی۔ یکبارگی اس کا

دل چاہا کہ رملہ کا منہ نوچ لے مگر وہ صرف زخمی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی نئی زندگی میں پہلے ہی دن سے زہر گھل جائے۔ اس نے صبر کا دامن تھام لیا اور دل ہی دل میں یہ عہد کیا کہ وہ صرف اس وقت بولے گی جب پانی سر سے گزر جائے گا۔

اس کے پاس جو تحائف اور نقد منہ دکھائی وغیرہ جمع ہوئی تھی، اس نے کچھ بھی اپنے پاس نہیں رکھا اور جمیل کی دی ہوئی گاڑی کی چابیاں اور رملہ کے دیئے ہوئے کنگن تو اس نے خاص طور پر رمیز کے حوالے کردیئے تھے کہ وہ انہیں استعمال کرنا تو درکنار، ایک دن کے لئے بھی اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتی تھی........ اور اگر رمیز چاہے تو انہیں واپس بھی دے سکتا ہے۔ بہرحال اس کے بعد........ اس نے پلٹ کر رمیز سے پوچھا نہیں تھا کہ اس نے ان کا کیا کیا اور نہ ہی رمیز نے خود کوئی ذکر کیا۔

تیسرے روز وہ ہنی مون پر چلے گئے تھے۔ پورا ایک ماہ گھر سے باہر گزرا۔ وہ ایک ماہ گویا ماہم کے لئے خوشیوں کا ایک ایسا خزانہ لے کر آیا تھا جو اسے سرتاپا شرابور کر گیا۔ اس دوران میں ماضی کی تمام تلخ یادیں اس کے ذہن سے محو ہوگئیں۔ جیسے خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

وہ واپس آئے تو جمیل کسی پارٹی سے معاملات طے کرنے لندن چلا گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں رملہ سے بھی ماہم کا سامنا نہیں ہوا، اور یوں روز و شب پُرسکون ہی رہے۔ اتنے عرصے میں ماہم کے لئے گویا ایک نئی دنیا تعمیر ہوگئی تھی اور اس سے مانوس بھی ہوگئی تھی۔ پہلے پہل تو اس پر خوف ہی چھایا رہا تھا مگر اب وہ رفتہ رفتہ اس نئی زندگی سے لطف اندوز بھی ہونے لگی تھی۔

رمیز نے سچ مچ سب کچھ بھلا دیا تھا۔ ماہم کو ہرگز امید نہیں تھی کہ رمیز جو محض ایک اخلاقی فریضے کے انداز میں اس سے شادی کر رہا ہے، اسے اتنی محبت دے گا اور اتنی گرم جوشی کا مظاہرہ کرے گا لیکن جوں جوں دن گزرتے رہے، رمیز کی شخصیت گویا پرت در پرت کھلتی چلی گئی اور وہ ماہم کو پہلے سے زیادہ اچھا لگنے لگا۔ وہ خوشبو کی طرح اس کی روح میں آن بسا تھا۔ یہ کچھ عجیب سا عشق تھا جو شادی کے بعد شروع ہوا تھا۔

ایک شام وہ اپنے گھر بھی گئی۔ اس کی ماں اسے گلے لگا کر خوب روئی۔ ماہم کی آنکھیں بھی بھر آئیں اور وہ حیرت سے سوچتی رہی۔ ”ہم عورتیں بھی عجیب ہوتی ہیں، خوشی کے موقع پر بھی روتی ہیں اور غم کے موقع پر بھی آنسو بہاتی ہیں۔“

اس وقت بابر بھی کھانے کی میز پر موجود تھا اور اس کی امی کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ ماہم ماں سے مل کر اس کی طرف متوجہ ہوئی اور آنکھیں خشک کرتے ہوئے بولی ”کیسے ہو بابر؟“

بابر نے قہر آلود نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور کپ میز پر پٹخ کر کوئی جواب دیے بغیر اٹھ کر چلا گیا۔ ماہم حیران رہ گئی۔ وہ بابر کے اس رویے کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

”اسے کیا ہوا امی؟“ اس نے پوچھا۔

”معلوم نہیں بیٹی! جب سے تمہاری شادی ہوئی ہے، اس کا رویہ ناقابلِ برداشت سا ہو گیا ہے۔

”مگر کیوں امی!“ ماہم کی حیرت دوچند ہوگئی۔

”بس ایسے ہی، خواہ مخواہ ہر وقت جلی کٹی باتیں کرتا رہتا ہے۔ موقع ملے تو طنز کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ وہ ظاہر یہ کرتا ہے جیسے ہم نے اس کے ساتھ کوئی بہت بڑا دھوکہ کر الا ہے۔“ نور النساء بیگم دکھی سے لہجے میں بولیں ”یہ یہاں رہنے سہنے اور کھانے پینے کا ر تھوڑا بہت خرچہ دیتا ہے اس سے گھر کو کچھ سہارا مل جاتا ہے۔ اگر مجھے اس کا لالچ نہ تا اور گھر چلانے کی مجبوری نہ ہوتی تو اسے اب تک جواب دے ہی چکی ہوتی کہ اپنے ہنے کا کہیں اور بندوبست کرے۔“

”لیکن میری شادی سے اس کے ناراض ہونے کی بھلا کیا تک ہے امی؟“ ماہم حیرانی ے بولی۔ ”میرے اس سے کوئی عہد و پیمان تو نہیں تھے۔ میں نے تو اسے کبھی اشارہ تک ں دیا کہ میں اس کی ذات میں کوئی دلچسپی رکھتی ہوں۔“

”میں خود حیران ہوں، میں نے بھی کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی۔ میرے دل میں یہ ت ضرور تھی کہ اگر تمہاری شادی اس سے ہو گئی تو اچھا ہی ہو گا، گھر کی بات گھر ہی میں ٹ جائے گی۔ ہم غریب لوگ ہیں، وہ بھی کچھ ایسا آسودہ حال نہیں۔ ہماری نبھ جائے گی،

لیکن تمہارا اس کے ساتھ سنجوگ نہیں تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے منہ سے بات نہیں نکالی تھی ورنہ یہ تو شاید جان کو آجاتا۔ خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ ایک روز تو بڑے غصے میں مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ماہم کی شادی کے سلسلے میں مجھ سے مشورہ کیوں نہیں لیا گیا۔"

ماہم کو ایک دم غصہ آگیا۔ "میں ابھی اس کا دماغ درست کرتی ہوں‘ وہ کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو.........."

"جانے دو بیٹی۔" نورالنساء بیگم نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "بے وقوف ہے وہ‘ بعد میں اس نے معافی مانگ لی تھی۔"

ماہم نے ماں کے سمجھانے پر بابر سے بات نہیں کی تھی۔ پھر وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"آپ خرچ وغیرہ کی فکر نہ کریں امی! اگر بابر آپ کے ذہن پر بوجھ بنتا ہے تو اسے جانے کے لئے کہہ دیں۔ آپ کو کوئی تنگی نہیں ہوگی۔ میں سب انتظام کردوں گی۔ رمیز بھی یہی چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ ہی آرام و آسائش سے رہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ سیٹھ سہیل کی سمدھن مزدوروں کی کالونی کے ایک کوارٹر میں رہے۔"

"نہیں بیٹی‘ یہ مجھ سے ہرگز نہیں ہوگا۔" نورالنساء تڑپ کر بولیں.......... "تمہیں اپنے حالات بتانے کا خدانخواستہ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ اللہ نے جہاں اتنی مشکل گھڑیاں گزار دی ہیں‘ وہاں زندگی کے بچے کھچے دن بھی گزر ہی جائیں گے۔ تمہاری ذمہ داری سے سرخرو ہو جانے کے بعد تو اب میں ویسے بھی اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتی ہوں۔ ضرورت پڑی تو میں دوبارہ جا کر مل میں مزدوری کرلوں گی۔ شادی کے بعد مائیں‘ بیٹیوں کے در پہ پڑی کوئی اچھی نہیں لگتی ہیں۔"

"مائیں داماووں کی ملوں میں مزدوری کرتی بھی تو اچھی نہیں لگ سکتیں امی!" ماہم ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ "آپ یہ پرانے زمانے کی باتیں جانے دیجئے۔"

"اچھا خیر‘ فی الحال یہ باتیں جانے دے۔ ابھی تو تیری شادی کو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ جو خدا کو منظور ہوگا‘ وہ ہو جائے گا۔ یہ بتا.......... تو وہاں خوش تو ہے نا؟

سچی بات بتانا‘ بیٹیوں کی روایات کے مطابق بھرم رکھنے کی کوشش نہ کرنا۔" ماں نے والہانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ قدرے سادہ سے حلئے میں تھی‘ مگر دولت کی خوشبو اتنے تھوڑے سے ہی دنوں میں اس کے وجود میں رچ بس گئی تھی۔ باہر بڑی سی گاڑی اس کے انتظار میں کھڑی تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر باوردی ڈرائیور موجود تھا۔

"میں بہت خوش ہوں امی! بلکہ مجھے شاید معلوم ہی اب ہوا ہے کہ خوشی کسے کہتے ہیں۔" وہ سر جھکا کر بولی۔ اس کے چہرے کی دمک نے ماں کو بتا دیا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی ہے۔

"اللہ تجھے ہمیشہ اسی طرح خوش رکھے بیٹی!" نورالنساء بیگم نہال ہو کر بولیں۔

"آج میں آپ کے ساتھ کھانا کھا کر واپس جاؤں گی۔" ماہم نے کہا۔

"کیوں نہیں بیٹی!" نورالنساء بیگم نے کہا۔ "آج میں تیرے لئے مٹر پلاؤ پکاؤں گی‘ تو بڑے شوق سے کھاتی ہے نا!"

"نہیں امی‘ کھانا میں خود پکاؤں گی۔" ماہم نے کہا۔

"اچھا‘ جیسے تیری خوشی۔" نورالنساء نے پیار سے اس کے بال سنوارتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "کیا کھانے پر رمیز تیرا انتظار نہیں کرے گا؟"

"وہ ایک کاروباری تقریب میں گئے ہیں۔ وہاں سے ڈنر کر کے آئیں گے۔" ماہم نے کہا۔ "میں نے ان سے اجازت لے لی تھی کہ آج میں امی سے ملنے جاؤں گی اور ان کے ساتھ کھانا کھا کر لوٹوں گی۔"

"یہ بہت اچھا کیا تو نے۔" نورالنساء بیگم نے کہا۔ "آ‘ بیٹھ‘ کھانے میں ابھی بہت وقت ہے۔"

ابھی وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھی ہی تھیں کہ بابر نے اپنے کمرے میں ٹیپ ریکارڈر پر کیسٹ لگا دی اور خاصی بلند آواز میں گانا گونجنے لگا۔

دل تجھے دیا تھا رکھنے کو‘ تو نے دل کو جلا کر رکھ دیا۔

نورالنساء ایک لمحے خاموشی سے ماہم کی طرف دیکھتی رہیں پھر افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔ "تجھے سنا رہا ہے۔"

"وہ تو میں سمجھ رہی ہوں۔" ماہم ناگواری سے سر ہلا کر بولی۔ "میں تو اسے معقول آدمی سمجھتی تھی مگر یہ تو عجیب چیز نکلا۔ رمیز کی رائے بھی اس کے بارے میں اچھی نہیں ہے۔ وہ بتا رہے تھے کہ مل میں بھی اس نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ خوش قسمتی سے اپنی چرب زبانی کی وجہ سے یونین کا صدر کیا منتخب ہو گیا ہے کسی کو چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا۔ برسوں سے مل کا جو ماحول اتنا پرسکون چلا آ رہا تھا، وہاں اس نے ہلچل مچا رکھی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ کسی کو بھی صحیح طرح پتہ نہیں چلتا کہ آخر یہ چاہتا کیا ہے۔"

وہ زیادہ دیر باتیں نہ کر سکیں کیونکہ گلی محلے........ کی عورتیں قطار در قطار اسے دیکھنے، اس سے ملنے کے لئے آنے لگیں اور ذرا سی دیر میں گھر بھر گیا۔ کل تک وہ ان سب کے درمیان رہتی تھی مگر آج وہ اسے یوں دیکھنے آ رہی تھیں جیسے وہ کسی اور دنیا کی مخلوق ہو۔

☆=========☆=========☆

ماہم کی سسرال میں افراد صرف چار ہی تھے لیکن بنگلہ بہت بڑا تھا اور سب کے معمولات اور طرز زندگی اتنا مختلف تھا کہ کبھی تو ہفتوں ان کا ایک دوسرے سے سامنا نہیں ہوتا تھا۔ کبھی تو ماہم کو لگتا جیسے گھر میں صرف وہ اور رمیز ہی رہتے ہیں یا پھر نوکر چاکر۔

جمیل سے اس کا سامنا شاذ و نادر ہی ہوتا اور ابتدا میں وہ ریزرو ہی رہا۔ اس نے کوئی اوچھی حرکت نہیں کی۔ ماضی کا کوئی حوالہ دینے کی کوشش نہیں کی لیکن اس دن لندن سے واپس آنے کے بعد جب ایک مرتبہ ماہم کا اس سے سامنا ہوا تو اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ ماہم کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

ماہم اس وقت اوپر جانے کے لئے ہال سے گزر رہی تھی اور وہ باہر سے آ رہا تھا۔ ماہم اسے نظرانداز کرتے ہوئے اس کے قریب سے گزری کہ اچانک جمیل نے بازو پھیلا کر اس کا راستہ روک لیا۔

ماہم نے قہر آلود نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی ڈھٹائی سے مسکراتا ہوا بڑی معنی خیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

☆=========☆=========☆

عالیہ اپنے خوبصورت، آراستہ و پیراستہ، ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں پہنچی تو اس کی میز پر چند اشتہاروں کے مضامین رکھے تھے، جنہیں "کاپی" کہا جاتا ہے۔ اس کے آنے سے پہلے زیادہ تر اشتہاروں کے آئیڈیاز کاپی رائٹر کے اپنے ہوتے تھے یا ہمایوں سرور کے، کاپی تیار ہونے کے بعد ہمایوں اور آر ڈی صاحب اسے چیک کرتے تھے اور فائنل مضمون اور لے آؤٹ وغیرہ تیار ہونے کے بعد اسے کلائنٹ کو دکھانے کے لئے بھیجا جاتا تھا۔

لیکن اب ہر مرحلے پر عالیہ سے بھی مشورہ لیا جانے لگا تھا۔ اخبارات اور رسائل کے لئے تو اسی مختصر سے عرصے میں اس نے ایک اشتہار بغیر کاپی رائٹر کی مدد سے لکھ ڈالا اور وہ جوں کا توں منظور بھی ہو گیا تھا۔ کلائنٹ نے اسے بہت پسند کیا تھا اور فرمائش بھجوائی تھی کہ جس کسی نے بھی وہ اشتہار لکھا ہے، اس کے آئندہ اشتہار بھی وہی لکھا کرے۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ سب کچھ کر لینا بہت بڑی کامیابی تھی۔ آر ڈی صاحب یونہی بلاوجہ اس پر مہربان نہیں تھے اور محض اس کا دل رکھنے کو اس کی بات نہیں مانتے تھے بلکہ اس کی بات ماننے میں انہیں فائدہ نظر آتا تھا۔ شاید وہ عالیہ کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کا اندازہ کر چکے تھے۔

ملازمت کے ان چند دنوں میں ہمایوں سرور سے بارہا اس کا سامنا ہوا تھا۔ کبھی کانفرنس روم میں، کبھی لائبریری میں، کبھی آر ڈی صاحب کے کمرے میں اور ایک بار وہ ایک اشتہار کے بارے میں تبادلہ خیال کرنے اس کے کمرے میں بھی آیا تھا۔

ہر بار وہ اس سے خوش دلی سے گفتگو کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے انداز میں کچھ ایسا اعتماد........ ہوتا تھا جیسے کوئی بھی لڑکی اس کی کسی بات کو نظرانداز کر ہی نہ سکتی ہو اور نہ ہی کوئی لڑکی اس سے بے رخی یا سرد مہری سے پیش آنے کا تصور کر سکتی ہو لیکن اس وقت غالبًا سے حیرت کا خاصا شدید جھٹکا لگتا تھا جب عالیہ ہر بار اس کی بات کا جواب نہایت رکھائی اور اختصار سے دیتی تھی۔ وہ پرخیال انداز میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ جاتا تھا۔

پہلے پہل تو اس نے غالبًا یہی سمجھا کہ عالیہ کی اس رکھائی کی وجہ صرف اجنبیت ہے

اور وہ جلد بے تکلف ہونے والے لوگوں میں سے نہیں ہے لیکن کئی دن بعد بھی جب عالیہ کے لہجے میں ذرا سی نرمی بھی نہ آئی تو وہ جیسے چوکنا سا ہو گیا۔ اب وہ خواہ مخواہ اس سے مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ تاہم جب بھی اس سے سامنا ہوتا' عالیہ محسوس کرتی کہ ہمایوں کی نظریں دور تک اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ تاہم اب وہ اشد ضرورت کے تحت ہی اسے مخاطب کرتا تھا اور بات کرنے کے دوران میں اس کی پیشانی پر شکنیں ابھری رہتی تھیں۔ جیسے وہ عالیہ کی آنکھوں میں جھانک کر اس کا ذہن پڑھنا چاہتا ہو۔ لیکن عالیہ کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ ہمایوں کو اس کی آنکھوں میں دھندلکوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔

دفتر میں عالیہ کے علاوہ چار لڑکیاں تھیں۔ ایک ریسپشنسٹ' ایک کاپی رائٹر' ایک کلائنٹ سروس منیجر اور ایک آرڈی صاحب کی سیکرٹری اور ان چاروں سے ہمایوں سرور کی بے تکلفی تھی۔ وہ کسی کو بھی لنچ پر قریبی اسنیک بار تک چلنے کی دعوت دیتا تو وہ فوراً خوشی خوشی تیار ہو جاتی۔ ریسپشنسٹ لڑکی جو ٹیلی فون آپریٹر کے فرائض بھی انجام دیتی تھی بہانے بہانے سے خود ہمایوں کو فون کرتی رہتی تھی اور خاصی دیر تک دونوں میں ہنسی مذاق چلتا رہتا۔ آرڈی صاحب کی سیکرٹری سے البتہ ہمایوں' آرڈی صاحب کی موجودگی میں ہنسی مذاق نہیں کرتا تھا۔

چاروں لڑکیاں پڑھی لکھی اور خوش لباس تھیں۔ شکلیں بھی بری نہیں تھیں.......... بلکہ وہ لڑکی جو کلائنٹ سروس کے شعبے میں تھی' اسے تو اچھی خاصی خوب صورت لڑکیوں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ وہ تو ہمایوں سرور سے اچھی خاصی متاثر معلوم ہوتی تھی۔ عالیہ نے یہ سب باتیں چند دن میں ہی محسوس کر لی تھیں۔

.... اور اب عالیہ نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ جب سے وہ کمپنی میں آئی تھی ہمایوں کی پوری توجہ گویا اسی کی طرف مبذول ہو کر رہ گئی تھی۔ ان چاروں لڑکیوں سے اس کی دوستی اور ہنسی مذاق کم ہوتا جا رہا تھا لیکن انہوں نے غالباً ابھی اس تبدیلی کو محسوس نہیں کیا تھا۔ جبکہ عالیہ تو اب گویا ہر تاثر' ہر جذبے اور ہر تبدیلی کی مہک فضا میں ہی محسوس کر لیتی تھی۔

گذشتہ چند دنوں میں اپنی زندگی میں آنے والے ان انقلابات کے بارے میں سوچتے ہوئے اس نے اشتہاروں کے مضامین دیکھنا شروع کئے جو اس کی میز پر رکھے تھے۔ اس نے ان میں کچھ ترامیم کیں اور انہیں چپڑاسی کے ہاتھ آرڈی صاحب کے کمرے میں بھجوا دیا۔

چپڑاسی واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں عالیہ کی مطلوبہ فائل تھی۔ عالیہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ فائل لی اور تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک کر حتی الامکان یکسوئی کے ساتھ اس کے مطالعے میں لگ گئی۔ فائل میں صدیقی صاحب کے پلانٹ' اسٹاف' سرمائے اور پبلسٹی سے متعلق تمام تفصیلات موجود تھیں اور کاروباری لحاظ سے یہ ایک کانفیڈینشل فائل تھی۔

وہ اس کے مطالعے میں ایسی منہمک ہوئی کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا۔ خشک قسم کے اعداد و شمار کا مطالعہ وہ اتنی توجہ اور دلچسپی سے کر رہی تھی جیسے کوئی نہایت شاندار اور سسپنس سے بھرپور ناول یا افسانہ پڑھ رہی ہو۔ کیلکولیٹر اس نے پاس رکھا ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ الگ کاغذوں پر کچھ حساب کتاب بھی کرتی جا رہی تھی۔

وہ اس وقت چونکی جب ڈرائیور نے دروازے پر دستک دی۔ اب کمپنی کی گاڑی اسے گھر سے لینے اور چھوڑنے جاتی تھی۔ عالیہ نے فائل بند کی' کیلکولیٹر اور کاغذات اپنے پرس میں ڈالے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ باقی غور و خوض اسے گھر پر کرنا تھا اور اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ صدیقی صاحب کے لئے پلان ضرور تیار کرے گی۔ خواہ اس کے لئے اسے ساری رات جاگنا پڑے۔

☆==========☆==========☆

عالیہ' والد کے ساتھ کھانا کھا کر اور انہیں دوائی دینے کے بعد اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے رات نو بجے سے صدیقی صاحب کے کاروباری پلان کی تیاری کے سلسلے میں کام شروع کر دیا۔ وہ بڑے انہماک اور نہایت باریک بینی سے فائل کے اندراجات کا مطالعہ کرتی رہی۔ ساتھ ساتھ اہم پوائنٹ ایک رف پیڈ پر نوٹ کرتی رہی۔ فائل میں ہمایوں سرور کے مشورے اور آئیڈیاز بھی تحریری شکل میں موجود تھے جو کئی

صفحات پر مشتمل تھے۔ وہ صفحات اس فائل میں الگ سے پنچ کر کے شامل کیے گئے تھے لیکن عالیہ انہیں ایک نظر دیکھتی اور مسترد کر کے الگ رکھتی گئی۔ وہ ہمایوں سرور کے کسی بھی آئیڈے پر پلان مرتب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس پلان کا مکمل کریڈٹ خود لینا چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ کل لنچ کے بعد صدیقی صاحب کے سامنے جو پلان پیش کرے وہ خالص اس کا اپنا ہو۔

وہ رات بھر کاغذات میں سرکھپاتی رہی۔ بالآخر وہ جب ایک مکمل پلان کو حتمی شکل دے چکی تو رات رخصت ہو چکی تھی۔ رف پیڈ کے کئی صفحات اعداد و شمار سے بھر چکے تھے۔ اسے رات بھر ایک پل بھی سونے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن اس نے سوچا کہ کامیابی کی منزلوں تک پہنچنے کے لئے اسے کئی راتیں جاگ کر گزارنی پڑیں گی۔ ابھی تو ابتدا ہے۔ یہ پہلی رات تھی جو اس نے اپنے مقصد اور اپنی صلاحیتوں کے ذریعے خود کو منوانے کے لئے قربان کر دی تھی۔

عالیہ نے کاغذات سمیٹے اور ترتیب سے فائل میں رکھنے کے بعد غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے لباس کا انتخاب بھی سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ ناشتہ وغیرہ کر کے جب وہ دفتر جانے کے لئے روانہ ہوئی تو اس کے چہرے پر رات بھر کی بے آرامی یا کسل مندی کے آثار بالکل نہیں تھے بلکہ اس کے چہرے سے یقین اور عزم کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

☆==========☆==========☆

لنچ کے بعد صدیقی صاحب، عالیہ اور میڈیا منیجر شکیل احمد اٹھ کر کانفرنس روم میں آ گئے۔ عالیہ اس روز اونچی ایڑی کے غیر ملکی سینڈلوں، اورنج کلر کے ایک انتہائی خوب صورت تراش خراش کے کافتان اور بالوں کے اونچے سے جوڑے کے ساتھ نہایت پُرکشش اور پُروقار نظر آ رہی تھی۔ اس کی چال ڈھال، گفتگو اور حرکات و سکنات میں ایک ٹھہراؤ اور وقار تھا۔ گو کہ اس کا دل معمول سے کچھ زیادہ تیزی سے دھڑک رہا تھا مگر دیکھنے میں وہ بڑی متین، بردبار اور سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

صدیقی صاحب سے جب اس کا تعارف کرایا گیا تو انہوں نے ستائشی نظروں سے اس

کا سرتاپا جائزہ لیا تھا تاہم ان کا انداز سطحی لوگوں جیسا نہیں تھا۔ وہ ان کم یاب سلجھے ہوئے دولت مندوں میں سے معلوم ہوتے تھے جو ہر خوب صورت چیز کو ستائش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ خاصی بڑی عمر کے آدمی تھے۔ سر پر بال ایک جھالر کی صورت میں باقی تھے اور وہ بھی تقریباً سارے ہی سفید تھے۔

وہ تینوں کانفرنس روم میں نشستیں سنبھال چکے تو چپڑاسی نے تمام مطلوبہ فائلیں اور کاغذات لا کر عالیہ کے سامنے رکھ دیئے۔

عالیہ نے بلا تمہید بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ "صدیقی صاحب! ان فائلوں کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ آپ اپنی پروڈکٹ کو چلانے کے لئے ہر حربہ استعمال کر چکے ہیں۔ اگر آپ کو میری دیانت دارانہ رائے درکار ہے تو میں یہ کہوں گی کہ اب کوئی بھی نئی تدابیر اس پروڈکٹ کو چلانے کے لئے کارگر ثابت نہیں ہو سکتیں۔"

میڈیا منیجر شکیل احمد اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گئے۔ وہ سمجھ نہیں پائے تھے کہ مس عالیہ کہنا کیا چاہتی ہیں۔ بظاہر اس کی بات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کلائنٹ کو خبردار کر رہی ہے کہ کمپنی اس کے لئے مزید کچھ نہیں کر سکتی۔ انہیں افسوس ہونے لگا کہ آر ڈی صاحب نے ایک نئی اور ناتجربے کار لڑکی کو ایسا اہم پلان سونپ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔

صدیقی صاحب کے خیالات بھی کچھ اس سے مختلف نہیں تھے۔ انہیں یقین ہونے لگا کہ کمپنی ان کے ڈوبتے ہوئے کاروبار کو نہیں بچا سکتی۔ بلاشبہ کمپنی نے اور کمپنی کے ایک اہم دماغ ہمایوں سرور نے بہت کوششیں کی تھیں لیکن اپنی تمام کوششوں کے باوجود ان کے مسلسل نقصان میں کمی نہیں لا سکے تھے۔

"صدیقی صاحب!" عالیہ نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ "اگر ہمیں صرف اپنے فائدے سے غرض ہو تو ہم آپ کو پبلسٹی کی نئی مہمات تیار کر کے دیتے رہیں اور آپ ان میں روپیہ جھونکتے رہیں لیکن ہماری کمپنی محض اپنے فائدے کو مدِ نظر رکھ کر کلائنٹ کا نقصان بھی برداشت نہیں کر سکتی۔"

عالیہ بہت ٹھہر ٹھہر کر نپے تلے انداز میں بول رہی تھی۔ آج کی میٹنگ ہمایوں سرور اور صدیقی صاحب کے درمیان ہونی تھی۔ اب صدیقی صاحب اس بات کو بھی سمجھ گئے

تھے کہ پروگرام میں تبدیلی کی وجہ صرف یہی تھی کہ ہمایوں سرور اس سلسلے میں ناکام ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے اور ان کے سامنے خفت اٹھانے سے بچنے کے لئے ان کی میٹنگ اس خاتون سے رکھ دی.......... تھی کہ وہ ان سے اس سلسلے میں معذرت کرلیں۔ صدیقی صاحب ایک گہری سانس لے کر رہ گئے۔

"اگر آپ کو ہمدردانہ اور مخلصانہ مشورہ چاہئے تو میں کچھ اور عرض کروں۔" عالیہ نے کہا۔

"ہمدردانہ اور مخلصانہ مشورے کی ہی تلاش میں تو بھٹک رہا ہوں۔" صدیقی صاحب افسردہ سے انداز میں مسکرائے۔ "ایک تو میرا کاروبار ڈوب رہا ہے' اوپر سے اسے سنبھالا دینے کے چکر میں لوگ مجھ سے لاکھوں روپیہ خرچ کروا چکے ہیں۔ مختلف شکلوں میں مجھ سے رقمیں اینٹھ چکے ہیں۔ درحقیقت کاروبار میری فیلڈ ہی نہیں تھی۔ میں تو بنیادی طور پر زمین دار ہوں۔ میری زمینوں میں سیم کے پانی کی سطح اونچی ہونے لگی تھی تو میں نے اچانک ہی فیصلہ کرلیا کہ اس سے پہلے کہ زمینیں بالکل بیکار ہو جائیں انہیں بیچ کر کاروبار کی فیلڈ میں آجاؤں لیکن یہاں میں نے بدقسمتی سے غلط کام میں ہاتھ ڈال دیا۔"

"کاروبار کوئی بھی غلط نہیں ہوتا صدیقی صاحب!" عالیہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ گویا وہ کوئی بہت پرانی اور تجربے کار بزنس وومن ہو۔ "بس کبھی کبھی آدمی کا مقدر اس کا ساتھ نہیں دیتا اور بعض اوقات اس سے کچھ غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ وقت کا انتخاب صحیح نہیں ہوتا یا کوئی اور بات ہوتی ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے۔" صدیقی صاحب تھوڑی کھجاتے ہوئے بولے۔ "بہرحال' اب یہ کاروبار میری انا کا مسئلہ بن گیا ہے۔ بنیادی طور پر تو میں اب بھی زمین دار ہی ہوں نا' انا پرست اور اڑیل۔ میں اب کشتیاں جلا چکا ہوں۔ میرے پاس کچھ جمع پونجی موجود ہے۔ میں اب ایک آخری داؤ کھیلنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کی کمپنی اس سلسلے میں میری مدد نہیں کر سکتی تو مجھے کچھ اور سوچنا پڑے گا کچھ اور رابطوں کا سہارا لینا پڑے گا.......... بہرحال میں اب اس کاروبار سے کسی بھی صورت میں دستبردار نہیں ہونا چاہتا۔ چاہے.........."

"یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ کمپنی آپ کی مدد نہیں کر سکتی؟" عالیہ کے لہجے میں

معمولی سی حیرت تھی۔

"یہ میں نے آپ کی گفتگو سے اندازہ لگایا ہے۔"

"آپ کا اندازہ درست نہیں ہے صدیقی صاحب!" عالیہ نے کہا۔ "ہماری یہ میٹنگ آپ کے کاروبار کو نقصان سے بچانے کے سلسلے میں ہی ہو رہی ہے۔ آپ بلاشبہ لاکھوں روپے کا نقصان اٹھا چکے ہیں اور پبلسٹی پر بھی خاصی رقم خرچ کر چکے ہیں۔ میں آپ کو ان نقصانات سے محفوظ رہنے کے لئے چند مشورے دینا چاہتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا نقصان میں چلنے والا کاروبار فائدہ دینے لگے گا۔"

"آپ مجھے بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟" صدیقی صاحب کے لہجے میں اچانک دلچسپی آگئی۔ "شاید میں آنکھیں بند کر کے اس پر عمل کر گزروں۔"

تقدیر کی اس ستم ظریفی پر ایک لمحے کے لئے عالیہ کا ہنسنے کو دل چاہا کہ ایک جہاں دیدہ اور دولت مند آدمی بیٹھا ایک ایسی لڑکی سے ایک بڑے کاروبار کے بارے میں مشورہ طلب کر رہا ہے جس نے زندگی میں کبھی کاروبار کرنا تو درکنار کبھی کوئی بڑی رقم بھی نہیں دیکھی تھی۔

وہ سنبھل کر بولی۔ "آپ کے لئے میرا پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ اپنی پروڈکٹ کا نام.......... پیکنگ کا ڈیزائن غرضیکہ ہر چیز بدل دیں۔"

صدیقی صاحب تقریباً اچھل پڑے۔ میڈیا منیجر بھی اس بات پر بری طرح چونکا تھا لیکن عالیہ نے انہیں بولنے کا موقع دیئے بغیر بات جاری رکھی۔ "مجھے اعتراف ہے کہ کاروبار کے میدان میں میرا کوئی ذاتی تجربہ نہیں لیکن اس ضمن میں میرا مطالعہ اور مشاہدہ خاصا گہرا ہے۔ میرا خیال ہے کسی فلاپ پروڈکٹ کو چلانا کسی نئی پروڈکٹ کو چلانے سے زیادہ مشکل ہے۔ آپ اب اپنی پروڈکٹ کو ایک بالکل نئی پروڈکٹ کے طور پر مارکیٹ میں لائیں۔ مقابلہ خواہ کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو' لیکن لوگ ایک بار نئی پروڈکٹ کو آزماتے ضرور ہیں اور اگر اس کی پبلسٹی کے ساتھ اس کی کوالٹی بھی بہتر بنائی جائے تو پھر وہ اس کے مستقل گاہک بھی بن جاتے ہیں۔"

بات کافی حد تک صدیقی صاحب کی سمجھ میں آگئی تھی اور شاید دل کو بھی لگی تھی

تاہم وہ قدرے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولے۔ "لیکن میرے پاس لاکھوں پیکٹ اور دوسری چیزیں چھپی پڑی ہیں' وہ سب بیکار ہو جائیں گی۔"

"میں نے ان کی قیمت نکالی ہے۔" عالیہ نے چند کاغذات ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے کسی پہلو کو نظرانداز نہیں کیا۔ اس وقت آپ کو چالیس ہزار روپے روزانہ نقصان ہو رہا ہے۔ آپ سمجھ لیجئے گا کہ آپ کو تین چار دن اور نقصان ہو گیا' لیکن یہ میں آپ کو بتا دوں کہ آپ کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آپ ایک نئی پروڈکٹ مارکیٹ میں لائیں ورنہ یہ بزنس ایسا ہے کہ آپ کا دو کروڑ روپے کا پلانٹ محض لوہے کا ڈھیر بن کر رہ جائے گا۔ اس کی کوئی ری سیل ویلیو نہیں ہوگی۔"

"ہوں!" صدیقی صاحب نے پُرخیال انداز میں ہنکارا بھرا۔

"اور آپ نئے نام سے جو دودھ مارکیٹ میں لائیں گے اس کی پبلسٹی کی مہم میں تیار کروں گی۔ اس دودھ کی زیادہ تر خریدار عورتیں یا سہل پسند لوگ ہوتے ہیں اور ایک عورت بہتر طور پر جان سکتی ہے کہ انہیں کن پوائنٹس کی مدد سے زیادہ قائل کیا جاسکتا ہے۔" عالیہ نے پُراعتماد لہجے میں بات جاری رکھی۔ "اگر آپ کو یہاں تک میری بات نے کچھ اپیل کیا ہے تو ہم آگے چلتے ہیں اور اعداد و شمار کی مدد سے پوری تفصیلات میں جاتے ہیں لیکن اگر میرا آئیڈیا آپ کو اپیل نہیں کر رہا تو ہم بات یہیں ختم کر دیں تو بہتر ہوگا۔"

"آئیڈیا تو مجھے اپیل کر رہا ہے۔" صدیقی صاحب نے اعتراف کیا۔ "بلکہ مجھے امید کی ایک نئی کرن نظر آنے لگی ہے۔"

"ٹھیک ہے........ تو پھر بات کرنا مفید رہے گا۔" عالیہ نے کہا اور فائلیں اپنے قریب کھسکا لیں۔ اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ خود اسے بھی اپنے مستقبل کے بارے میں امید کی ایک نئی کرن نظر آنے لگی تھی۔

صدیقی صاحب سے اس کی میٹنگ مزید ڈیڑھ گھنٹے جاری رہی' اور بالآخر جب تمام مور طے پا چکے اور وہ اٹھ کر جانے لگے تو ان کے چہرے پر بلا کی طمانیت اور بشاشت تھی۔ عالیہ جوں جوں صدیقی صاحب کو اس سلسلے میں دلائل دیتی رہی اور نپے تلے انداز ں اعداد و شمار نکال کر انہیں پروڈکٹ کو نئے نام سے لانے کے لیے مشورے اور تجاویز

ی رہی' یہ تاثر گہرا ہوتا گیا تھا کہ وہ برسوں سے اسی فیلڈ میں کام کرتی رہی ہے۔ اب یڈیا منیجر کے چہرے کے تاثرات بھی بدلے بدلے سے تھے۔ وہ عالیہ کو احترام آمیز ستائش ے دیکھ رہے تھے۔

رخصت ہوتے وقت صدیقی صاحب بولے۔ "مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے آپ نے مجھے کسی بھنور سے نکال لیا ہے۔ میں اب اپنے آپ کو بہت پُراعتماد محسوس کر رہا ہوں۔"

"بس اسی اعتماد کے ساتھ اگلا قدم اٹھائیے۔ اب آپ کے انداز میں ہچکچاہٹ نہیں ہونا چاہیے۔ جو قدم ہچکچاہٹ کے ساتھ اٹھایا جائے وہ عام طور پر صحیح جگہ نہیں پڑتا۔" عالیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کی عمر دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ آپ کی ان تمام معاملات پر اتنی گہری نظر ہوگی۔" صدیقی صاحب نے ایک بار پھر بغور اس کی طرف دیکھا۔

وہ مسکرا کر رہ گئی اور دل ہی دل میں اپنے آپ سے بولی۔ "مجھے خود بھی یقین نہیں آتا۔ شاید میرے اندر کوئی نئی روح حلول کر گئی ہے...........یا شاید میری یہ صلاحیتیں غیر دریافت شدہ کان کی طرح تھیں۔ اب یکایک ہی یہ کان دریافت ہو گئی ہے۔ بنجر زمین سے سونا نکل آیا ہے۔"

وہ اپنی اس میٹنگ کی رپورٹ دینے جب آرڈی صاحب کے کمرے میں پہنچی تو انہیں گویا اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ عالیہ نے طمانیت سے مسکراتے ہوئے میڈیا منیجر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "ان سے پوچھ لیجئے' تمام تفصیلات ان کے سامنے طے ہوئی ہیں۔ صدیقی صاحب کے پاس اب وقت نہیں تھا ورنہ وہ خود آپ کو سب کچھ بتا کر جاتے۔"

میڈیا منیجر نے پُرجوش لہجے میں تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ "سر! مس عالیہ نے اتنی ذہانت اور مہارت سے اس معاملے کو ہینڈل کیا کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ ہماری کمپنی میں ایسی باصلاحیت خاتون کا اضافہ ہو چکا ہے۔"

"مکھن کی ضرورت نہیں' آپ صرف حقائق بیان کریں۔" عالیہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

میڈیا منیجر کھسیانا ہوئے بغیر باقی تفصیلات بتانے لگا۔ اس کے خاموش ہونے پر آرڈی

صاحب بہت ہی مسرور لہجے میں بولے۔ ”آپ نے تو کمال کر دیا مس عالیہ! اگر آپ کی ذہانت اور محنت کا یہی عالم رہا تو میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں کہ ایک قابلِ رشک مستقبل آپ کے انتظار میں ہے۔“

”میں اب بہت تھک گئی ہوں‘ رات کو سو بھی نہیں سکی تھی‘ میں اب گھر جانا چاہتی ہوں۔“ عالیہ جماہی روکتے ہوئے بولی۔

”ارے‘ اب تو آپ کا حق بنتا ہے کہ دو چار چھٹیاں کرلیں۔ آپ نے ایک بہت بڑا مرحلہ طے کیا ہے۔“ آرڈی صاحب بولے۔

”خیر‘ یہ کوئی ایسا بڑا مرحلہ نہیں تھا۔“ عالیہ نے قدرے لاپروائی سے کہا اور جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”فی الحال میرا چھٹیوں کا کوئی ارادہ نہیں ہے سر! میں کل سے دفتر آجاؤں گی۔ صدیقی صاحب کی پروڈکٹ کو نئے نام سے متعارف کرانے کے لئے پبلسٹی پلان مرتب کرنا ہے۔“

آرڈی صاحب کے کمرے سے نکلتے ہوئے وہ ہمایوں سرور کے بارے میں سوچ رہی تھی جس نے پندرہ بیس دن اس پروجیکٹ پر غور و خوض کرکے کوئی پلان تیار کیا تھا‘ مشورے تحریر کیے تھے جو دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔

”ہمایوں سرور کا ردِ عمل کیا ہوگا؟“ وہ سوچ رہی تھی۔ ”یقیناً وہ بھنائے گا۔ اس کے رگ و پے میں دوڑتا ہوا زہر اس کی زبان پر آجائے گا۔ مجھے اس سے نمٹنے کے لئے بھی تیار رہنا چاہیے۔“

وہ گھر پہنچی تو تھکاوٹ اور بے آرامی کے باوجود نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ یہ سوچ کر اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ جاتی کہ درخشاں مستقبل کی جانب پہلی سیڑھی پر اس نے بہت کامیابی سے قدم رکھا ہے۔ چشمِ تصور سے اس نے دیکھا کہ کامیابی کی اس سیڑھی پر بہت اوپر ایک شخص اس کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ وہ ایک ایک قدم اٹھاتی اس کے قریب پہنچی تو اس شخص نے نہایت حقارت سے اسے دیکھا اور دھکا دے کر کئی سیڑھیاں نیچے دھکیل دیا۔ وہ شخص ہمایوں سرور تھا۔

وہ خواب میں بھی اسی طرح کے مناظر دیکھتی رہی۔ وہ چونک کر آنکھیں کھول دیتی۔

اسے اپنے جسم پر ہلکی سی لرزش محسوس ہوتی۔ اسے یقین آنے لگا کہ ہمایوں سرور ضرور اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرے گا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ اس کی راہ میں ایک کیا دس ہمایوں سرور بھی حائل ہوں تب بھی وہ حوصلہ نہیں ہارے گی اور منزل پر پہنچ کر ہی دم لے گی۔

☆=========☆=========☆

اگلے روز دوپہر سے پہلے عالیہ اپنے کمرے میں تقریباً فارغ ہی بیٹھی تھی کہ ہلکی سی دستک دے کر ہمایوں سرور اندر آگیا۔ خلافِ توقع وہ مسکرا رہا تھا۔ عالیہ بظاہر اسی طرح لاپروا سے انداز میں بیٹھی تھی۔

وہ ٹہلنے کے سے انداز میں اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ تب عالیہ نے گہری نظروں اور انتہائی سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا اور اجنبی سے لہجے میں پوچھا۔ ”جی.......... فرمائیے؟“

”میں کچھ فرمانے نہیں‘ بس مبارک باد دینے آیا ہوں۔“ وہ کچھ اور خوش دلی سے مسکرایا۔ ”آپ نے تو آتے ہی معرکے سر کرنے شروع کر دیئے۔“

عالیہ نے اس کے لہجے میں حسد یا پیشہ ورانہ رقابت کی جھلک محسوس کرنے کی کوشش کی مگر وہ ایسے کسی تاثر کا شائبہ تک نہ پاسکی۔ شاید وہ اپنے محسوسات چھپانے میں بہت ماہر تھا یا پھر اب وہ کامیابی کی ان منزلوں پر تھا جہاں اسے ایسی باتوں کی کوئی خاص پروا نہیں رہی تھی اور نہ اسے کوئی خاص فرق پڑتا تھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ آپ کا محنت سے تیار کردہ پلان استعمال ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ جس پر آپ نے خاصی محنت کی تھی‘ وہ محنت ضائع ہو گئی۔“ عالیہ نے جان بوجھ کر اپنے لہجے میں طنز کی ہلکی سی کاٹ رکھی تھی۔

اس نے اب بھی کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا‘ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”محنت تو خیر آپ نے بھی بہت کی ہو گی بلکہ جتنی میں نے پندرہ بیس دن میں کی‘ اتنی شاید آپ نے بیس گھنٹے میں کی ہو۔ دنیا میں کوئی بھی قابلِ ذکر کام محنت کے بغیر نہیں ہوتا‘ کامیابی کے لیے بڑا خون دل جلانا پڑتا ہے۔“

ان کے چہرے پر بلا کا اعتماد تھا۔

"میں انہیں خود موقع دے رہا ہوں کہ وہ کچھ دیر نعرے بازی کر لیں' دل کی بھڑاس نکال لیں تاکہ ان کا جوش و خروش کچھ ماند پڑ جائے۔ کچھ دیر بعد میں بابر کو مذاکرات کے لئے اندر بلاؤں گا۔ وہی آج کل مزدور یونین کا لیڈر بنا ہوا ہے۔" رمیز بولا۔

"بس' اب تمہیں اس سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ساری باتیں میں خود کراوں گا۔" سیٹھ صاحب بولے۔ "ہڑتال شروع کیسے ہوئی؟ اسباب کیا ہیں ہڑتال کے؟ میرے خیال میں تو مل میں کسی مزدور کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوتی۔ ان کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا ہے۔ جائز مطالبات تسلیم کیے جاتے ہیں اور سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔"

"میں نے آج علی الصبح بابر کو ملازمت سے برخاست کردیا تھا۔" رمیز نے بتایا۔

"بہت دنوں سے مل میں کبھی مشینوں میں اور کبھی بجلی کے تاروں میں بریک ڈاؤن ہو رہا تھا جس کی وجہ سے کام کا بہت حرج ہو رہا تھا۔ ہم بہت سے غیر ملکی آرڈرز پورے کرنے میں پیچھے رہ گئے اور آپ کو معلوم ہے کہ باہر کی پارٹیاں کتنی اصول پرست ہوتی ہیں۔ دو دن کی تاخیر ہو جائے تو آرڈر کینسل کر دیتی ہیں۔ ہمارا بے اندازہ نقصان ہو چکا تھا اور وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ آج میں نے اور جنرل مینجر نے رنگے ہاتھوں بابر کو پکڑ لیا۔ وہ بجلی کے سرکٹ میں گڑ بڑ کر رہا تھا۔ وہ چونکہ انجینئرنگ کے شعبے میں ہے اس لیے اس کے لئے مشینری میں یا الیکٹرک سرکٹ میں گڑ بڑ کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ پہلے بھی وہی گڑ بڑ کر رہا تھا۔ کوشش کر رہا تھا کہ مل دیوالیہ ہو جائے۔ یہ لوگ ذاتی پرخاش میں اتنا آگے نکل جاتے ہیں کہ جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرنے پر تل جاتے ہیں اور ہزاروں دوسرے لوگوں کا روزگار بھی تباہ کر دیتے ہیں۔ اس لئے میں نے اسے کھڑے پیروں نکالا ہے اور کہہ دیا ہے کہ وہ چاہے تو لیبر کورٹ میں جا سکتا ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ لیبر کورٹ میں جانے کے بجائے مزدوروں کے جذبات ابھار کر ہمیں بلیک میل کرے گا۔ میں کل سے مزدوروں کو سمجھانے کی مہم شروع کروں گا۔"

"تم اب کچھ نہیں کروگے۔" سیٹھ سہیل فیصلہ کن لہجے میں بولے۔ "بلکہ تم اور ماہم چاہو تو اب گھر جا سکتے ہو۔"

"نہیں ڈیڈی! ہم یہیں رہیں گے۔" رمیز نے کہا۔ "آپ جو مناسب سمجھیں وہ کریں' گھر ہم ساتھ ہی واپس چلیں گے۔"

"اچھا ٹھیک ہے' میں بابر کو بلاتا ہوں اور اس سے بات کرتا ہوں۔" سیٹھ سہیل نے کہا اور جنرل مینجر کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف چل دیئے۔ آج کل جنرل مینجر جس کمرے میں بیٹھ رہا تھا' وہی کچھ عرصہ پہلے تک سیٹھ سہیل کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے دوسرے لوگ بھی چلے گئے۔ صرف رمیز اور ماہم راہداری میں کھڑے رہ گئے۔ آج ماحول بہت عجیب لگ رہا تھا۔ چاروں طرف ایک وحشت آمیز سکوت طاری تھا۔ مشینیں بھی خاموش تھیں اور کہیں کارکنوں کی چہل پہل بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

رمیز' ماہم کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "تم کیوں اتنی غم زدہ سی شکل بنائے کھڑی ہو؟ تمہیں ان معاملات میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"کیا جیون ساتھی کی پریشانیاں میری پریشانیاں نہیں ہیں؟" وہ افسردگی سے مسکرائی۔

"مگر میں تو پریشان نہیں ہوں۔" رمیز پرسکون لہجے میں بولا۔ "میرا سکون اور اطمینان ہی تو بابر کو زیادہ جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہا ہے۔ وہ بہت دنوں سے مجھ سے سرد جنگ لڑ رہا ہے' اگر تم مزید پریشان نہ ہو تو میں تمہیں ایک بات اور بتاؤں۔"

"میں اگر پریشان ہوئی بھی تو آپ کی رفاقت کے سہارے اس پریشانی کا مقابلہ کرلوں گی۔" ماہم بولی۔ "آپ بات تو بتائیں۔"

"بابر اور رملہ نے ہماری نجی زندگیوں کو مزدور طبقے تک لے جانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ بابر کی ذہنیت سے تو چلو اس بات کی توقع کی جاسکتی تھی لیکن مجھے رملہ پر حیرت ہے۔ اتنی بڑی فیملی کی لڑکی اتنی تھرڈ کلاس ذہنیت کی مالک ہے۔" رمیز کے لہجے میں نفرت جھلک آئی۔

"ہوا کیا...........؟" ماہم نے متوحش ہو کر پوچھا۔

"بابر نے کارکنوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ میں اس کے خلاف ذاتی وجوہات کی بنا پر انتقامی کارروائی کر رہا ہوں۔"

"ذاتی وجوہات...........؟"

"ہاں!" رمیز دھیرے سے مسکرایا۔ "وہ خود کو میرا رقیب ثابت کرنا چاہ رہا ہے۔ اس نے کارکنوں میں یہ بات پھیلا دی ہے کہ اس کا دراصل تم سے کچھ سلسلہ چل رہا تھا۔ اس لئے اب میں ڈرتا ہوں کہ کہیں بابر میری عزت کے لئے کوئی خطرہ نہ بنے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" رمیز نے اٹک اٹک کر بتایا۔

"اس کی یہ جرأت..........!" ماہم کا چہرہ سرخ ہو گیا اور مٹھیاں بھینچ گئیں۔ "میں ابھی جا کر پورے مجمع کے سامنے اس کا گریبان پکڑ کر پوچھ لیتی ہوں۔ اس خبیث کو میں ایسا سبق.........."

"نہیں، نہیں۔ تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گی۔" رمیز فوراً ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اس سے تمہاری سچائی ضرور ظاہر ہو گی لیکن یہ عقل مندی نہیں۔ ہم لوگ اپنے معاملات اس طرح نہیں نمٹایا کرتے۔ ویسے بھی انسان غصے میں جو کچھ کرتا ہے، اس سے کبھی اچھے نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ تم بالکل مطمئن رہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر ہماری نیت صاف ہے تو ہمارے راستے خود بخود صاف ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ میرا ایمان ہے۔"

ماہم اس کے لہجے کی مضبوطی کو محسوس کرتے ہوئے حیران بھی ہوئی اور اسے اس سے سہارا بھی بہت ملا۔ وہ پہلے کی نسبت پُرسکون آواز میں بولی۔ "اور رملہ نے کیا گل کھلایا ہے؟؟"

"اس کے سامنے تم نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا راز اگل دیا تھا۔ وہ بھلا اسے کیسے ہضم کر سکتی تھی۔ اتنا ظرف تو نہیں ہے اس کا۔ اس نے کارکنوں میں یہ بات پھیلانے کی کوشش کی کہ شادی سے پہلے تمہارا جمیل سے چکر تھا۔ ان دونوں کا مقصد یہ ہے کہ میں کسی طرح منہ چھپا کر پیش منظر سے غائب ہو جاؤں اور جمیل زیادہ سے زیادہ اختیارات کے ساتھ سامنے آجائے۔ وہ ایسا انسان ہے جسے جلدی بلیک میل کیا جا سکتا ہے، جلدی گھبراہٹ میں مبتلا کیا جا سکتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنے اشاروں پر چلایا جا سکتا ہے۔"

ماہم کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھندلاہٹ پھیلنے لگی۔ رمیز کے سامنے کھڑے کھڑے اس نے اپنے آپ کو بے حد گھٹیا اور قابلِ نفرت محسوس کیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس وقت رمیز کے حقیقتاً کیا جذبات تھے لیکن کم از کم اس کا یہی جی چاہا کہ منہ چھپا کر

یں جنگلوں کی طرف نکل جائے اور پھر لوٹ کر مکروہ انسانوں کے اس بازار میں واپس نہ ئے۔

وہ سوچنے لگی کہ اس نے محبت کے نام پر کتنی بڑی چوٹ کھائی تھی۔ محبت ہر انسان رتا ہے۔ رمیز نے بھی کی تھی، لیکن ایک حادثے میں وہ اپنی محبت کھو بیٹھا تھا اور ساتھ اپنے حواس بھی۔ اس لڑکی کا نام ثمینہ تھا۔ رمیز نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے رکاری افسر کی لاڈلی بیٹی تھی۔ وہ باپ اور بھائی کی آنکھوں کا تارا تھی۔ باپ اور بھائی سے بہت چاہتے تھے۔ جب اس کی لاش گھر پہنچی تھی تو اسے دیکھ کر باپ غش کھا کر گر گیا اور بھائی کی کیفیت دیوانوں جیسی ہو گئی تھی۔

کئی دنوں تک رمیز بھی ہوش و حواس سے بیگانہ رہا۔ جب وہ قدرے سنبھلا تو اپنی بت کو کھو دینے کا دکھ اور غلطی کا پچھتاوا اس کے لئے سوہانِ روح بن گیا۔ وہ ہر وقت بے چین اور بے کل سا رہتا، اس کی بے چینی، احساسِ جرم سے دو چند ہو جاتی۔ وہ عملاً نیا کے معمولات سے کٹ کر رہ گیا تھا اور اپنے کمرے میں ہی بند رہتا۔ اس کی بے چینی ر احساسِ جرم اس وقت ذرا کم ہوا جب ثمینہ کا باپ اور اس کا بھائی اس سے ملنے ئے۔ ثمینہ کے والد سرور صاحب اپنی لاڈلی بیٹی کی جدائی کے غم میں نڈھال تھے لیکن پنے دکھ کو پسِ پشت ڈال کر وہ رمیز کو تسلی دینے آئے تھے۔ حیرت کی بات تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس سے ثمینہ کی چاہت کی خوشبو آتی ہے۔ زندگی میں ثمینہ کو جس شخص سے محبت رہی وہ اس سے بھلا کس طرح نفرت کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد رمیز کے ذہن سے کچھ بوجھ تو کم ہوا لیکن کبھی بھی اس نے کسی لڑکی ں دلچسپی نہیں لی۔ پھر اسے ماہم میں ثمینہ کی جھلک نظر آئی۔ بالکل اسی طرح سیدھی، سچی ور شفاف۔ برسوں بعد اس کے ویران دل میں ماہم سے مل کر اس سے باتیں کر کے ایک یب سی مانوس روشنی پھیلتی محسوس ہوئی۔ اس کی باتوں نے گویا رمیز کے دل پر رکھی نوں وزنی کوئی نادیدہ سل کھسکا دی تھی۔

رمیز نے ماہم سے کہا تھا کہ اس کے ایک جملے۔ "محبت کرنے والوں کے ہاں تو حافی ہی معافی ہے۔" نے اس کے مردہ جذبات کو پھر سے زندہ کر دیا تھا۔

ماہم سوچنے لگی کہ کاش اس کے دامن پر جمیل کی خباثتوں کے داغ نہ ہوتے تو رملہ جیسی لڑکی کو جرأت نہ ہوتی کہ اس کے خلاف.........

رمیز نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے برابر کھڑا کر لیا۔ وہ اپنے خیالات سے چونک کر اس کے قریب کھڑی ہو گئی۔ وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "دل شکستہ ہونے اور ذہن میں الٹے سیدھے خیالات کو جگہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں بحران آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو تمہیں کسی اور کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس کا ڈوبتا دل جیسے سنبھل گیا' وہ جھرجھری سی لے کر اس کے اور قریب ہو گئی۔ وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ جما کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر ماہم کے لئے محبت کا جو پرتو تھا' اس کے لئے ماہم وہیں کھڑے کھڑے جان دے سکتی تھی۔

دفعتاً سامنے سے رملہ آتی دکھائی دی۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی آ رہی تھی اور سخت ہیجان زدہ سی دکھائی دے رہی تھی مگر اس ہیجان کی تہہ میں گویا ایک نامعلوم سی خوشی بھی پوشیدہ تھی۔

ماہم اور رمیز کے سامنے پہنچ کر وہ رک گئی۔ پارکنگ لاٹ میں گاڑی کھڑی کر کے یہاں تک آنے میں اس کی سانس پھول گئی تھی۔ ماہم اور رمیز کو یوں مطمئن انداز میں شانہ بشانہ جڑے دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور گزر گیا۔ وہ غالباً اپنے لہجے کو متفکرانہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے پتا چلا کہ یہاں ہڑتال ہو گئی ہے۔"

"اوہ' آپ کو بھی اطلاع پہنچ گئی!" رمیز نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"میں فوراً دوڑی آئی' پاپا آج کل اسٹیٹس گئے ہوئے ہیں ورنہ وہ بھی آتے۔"

"اچھا' پھر کیا ہوتا؟" رمیز نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مگر نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔

"فار گاڈ سیک رمیز! تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟ آخر کرائسز کے وقت اپنے ہی لوگ جمع ہوتے ہیں۔" وہ گاڑی کی چابی ٹھوڑی پر ٹکاتے ہوئے بڑی اداسی سے بولی۔

"یہ کوئی کرائسز نہیں ہے۔" رمیز لاپروائی سے بولا۔ "تم خود ایک مل اونر کی بیٹی

ہو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اس لائن میں اس قسم کے مواقع آتے رہتے ہیں اور جو بڑے اپنے لوگ ہیں وہ میرے پاس موجود ہیں۔"

رملہ کے چہرے پر میک اپ کی سرخی کے علاوہ کچھ حقیقی سرخی بھی جھلک آئی مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی' رمیز ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "تم چاہو تو جمیل کے پاس جا کر اپنا تسلیاں دینے کا شوق پورا کر سکتی ہو' وہ بے چارہ بہت پریشان ہے۔"

جواب کا انتظار کیے بغیر وہ ماہم کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ "آؤ' اپنے آفس میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ میرا خیال ہے' بابر سے ڈیڈی کے مذاکرات شروع ہو گئے ہیں۔"

رخصت ہوتے وقت اس نے نظر اٹھا کر بھی رملہ کی طرف نہیں دیکھا اور ماہم کا ہاتھ تھامے اپنے آفس کی طرف چل دیا۔ رملہ وہیں کھڑی نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے انہیں جاتے دیکھتی رہی' پھر وہ پاؤں پٹخنے کے سے انداز میں چلتے ہوئے جمیل کے آفس کی طرف بڑھ گئی۔

اب باہر سکوت طاری تھا۔ مزدور یا تو نعرے لگا لگا کر تھک گئے تھے یا بابر اور سیٹھ صاحب کے درمیان ہونے والے مذاکرات کے نتائج کے منتظر تھے۔

ماہم رمیز کے آفس میں پہنچتے ہی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ کے آفس کے ساتھ اٹیچ باتھ ہے یا نہیں؟" اس کے چہرے پر قدرے تکلیف کے آثار تھے۔

"کیوں' خیریت تو ہے؟" رمیز جلدی سے بولا۔

"خیریت ہی ہے' مجھے ابکائی سی آ رہی ہے۔" ماہم نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"ایک تندرست اور صحت مند عورت کو ابکائی آنے کے عام طور پر دو مطلب ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ........." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر مسکراتے ہوئے پُراشتیاق نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ دوسرا ہی مطلب ٹھیک سمجھے۔" ماہم سر جھکاتے ہوئے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ اس کے رخساروں پر شفق کی سرخی جھلک آئی۔

"اوہ........ نو.........!" رمیز تقریباً چلا اٹھا۔ وہ ہر بات سن کر پُرسکون رہتا تھا اور

دوسروں کو بھی یہی درس دیتا تھا لیکن اس وقت اس کے چہرے پر گویا بھونچال آگیا تھا۔

"تم نے یہ خوش خبری اتنی تاخیر سے کیوں سنائی؟ میں باپ بننے والا ہوں' جی چاہتا ہے تمہارا منہ........."

"رمیز.........!" ماہم مصنوعی خفگی سے بولی۔ "یہ آفس ہے۔"

رمیز نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ "میرا مطلب ہے' تمہارا منہ موتیوں سے بھردوں تم نے مجھے اتنی بڑی خوش خبری جو سنائی ہے۔ میرا دل یہ بھی چاہ رہا ہے کہ خوشی سے ناچنے لگوں لیکن میرا خیال ہے مجھ جیسا سنجیدہ آدمی یہ حرکت کرتا ہوا اچھا نہیں لگے گا۔"

"جی ہاں' بالکل درست خیال ہے آپ کا۔ خود پر قابو رکھیے اور سنجیدہ ہی رہیے مسٹر سنجیدہ!" ماہم نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ شوخ لہجے میں کہا۔

"اچھا جاؤ' تم جلدی سے باتھ روم میں جاؤ۔" رمیز ایک کونے میں پھیلے ہوئے پردے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا جس کے عقب میں باتھ روم کا دروازہ تھا۔

کچھ دیر بعد طبیعت سنبھلنے پر اور کچھ فریش ہونے کے بعد ماہم واپس آکر رمیز کے مقابل بیٹھی تو وہ گویا تمام مسائل کو بھول چکا تھا۔ بابر اور رملہ کی سازشیں' ہڑتال' نقصانات غرضیکہ سب کچھ گویا اس کے ذہن سے نکل چکا تھا۔

بس ایک ہی خوشی اس کے حواس پر غالب تھی کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ ماہم بھی ایک حسین تجربے سے گزر رہی تھی۔ ماں بننا' کیسا انوکھا اور عجیب احساس ہے۔

وہ خنک روشنی میں' اس کمرے میں بند اپنی ایک الگ ہی دنیا میں بیٹھے تھے۔ باہر کی دنیا سے بے خبر اور لاتعلق۔ وہ ننھے مہمان کے اس دنیا میں آنے کے بعد کی باتیں کر رہے تھے۔

"میں اپنے بیٹے کا نام شارق رکھوں گا۔" رمیز نے کہا۔ "کتنا پیارا نام ہے' ہے نا؟"

"شارق .... ہاں اچھا نام ہے۔" ماہم نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے فیروز نام پسند ہے۔"

"فیروز بھی اچھا ہے۔ چلو یہی رکھ لیں گے۔" پھر وہ قدرے چونکتے ہوئے بولا "اگر بیٹی ہوئی تو........."

"تو ہم اس کا نام ثمینہ رکھیں گے۔" ماہم نے کہا۔

"ثمینہ.........!" رمیز گویا نیند میں بولا ہو۔ وہ تھوڑی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ اس کیفیت میں بھی اس کے چہرے پر سرشاری اور شادمانی کے رنگ لہراتے رہے پھر وہ چونک کر گویا خوابوں کی دنیا سے نکلتے ہوئے بولا۔ "ہم کچھ شیخ چلی سے نہیں ہو رہے؟"

ماہم بھی جیسے خواب و خیال کی دنیا سے باہر آئی پھر دونوں نے ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا اور ان کا رواں رواں انوکھی مسرتوں سے کچھ اور سرشار ہو گیا۔

دفعتاً کسی نے دروازے پر دستک دی اور وہ دونوں سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئے۔

"یس' کم ان۔" رمیز نے پکارا۔

اس کا پی اے اندر آیا۔ اس کے چہرے پر حد سے زیادہ سنجیدگی تھی۔ رمیز نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔ "تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے' مذاکرات ناکام ہو گئے کیا؟"

"نہیں سر.........!" پی اے ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "مذاکرات تو خلاف توقع بہت جلدی کامیاب ہو گئے۔ سیٹھ صاحب نے بابر کو نوکری پر بحال کر دیا ہے۔ مزید ایک بونس کے ساتھ اور دوسرے چھوٹے موٹے مطالبات بھی مان لیے ہیں۔ مزدور کام پر واپس آ رہے تھے......... لیکن اب تو شاید کام کل ہی شروع ہو سکے۔"

"کیوں! آج کام کیوں نہیں ہو سکتا؟ آخر ہوا کیا ہے؟ تم اتنے غم زدہ کیوں نظر آ رہے ہو؟" رمیز کے لہجے میں بھی اضطراب جھلک آیا۔

"سر.........! وہ......... جمیل صاحب کے آفس میں حادثہ ہو گیا ہے۔ جمیل صاحب نے رملہ بی بی کو......... مم......... میرا مطلب ہے سر......... رملہ بی بی مر گئی ہیں.........!" پی اے اٹک اٹک کر بولا۔ وہ خاصا نروس تھا۔

رمیز اور ماہم کو ایسا لگا جیسے پی اے نے آفس کے کمرے میں بم پھینک دیا ہے۔ رمیز نے ماہم کی طرف ایسے دیکھا جیسے تصدیق چاہتا ہو کہ "کیا تم نے بھی وہی سنا ہے جو میں نے سنا ہے؟"

دوسرے ہی لمحے رمیز بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ "کیا بکتے ہو......... ابھی آدھا گھنٹہ پہلے تو وہ ہمارے سامنے جوش و خروش سے پاؤں پٹختی جمیل کے آفس میں گئی تھی........."

اور تم کہہ رہے ہو' وہ مرچکی ہے؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سر! آپ خود چل کر دیکھ لیں۔" پی اے ایک طرف ہٹتے ہوئے بولا۔

ماہم کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ وہ اٹھ کر رمیز کے پیچھے لپکی۔ وہ دونوں تقریباً دوڑتے ہوئے جمیل کے آفس تک پہنچے۔

آفس کے دروازے پر لوگوں کا ہجوم تھا!

ماہم اور رمیز کو آتا دیکھ کر وہاں موجود لوگوں نے ان کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ باہر سے ہڑتالی کارکنوں کی کافی تعداد اندر آچکی تھی۔ دونوں اندر پہنچے تو جمیل انہیں ایک کرسی پر وحشت کے عالم میں بیٹھا نظر آیا۔ ہڑتال کی وجہ سے چونکہ پولیس پہلے ہی مل کے گیٹ پر موجود تھی' اس لیے اس حادثے کی خبر سنتے ہی گیٹ سے ایک انسپکٹر اور دو سپاہی اندر آچکے تھے۔ اب وہ جمیل کا بیان لینے کی تیاری کر رہے تھے۔

قالین پر ایک انسانی جسم آڑا ترچھا پڑا ہوا تھا' جس پر ایک سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔ وہ یقیناً رملہ کی لاش تھی۔ اس کے قریب ہی اونچی ایڑی کا ایک سرخ سینڈل پڑا تھا۔

رمیز کو دیکھتے ہی جمیل اٹھ کر بچوں کی طرح اس سے لپٹ گیا اور رو دینے والے انداز میں بولا۔ "بھیا' مجھے بچائیے.......... قسم سے میں نے رملہ کو قتل نہیں کیا۔ یہ لوگ مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہے ہیں جیسے میں نے ہی اسے مارا ہے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں' بھائی جان! یقین کیجئے' میں نے اسے نہیں مارا۔ بھلا میں اپنی منگیتر کو کیوں مارتا؟ یہ ایک حادثہ تھا بھیا..........!"

اس کی آواز پھٹی پھٹی سی تھی اور آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔

رمیز نے اس کی پیٹھ تھپکی اور پیار بھرے انداز میں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "تم اتنے بدحواس کیوں ہو رہے ہو؟ آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔ حادثہ کسی بھی وقت' کسی کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے۔ جو کچھ بھی ہوا ہے' تم آرام سے بالکل سچ سچ انسپکٹر صاحب کو بتا دو اور خود کو سنبھالو۔"

"یہی تو میں بھی ان سے کہہ رہا ہوں جی' ہم ان پر کوئی الزام تھوڑی ہی لگا رہے

ہیں۔" انسپکٹر جلدی سے بولا۔ "ہم تو صرف بیان لے کر پرچہ درج کریں گے۔ فیصلہ کرنا تو عدالت کا کام ہے۔"

انسپکٹر' ماہم اور جمیل بیٹھ چکے تو رمیز نے آگے بڑھ کر چادر ہٹا کر دیکھا۔ رملہ کا چہرہ بالکل ویسے کا ویسا ہی تھا جیسا انہوں نے آدھ پون گھنٹہ قبل دیکھا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی ناک سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ کر قالین میں جذب ہو چکی تھی۔ ورنہ اسے دیکھ کر یہی گمان گزرتا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔ ماہم اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے کانپ گئی۔

ایک سپاہی نے قلم کاغذ سنبھال لیا اور انسپکٹر جمیل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "اب آپ مجھے شروع سے سب کچھ بتائیں جناب! یہ "حادثہ" ہوا کس طرح؟"

"بتانے کے لیے ہے ہی کیا۔" جمیل خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "یہ میری منگیتر ہے۔ میرا مطلب ہے' تھی۔ مزاج کی یہ بھی تیز تھی اور میں بھی تیز ہوں۔ کئی دن سے شادی کی تاریخ طے کرنے اور دوسرے کئی چھوٹے موٹے گھریلو قسم کے مسائل پر میری اس سے پہلے ہی بحث چل رہی تھی۔ یہ آج کل بس اسی موضوع پر ہی بات کرتی تھی۔ میں اسے سمجھاتا رہتا تھا کہ فوری طور پر میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کم سے کم اسے مزید دو سال انتظار کرنا پڑے گا لیکن.......... یہ سمجھنے لگی تھی کہ میں اسے بہلا رہا ہوں اور میرا اس سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس کے ڈیڈی اسٹیٹس گئے ہوئے ہیں۔ رملہ کی خواہش تھی کہ ان کے واپس آتے ہی میں پاپا کو ان کے ہاں شادی کی تاریخ طے کرنے کے لئے بھیج دوں لیکن چند کاروباری مسائل کے پیش نظر میں نے اسے واضح طور پر.........."

"بہرحال۔" رمیز نے اسے نرمی سے ٹوکا۔ وہ جمیل کی ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "خود کو سنبھالو جمیل اور آج کے بارے میں بتاؤ کہ یہ حادثہ کیسے ہوا؟"

جمیل نے سر کو جھٹکا۔ اسے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ وہ اصل واقعے کی بجائے غیر متعلق باتیں لے بیٹھا ہے۔ اس نے کہا۔ "آج ہڑتال اور دوسرے کئی نجی مسائل کی وجہ سے میں کچھ زیادہ ہی پریشان تھا۔ اوپر سے اس نے آکر وہی اپنا پرانا موضوع چھیڑ دیا۔ فیکٹری کے مسائل سے میرا ذہن ویسے ہی پراگندہ ہو رہا تھا۔ میں نے اسے منع کیا کہ کوئی

اور بات کرے لیکن یہ آج شاید مجھ سے لڑنے کے موڈ میں تھی۔ اس نے جلی کٹی باتیں شروع کر دیں تو میرا پارا بھی چڑھ گیا۔ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ اس نے جواب میں مجھے برا بھلا کہا اور بدتمیزی پر اتر آئی، مجھے آنکھیں دکھانے لگی، دھمکیاں دینے لگی۔ میں مانتا ہوں کہ مجھے سخت غصہ آگیا تھا۔ میں نے اٹھ کر میز کے دوسری طرف سے اسے ایک چانٹا رسید کر دیا۔" یہ کہہ کر جمیل تاسف، پشیمانی اور افسوس سے ہاتھ ملنے لگا۔

"صرف ایک چانٹے سے یہ فوت ہو گئیں؟" انسپکٹر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ "اتنی نازک تھیں یہ مس رملہ کہ ایک ہاتھ پڑتے ہی پٹ سے مر گئیں؟"

جمیل نے ایک گہری سانس لے کر کرسی کے پشتے سے سر ٹکا دیا اور بولا۔ "یہ میرے چانٹے سے نہیں مری۔ یہ پہلے تو ہکا بکا بیٹھی مجھے گھورتی رہی، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ یہ بھلا کہاں برداشت کرنے والی تھی۔ بچپن سے یہ بالکل لڑکوں والے انداز میں پلی بڑھی تھی۔ اس نے میز پر سے اسکیل اٹھا لیا اور انتہائی غصے کے عالم میں مجھے مارنے کے لیے میز کے اس طرف آنے لگی کیونکہ میں پیچھے ہٹ چکا تھا اس لیے یہ کرسی سے الجھ کر گر پڑی۔ میز کا کونا بہت زور سے اس کی کنپٹی پر لگا۔ اب معلوم نہیں، اس میں غصے کی زیادتی بھی شامل تھی یا صرف چوٹ کی وجہ سے ہی ایسا ہوا کہ یہ وہیں ساکت ہو گئی..........

میرا خیال ہے کہ اس کے دماغ کی کوئی رگ پھٹ گئی ہے۔ چند سیکنڈ بعد اس کی ناک سے خون رسنے لگا۔ میں نے اس کے دل کی دھڑکن دیکھی جو رک چکی تھی۔ چیخ چیخ کر میں نے مل کی ڈسپنسری کے ڈاکٹر کو تلاش کروا کے بلوایا۔ اس نے آکر بتایا کہ اب تو اسپتال لے جانا بے کار ہے، یہ مر چکی ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ میری خود سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کیا ہو گیا، کیسے ہو گیا۔ اچانک اتنا بڑا حادثہ ہو گیا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔" وہ ہچکی لے کر خاموش ہو گیا۔

"ہوتا ہے جی، کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔" انسپکٹر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اب اس کے لہجے میں ہمدردی جھلک آئی تھی۔ "میں پہلے بھی ایسا کیس دیکھ چکا ہوں۔ ایک صاحب کچھ اسی قسم کے حالات میں صرف ٹھوکر لگ کر گرنے سے مر گئے تھے، ان کے تو

سر پر چوٹ بھی نہیں لگی تھی۔"

رمیز کو اپنے کالج کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آگیا جو اس کے دوست چوہدری شفیع کے والد کے ساتھ پیش آیا تھا۔ ان کی ڈوگروں سے دشمنی چل رہی تھی۔ ایک دن چوہدری شفیع کے والد چوہدری رفیع لاہور کورٹ میں ایک کیس کے سلسلے میں پیشی بھگت کر واپس جا رہے تھے کہ راستے میں انہیں احساس ہوا ایک جیپ مستقل ان کے تعاقب میں ہے۔ شاید وہ کورٹ سے ہی ان کے پیچھے لگ گئے تھے۔ وہ پجیرو میں تھے اور خود ڈرائیونگ کر رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ جیپ اس پجیرو کی سپیڈ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پچھلی دو سیٹوں پر ان کے دو باڈی گارڈ اسلحے سے لیس مستعد بیٹھے تھے۔ انہوں نے دونوں کو خبردار کیا اور اسپیڈ بڑھا دی۔ پچھلی جیپ میں ان کے دشمن ڈوگر خاندان کے افراد تھے۔

وہ پجیرو کی اسپیڈ بڑھا کر جیپ سے خاصے فاصلے پر چلے گئے لیکن اس سڑک پر بنے ریلوے کراسنگ کے پھاٹک کو بند دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ انہیں بیک مرر میں جیپ اپنے پیچھے آتی دکھائی دے رہی تھی اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ جیپ میں پانچ افراد مسلح بیٹھے تھے۔ ان کے دو باڈی گارڈ پانچ افراد کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ پھاٹک کے کھلنے کا انتظار کرنا گویا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا جو بڑی مستقل مزاجی سے ان کے تعاقب میں تھی۔ انہوں نے اچانک، فوری اور عجیب فیصلہ کیا۔ انہوں نے سوچا کہ اگر وہ رک گئے تو ڈوگروں کے ہاتھوں مارے جائیں گے جو انہیں بالکل منظور نہیں تھا۔

پھاٹک کے قریب پہنچ کر انہوں نے بجائے اسپیڈ کم کرنے کے اچانک ایکسی لیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ وہ زندگی کے لیے ایک فی صد چانس کو بھی گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں موت صاف نظر آرہی تھی۔ پھاٹک بند دیکھ کر پیچھے آتی جیپ میں بیٹھے افراد جیپ پر کھڑے ہو کر اسلحہ لہرا رہے تھے۔ جیپ بڑی تیزی سے قریب آرہی تھی۔

چوہدری رفیع کی پجیرو کسی وحشی درندے کی طرح بھاگی۔ پھاٹک خاصا بڑا اور مضبوط تھا مگر وہ اس یقین کے سہارے یہ رسک لینے پر تیار ہو گئے تھے کہ ایک نئی پجیرو کی بھرپور قوت کے سامنے یہ نہ ٹھہر سکے گا۔ اس سے پجیرو کے اگلے حصے کا بیڑا غرق ہونا

لازمی تھا۔ امکان یہ بھی تھا کہ پھاٹک کا گیٹ پلٹ کر گاڑی پر گرے یا گاڑی اچانک بند ہو جائے' لیکن یہ رسک لیے بنا چارہ نہیں تھا۔

پجیرو ایک دھماکے سے پھاٹک کے گیٹ کو توڑتی ہوئی گزر گئی۔ عین اسی لمحے ان کے کانوں نے ٹرین کی گڑگڑاہٹ سنی اور انہوں نے دیکھا کہ ایک دیوہیکل انجن ان کے بالکل سر پر پہنچ چکا ہے۔ وہ اس پٹڑی پر پہنچ چکے تھے جس پر ٹرین آرہی تھی۔ انہوں نے دیوانہ وار جدوجہد کر کے پجیرو کو سنبھالا اور ایکسی لیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ "مجروح" پجیرو غرا کر اچھلی' لیکن دوسرے ہی لمحے ٹرین کا انجن پوری قوت سے پجیرو کے پچھلے حصے سے ٹکرایا اور اسے گھسیٹتا ہوا کافی دور لے گیا۔ دشمنوں نے سمجھا کہ ان کے ہاتھوں نہ سہی بہرحال چوہدری رفیع کا خاتمہ تو ہوا لیکن "جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے" والا محاورہ ان پر سو فیصد درست ثابت ہوا۔ وہ بال بال بچے تھے۔ انہیں خراش تک نہیں آئی تھی لیکن پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں باڈی گارڈز کے چیتھڑے اُڑ گئے تھے۔ چونکہ پجیرو پٹڑی سے آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اس کے پچھلے وہیل ابھی پٹڑی پر تھے کہ ٹرین اس سے ٹکرائی تھی۔ یہ ایک معجزہ ہی تھا کہ ایسے ہولناک حادثے سے وہ صاف بچ گئے تھے بلکہ انہیں خراش تک نہیں آئی تھی بلکہ یوں کہنا مناسب ہو گا کہ ان کا ابھی وقت پورا نہیں ہوا تھا۔ دستِ اجل کی دی ہوئی مہلت ابھی باقی تھی جو تقریباً ایک ماہ بعد پوری ہو گئی۔

چوہدری رفیع جیپ میں بیٹھے کہیں سے آرہے تھے کہ اونچے نیچے راستوں پر جھٹکے کھاتی ہوئی جیپ کسی گڑھے کی وجہ سے اچھلی۔ چوہدری رفیع کا سر اوپر لگے اس پائپ سے ٹکرایا جو ریگزین کی چھت کو روکے ہوئے تھا۔ وہ چوٹ ایسی مہلک ثابت ہوئی کہ وہ وہیں ڈرائیونگ سیٹ پر ساکت ہو گئے۔ جیپ تھوڑی دور جا کر خود بخود رک گئی۔ کون سوچ سکتا تھا کہ چوہدری رفیع........ جس کی موت کے خواہاں اس کی تاک میں رہتے تھے اس طرح آسان موت مر جائے گا۔ ایسے مواقع ان کی زندگی میں بہت آئے تھے جب ان کی طرف آنے والا اجل کا تیر کسی اور کو نشانہ بنا گیا۔ ان کی موت کو کسی اور نے گلے لگا لیا۔ ان کی جان کی حفاظت کرنے والے باڈی گارڈ ان کی طرف بڑھنے والی موت کے آگے سینہ سپر ہو جاتے تھے۔ بہرحال' زندگی اور موت کا سیدھا سادہ اور سچا نظریہ یہی ہے کہ جس کا

وقت پورا نہیں ہوا اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں مار سکتی اور جس کی مہلت پوری ہو گئی ہو وہ خود چل کر وہاں جاتا ہے جہاں اس کو مرنا ہو۔

رمیز نے بڑے افسوس سے سوچا کہ خود رملہ کتنی بار موت کے قریب سے گزری ہو گی۔ کیسے کیسے حوادث زندگی میں آئے ہوں گے۔ آج تک کتنی بیماریوں' روڈ ایکسیڈنٹ اور دیگر حادثات سے بال بال بچی ہو گی لیکن مری تو کیسے!

"اب آپ کیا کریں گے انسپکٹر صاحب؟" رمیز نے موت و حیات کے فلسفے اور زندگی کی بے ثباتی کے تماشے پر ذہن میں آنے والے خیالات کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ اسے رملہ کی اچانک موت کا بہت رنج تھا۔ وہ جذباتی' ضدی اور تیز مزاج لڑکی جو تھوڑی دیر پہلے جیتی جاگتی ہستی تھی۔ اسے مرگِ ناگہانی خود کھینچ کر وہاں لے آئی تھی جہاں اجل کے ہاتھوں نے اس کی کتابِ حیات میں آخری اندراج کے طور پر لکھا۔ "بے شک ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی طرف لوٹ جاتے ہیں۔" پھر اس کتاب کو یوم حشر تک بند اور محفوظ کر لیا۔

"لاش پوسٹ مارٹم کے لیے جائے گی جناب!" انسپکٹر ٹوپی درست کرتے ہوئے بولا۔ "جمیل صاحب کو ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔ تفصیلی پوچھ گچھ اور تفتیش ہو گی۔ جن جن لوگوں کے بیان ضروری ہوئے' وہ ہوں گے پھر ہم چالان عدالت میں پیش کر دیں گے۔ معاملہ تو میرے خیال میں سیدھا سادہ ہی ہے۔ ایک دو پیشیوں میں ہی فیصلہ ہو جائے گا۔"

رمیز' جمیل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے وکیل آج کل میں ہی تمہاری ضمانت کرا لیں گے۔ تمہیں ایک آدھ دن سے زیادہ حوالات میں نہیں رہنا پڑے گا۔"

جمیل' رمیز کے تسلی بخش کلمات سن تو رہا تھا لیکن اس کا دل کسی انجانے سے خوف کے زیر اثر بری طرح سے لرز رہا تھا۔ حوالات میں رات گزارنے کے تصور سے ہی اسے ہول اٹھ رہے تھے۔ رمیز تو ایک آدھ دن کی بات کر رہا تھا لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس کی ضمانت نہ ہو سکی تو نہ جانے کتنی راتیں اسے حوالات میں یا جیل کے پُرہول اور وحشت ناک ماحول میں گزارنی پڑیں۔"

پھر رمیز بہ آواز بلند مگر خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "کاش ڈیڈی کو کم از کم آج کے دن کوئی جا کر یہ منحوس خبر نہ سنائے۔ وہ پہلے ہی کافی ٹینشن برداشت کر چکے ہیں۔"

اسی لمحے عقب سے سیٹھ سہیل کی ٹھہری سی آواز سنائی دی۔ "میں سب کچھ سن چکا ہوں برخوردار! مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود زندہ سلامت ہوں۔"

وہ بغیر کسی سہارے کے چلتے ہوئے اندر آگئے اور ایک کرسی پر ڈھیر ہونے کے بعد گہری سانس لے کر جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "مجھے رملہ کی موت کا بہت افسوس ہے بیٹا! ابھی بچی ہی تھی وہ.......... بہت کچھ دیکھنا تھا اس کو، لیکن اس واقعے میں قدرت کی نہ جانے کیا مصلحت پوشیدہ ہے۔ نہ جانے کیا سکھانا چاہتی ہے قدرت ہمیں۔ ہم آج کل میں تمہاری ضمانت کرالیں گے لیکن شاید اس ایک آدھ دن کی اذیت میں تمہیں اندازہ ہو سکے کہ حد سے زیادہ غصہ، طیش، متلون مزاجی، مادہ پرستی، ایک دوسرے کا عدم احترام، یہ سب چیزیں کتنی نقصان دہ ہیں.........."

بولتے بولتے سیٹھ سہیل کی سانس پھول گئی۔ ماہم آگے بڑھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی اور حوصلہ دینے کی کوشش کرنے لگی۔ سیٹھ سہیل رملہ کی اچانک موت پر بہت رنجیدہ اور ملول نظر آرہے تھے۔ چند گہری گہری سانسیں لے کر وہ بولے۔ "بہرحال.......... جمیل بیٹا! کبھی کبھی ایک پل میں انسان کی زندگی کا رخ بدل جاتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ وقت بہت بڑا استاد ہوتا ہے، غلط نہیں ہے۔ بہت بڑے عالم، مفکر، فلسفی اور قومی رہنما کی علمیت، تدبر اور راست بازی کا فلسفہ بعض اوقات کسی ایک شخص کی سمجھ میں نہیں آتا۔ بعد میں یہی سب کچھ اسے وقت سکھا دیتا ہے۔ شاید آج کے بعد تمہاری سمجھ میں بھی کچھ آجائے۔ شاید یہ وقت تمہیں بھی اپنے آپ کو بدلنے پر مجبور کر دے۔"

جمیل دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح رونے لگا۔

☆=====☆=====☆

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد سیٹھ سہیل، ماہم اور رمیز ایک ہی گاڑی میں گھر واپس جا رہے تھے۔ سیٹھ سہیل تھکے تھکے سے انداز میں سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے۔ "رمیز! تم خود محسن آغا ایڈووکیٹ کے دفتر جا کر اس سے مل لو.......... اور پوری صورتِ حال بتا کر اس سے کہو کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے وہ ایک دو دن میں جمیل کی ضمانت کا بندوبست کرے۔"

"جی، میں چلا جاؤں گا ڈیڈی۔" رمیز نے کہا۔ "آپ اس سلسلے میں بالکل فکرمند نہ ہوں۔ میں انکل آغا سے مل کر سب بندوبست کرلوں گا۔ ایک دو دن میں جمیل پھر ہمارے درمیان ہو گا۔"

"ہاں، لیکن بے چاری رملہ ہمیشہ کے لیے ہمارے درمیان سے نکل گئی۔" سیٹھ سہیل نے غمگین لہجے میں کہا۔ "توصیف پر کیا گزرے گی جب وہ اپنی جوان اور لاڈلی بیٹی کی موت کی خبر سنے گا۔ میرے لیے دوہری آزمائش ہے۔ اب مجھے ہی اسے بیٹی کے مرنے کی اطلاع دینی ہو گی۔"

رمیز نے کوئی جواب نہیں دیا اور بوجھل دل سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"بہت عرصے بعد آج مجھے اندازہ ہوا کہ میرا بیمار دل اب بھی کتنا بوجھ برداشت کر سکتا ہے.......... لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج میں بری طرح تھک گیا ہوں۔ سر سے پیر تک بری طرح ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہوں۔ کاش، اتنی بری خبروں اور صدموں کے بعد آج کوئی خوش خبری ہی سننے کو مل جاتی، جس سے روح اور ذہن کا کچھ بوجھ ہلکا ہوتا، دل میں ہلکی سی مسرت کی لہر ہی دوڑ جاتی۔ کاش.........." سیٹھ سہیل ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے۔

رمیز ایک لمحے خاموش رہا۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا اور وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "ڈیڈی! ایک خوش خبری ہے تو سہی۔"

"اچھا..........! واقعی؟" سیٹھ سہیل بدستور سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگائے ہوئے بولے۔ "پھر جلدی سے وہ خوش خبری سنا ڈالو۔ مجھے اس وقت کسی اچھی خبر کی سخت ضرورت ہے۔"

"لل.......... لیکن ڈیڈی..........! وہ میں آپ کو نہیں سنا سکتا۔"

"کیوں؟ کیوں نہیں سنا سکتے۔"

"مجھے ذرا شرم آتی ہے۔"

سیٹھ سہیل چونک کر پچھلی سیٹ کی طرف مڑتے ہوئے بولے۔ "کیوں شرم آرہی ہے تمہیں؟ چالیس سال کے ہونے کو آرہے ہو اور ابھی تک باپ سے شرماتے ہو' بتاؤ کیا بات ہے۔"

"گھر پہنچیں گے نا' تو میں بی خالہ کو بتا دوں گا.......... وہ آپ کو بتا دیں گی۔"

ماہم نے بھی جلدی سے کھڑکی کی طرف منہ پھیر لیا۔ بی خالہ ان کے گھر میں کام کرنے والی بہت پرانی ملازمہ تھیں جو گھر کے فرد ہی کی طرح تھیں۔

"یہ تم اتنے شرمیلے کب سے ہو گئے؟" سیٹھ سہیل نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ ڈیڈی! بعض معاملات میں شرمانا ہی بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔" رمیز نے سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر واقعی بچوں جیسی معصومیت تھی۔

"واہ' برخوردار' بہت خوب! تم نے تو لڑکیوں کو بھی مات دے دی۔" سیٹھ سہیل نے مسکرا کر کہا اور ماہم سے پوچھا۔ "بیٹی! تم بتاؤ' ایسی کیا بات.........." لیکن سیٹھ سہیل اپنی بات مکمل نہ کر سکے۔ وہ ماہم کے چہرے پر گھبراہٹ اور حیا کی سرخی دیکھ کر بات کی تہہ تک پہنچ گئے اور بلند آہنگ قہقہہ لگا کر سیٹ پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ "واقعی بہت بڑی خوش خبری ہے یہ۔ اس سے اچھی خبر ہو ہی نہیں سکتی۔ ہم بھی کسی بی خالہ والہ سے نہیں پوچھیں گے۔ تم بھی مت بتاؤ' ہم سب سمجھ گئے ہیں۔ تمہارے باپ ہیں آخر۔"

سیٹھ سہیل کافی دیر تک ہنستے رہے۔ ایک تو یہ خوش خبری ہی بہت بڑی تھی اور اوپر سے چالیس سالہ بیٹے کے شرمیلے پن پر انہیں بہت ہنسی آرہی تھی جو رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

زندگی کا کوئی دور ایسا ہوتا ہے جس میں وقت گزرنے کا بالکل احساس نہیں ہوتا۔ عالیہ کو بھی ایڈورٹائزنگ کمپنی میں ملازمت کرتے تین سال بیت گئے اور اسے احساس بھی نہ ہو سکا۔

شاید اس لیے کہ یہ تین سال اس کے لیے بے پناہ کامیابیوں کے سال تھے۔ اس نے بھی ہمایوں سرور والی لائن اختیار کر لی تھی۔ وہ نہ صرف ایڈورٹائزنگ کے ہر کام میں دخل رکھتی تھی بلکہ اس کے مشوروں اور تجاویز نے کئی ڈوبتی ہوئی کمپنیوں کو بچایا تھا۔ اس کے پاس آنے والے پہلے کلائنٹ صدیقی صاحب تھے جو آج نہ صرف کامیابی سے بزنس چلا رہے تھے بلکہ انہوں نے ایک کی جگہ دو پلانٹ لگا لیے تھے اور عالیہ کے زبردست معتقد اور ممنون تھے۔ عالیہ کی تجاویز اور اس کے مشوروں پر عمل کر کے آج وہ ایک کامیاب بزنس مین تھے۔

اب صرف صدیقی صاحب ہی نہیں اور بھی کئی سیٹھ عالیہ کی صلاحیتوں کے زبردست مداح تھے اور وہ اس طرح اس کی بات مانتے تھے جیسے مرید اپنے پیر کا فرمان مانتے ہیں۔ عالیہ کے لیے اب نوکریوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ درونِ خانہ اسے ایک سے ایک اچھی ملازمت کی پیشکشیں آچکی تھیں اور گو کہ اب وہ بھی خاصی مادیت پرست ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود اچھی پیش کشوں پر وہ ڈگمگائی نہیں تھی۔ اس نے ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو چھوڑنے کا کبھی نہیں سوچا۔

اسے یہاں کی ہر چیز سے انسیت سی ہو گئی تھی۔ یہی جگہ اس کی کامیابیوں کا نقطۂ آغاز تھی۔ یہاں سے اس نے کامیابی کے سفر کا آغاز کیا تھا اور اتنی تیزی سے ہر میدان کو پھلانگتی جا رہی تھی کہ لوگ انگشت بدنداں اس کی طرف دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔

اس کے علاوہ اسے یہاں سے بے حد عزت ملی تھی۔ آرڈی صاحب نے ابتدا سے اس پر بے پناہ اعتماد کیا تھا۔ اس کے کہنے پر بہت سے معاملات میں رسک لیا تھا اور اب وہ اسے بالکل اپنی بچیوں کی طرح چاہتے تھے۔ عالیہ اگر اپنے آپ کو مکمل طور پر دریافت کرنے میں کامیاب ہوئی تھی تو اس میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ عالیہ کا اب خود سے کمپنی کو چھوڑ کر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ اپنی ہر بات یہیں رہتے ہوئے منوا لیتی تھی۔

اس نے کامیابی کی اس منزل تک پہنچنے کے لیے ماضی میں کیا کیا جتن کیے تھے' کتنی جگہوں پر نوکری کی تھی اور کیسے کیسے لوگوں سے اس کا واسطہ پڑا تھا' اب وہ سب کچھ بھلا

چکی تھی۔ کسی منزل کا تعین کر کے جب انسان مصائب سے پُر راستے پر چل پڑتا ہے اور آخر کار منزل پر پہنچ جاتا ہے تو وہاں تک پہنچ کر وہ راستے میں پیش آنے والی تکالیف' مصیبتیں اور اذیت کے لمحات فراموش کر دیتا ہے کیونکہ ان تکالیف کے بدلے وہ انعام کے طور پر منزل کو پالیتا ہے' اگر انسان اپنی کوششوں اور جدوجہد کے باوجود کسی منزل پر نہ پہنچ پائے تو یہ سفر اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں عالیہ خود کو خوش قسمت تصور کرتی تھی۔

البتہ ماضی میں ملنے والا ایک کردار اسے بہت یاد آتا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک اداس اداس سی لڑکی کا چہرہ گھوم جاتا' یہ چہرہ ماہم کا تھا۔ وہ اکثر اس کے بارے میں سوچتی رہی حالانکہ ان کے درمیان زیادہ بے تکلفی بھی نہیں تھی اور شناسائی بھی کچھ زیادہ پرانی نہیں تھی۔ ان کے درمیان رفاقت بھی زیادہ طویل نہیں رہی تھی لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں وہ عالیہ کو بہت یاد آتی تھی۔

وہ منظر اس کے ذہن میں ہنوز تازہ تھا کہ جب اس نے اپنا استعفا ماہم کے سائن کے لیے اس کی میز پر رکھا تھا تو عالیہ نے محسوس کیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں جاگزیں اداسی اور مزید گہری ہوگئی تھی۔ اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا تھا۔ "تم جا رہی ہو' یہ تمہارا حتمی فیصلہ ہے؟ نظرِ ثانی کی کوئی گنجائش نہیں؟"

جب عالیہ نے فیصلہ کن انداز میں نفی میں سر ہلایا تو ماہم نے گویا کوئی نادیدہ بوجھ ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی تھی اور گہری سانس لے کر بولی تھی۔ "اچھا ٹھیک ہے تم بھی چلی جاؤ۔ میری دعا ہے کہ تمہارے من پسند کیریئر کا آغاز تمہیں کامیابیوں کی منزل تک لے جائے جس کی تم حق دار ہو۔"

ماہم کی آنکھوں میں اداسیوں کے سائے گہرے ہوتے دیکھ کر عالیہ کو اس پر بہت ترس آیا تھا لیکن وہ اس کے لئے کر بھی کیا سکتی تھی۔ تاہم اس نے کہا تھا کہ وہ کبھی کبھار وقت نکال کر اس سے ملنے ضرور آئے گی لیکن وہ اس کے بعد ماہم سے ملنے نہیں جا سکی تھی۔ البتہ وہ اسے بھولی نہیں تھی۔

☆======☆======☆

عالیہ اب ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھی۔ اس کی تنخواہ ہمایوں سرور کے برابر تھی حالانکہ وہ اس سے کہیں زیادہ سینئر تھا۔

ہمایوں سرور کی اہمیت کچھ کم ضرور ہوئی تھی لیکن اتنی نہیں جتنا دوسرے لوگوں کو اندیشہ تھا۔ وہ بہرحال ذہین آدمی تھا۔ اس نے اپنی اہمیت کافی حد تک برقرار رکھی تھی اور کبھی احساسِ کمتری یا پیشہ ورانہ رقابت کا شکار ہوتا نظر نہیں آیا تھا۔ اس میں بے پناہ اعتماد تھا اور وہ نئی راہیں تراشنا جانتا تھا۔

فرق بس یہی پڑا تھا کہ کمپنی میں ایک کی جگہ دو زبردست شخصیتیں ہوگئی تھیں۔ ایجنسی کا کاروبار بہت پھیل گیا تھا۔ اسٹاف میں بھی بے حد اضافہ ہوا تھا۔

عالیہ اب تک مکمل طور پر اونچے طبقے کی لڑکی نظر آتی تھی۔ بہت سے لوگ تو اس سے بات کرتے ہوئے ہکلانے لگتے تھے۔ اس کی گھریلو زندگی میں بھی نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ اب اس کا رہن سہن بہت بہتر تھا۔ فلیٹ گو کہ اب بھی کرائے کا ہی تھا لیکن اب وہ ایک اچھے علاقے میں منتقل ہو چکے تھے۔ اس کے ابو کی حالت گو کہ اب بالکل اچھی نہیں تھی لیکن اب ان کا علاج بہتر طور پر ہو رہا تھا۔ گھر میں ان کے لیے ایک الگ تھلگ نہایت آرام دہ' صاف ستھرا کمرہ مخصوص تھا۔ عالیہ کو اب کم از کم اس حد تک طمانیت ضرور تھی کہ علاج کے سلسلے میں وہ کسی کوتاہی یا محرومی کا شکار نہیں تھے۔

سب کچھ پہلے سے بہت بہتر تھا۔

لیکن ہمایوں سرور اور عالیہ کے درمیان خلیج جُوں کی تُوں برقرار تھی اور اسے صرف عالیہ نے برقرار رکھا تھا۔

تین طویل برس گزر گئے تھے۔ کتنے تغیرات' کتنے انقلابات آئے تھے اس عرصے میں' لیکن دل کی نگری اسی طرح سُونی رہی۔ خلیج کے دوسرے کنارے پر کھڑا ہمایوں سرور ہمیشہ پُرامید نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا' لیکن وہ بدستور اپنے خول میں بند رہی۔ اہرام میں بند کسی ممی کی طرح۔ دل کے دروازے پر اس نے خود اذیتی کے قفل ڈالے رکھے۔

سبب اسے خود بھی صحیح طور پر معلوم نہیں تھا۔ ہمایوں نے پہلے دن اس کی انا پر زخم

لگایا تھا۔ اب تو شاید وہ بھی مندمل ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود جانے کیوں ہمایوں سرور جب بھی طلب اور محبت کی پرچھائیاں لیے اس کی طرف بڑھتا تھا تو وہ اپنی ذات میں کچھ اور سکڑ سمٹ جاتی۔ ذات کے نہ جانے کس تاریک گوشے سے سرد مہری اور کرختگی عود کر آتی تھی اور اس کے سارے وجود پر چھا جاتی تھی۔ متحرک جذبے برف پوش چوٹیوں کی طرح ساکت ہو جاتے تھے۔

اس کی اپنی ذات میں کوئی غیر مرئی دیوار سی اٹھ کھڑی ہوئی تھی جسے وہ گرانے سے قاصر تھی اور ہمایوں سرور اسے محسوس کرنے اور سمجھنے سے قاصر تھا لیکن ان طویل برسوں میں وہ واپس نہیں پلٹا تھا۔ پہلے دن کی طرح جہاں کا تہاں کھڑا تھا۔

اس نے کوئی تلخ ردِعمل بھی ظاہر نہیں کیا تھا۔ شاید اس میں بہت صبر و ضبط تھا' بہت حوصلہ تھا۔ شاید وہ انتظار کر رہا تھا اور شاید وہ زندگی کے آخری سانس تک انتظار کرنے کا اہل تھا۔ بہت استقامت تھی اس میں۔ اس کی آنکھوں نے پہلے دن ہی عالیہ کو بتا دیا تھا کہ ایک بار وہ جہاں جم جانے کا فیصلہ کر لیتا ہے وہاں سے ہلتا نہیں۔

وہ عالیہ کے گرد منڈلاتا نہیں تھا لیکن اس سے کتراتا بھی نہیں تھا۔ دفتری معمولات میں دن میں بارہا آمنا سامنا ہوتا تھا بلکہ بعض اوقات پاس بیٹھنے کا اتفاق بھی ہوتا۔ ہمایوں سرور ہمیشہ اس سے خوش دلی سے بات کرنے کی کوشش کرتا مگر وہ ہر بات کا جواب نہایت اختصار سے اور سرسری سے انداز میں دیتی۔ ان تین برسوں میں بس اتنی تبدیلی آئی تھی کہ اب عالیہ کے لہجے میں سرد مہری یا رُکھائی اور نگاہوں میں سختی نہیں رہی تھی۔

عالیہ کو اب اونچے طبقے کی بہت بڑی بڑی پارٹیوں اور دیگر تقریبات میں جانے کا بھی موقع ملتا تھا۔ اکثر ایسی تقریبات میں ہمایوں سرور بھی موجود ہوتا تھا۔ آسودہ حال گھرانوں کی فیشن پرست لڑکیاں ہمایوں سے متعارف ہوتیں تو پھر ہمایوں ان کے حلقے سے مشکل ہی نکل پاتا لیکن اس کی نظریں صرف اور صرف عالیہ کا طواف کرتیں۔

عالیہ بالکل انجان بنی رہتی۔ ویسے بھی ایک ہمایوں ہی کیا' وہ تو سبھی مردوں کی مرکزِ نگاہ ہوتی تھی۔ بیویوں کے پاس کھڑے ہوئے مرد بھی کن انکھیوں سے حسبِ توفیق اس کی طرف ضرور دیکھتے تھے۔ بعض اوقات تو عالیہ کو گھبراہٹ ہونے لگتی۔

ہمایوں کے انداز میں ایک عجیب سی اداسی اور یاسیت در آئی تھی جیسے کارواں سے پیچھے رہ جانے والا کوئی مسافر خزاں رسیدہ شجرِ آرزو تلے کھڑا' جانے والوں کے قدموں کے نشان دیکھ رہا ہو۔ کبھی کبھی عالیہ کو یوں لگتا کہ وہ ساری عمر یونہی منتظر کھڑا رہے گا۔ کبھی واپس نہیں جائے گا' کبھی رستہ نہیں بدلے گا۔

پھر وہ خود اپنے بارے میں سوچتی' وہ کیا چاہتی ہے؟ اس کی منزل کیا ہے؟ وہ ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتی مگر اسے کوئی واضح جواب نہ ملتا۔ اس کے ذہن میں بہت سی پرچھائیاں گڈمڈ ہو جاتیں۔ اس کے محسوسات کی دنیا میں عجیب اندھیرا سا پھیلا ہوا تھا۔

کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ وہ ہمایوں سرور کے سوا کسی کو پسند نہیں کرتی اور نہ ہی کر سکتی ہے لیکن شاید وہ اپنے آپ سے اس کا اعتراف نہیں کر سکتی تھی اور اس راستے میں کیا رکاوٹ آن کھڑی ہوئی تھی' یہ بھی اسے معلوم نہیں تھا۔ کیا انا کی دیواریں اتنی بلند بھی ہو سکتی ہیں؟ وہ حیرت سے سوچتی مگر وہ جو محبت میں مبتلا ہوتے ہیں ان کی دنیا سے تو انا کا گزر کم ہی ہوتا ہے' اور اگر وہ ہمایوں کی محبت میں مبتلا نہیں تھی تو پھر اس کا دھیان کسی اور طرف کیوں نہیں جاتا؟ وہ کسی اور کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتی تھی؟ اس کی دنیا میں اب ہر طرح کے مردوں کی آمدورفت تھی۔ ان میں اکثر کی آنکھوں میں نوازشوں کے رنگ جھلکتے تھے مگر وہ کیوں کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی کیا اسے بھی کسی کا انتظار تھا؟ اگر اسے ہمایوں کا انتظار تھا تو وہ اس کے لیے دل کا دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟ وہ کب سے دروازے پر خاموش دستکیں دے رہا تھا۔

ایک روز اسے ہمایوں کے ساتھ کسی کمرشل فلم کے اسکرپٹ پر ڈسکشن کرنی تھی۔ آرڈی صاحب کی ہدایت تھی کہ اس فلم کا اسکرپٹ وہ دونوں مل کر فائنل کریں۔ ورنہ اس سے پہلے ہوتا عموماً یہ تھا کہ ان دونوں کو الگ الگ کام دیے جاتے تھے۔ کبھی کبھار ہی کسی پروجیکٹ پر انہیں مل کر کام کرنا پڑتا تھا۔

تبادلۂ خیال کے لئے ہمایوں اس کے کمرے میں آیا ہوا تھا۔ اسکرپٹ پر بحث مکمل ہو چکی تھی۔ وہ فائلیں اور کافی کی پیالیاں ایک طرف کھسکاتے ہوئے تھکے تھکے سے انداز

میں بولا۔ "کام' کام' کام۔ صبح شام انہی چکروں میں زندگی تیزی سے گزرتی جا رہی ہے۔ تمہیں معلوم ہے عالیہ! یہ زندگی مٹھی میں دبی ہوئی ریت کی طرح ہوتی ہے؟ ماہ و سال ہاتھ سے پھسلتے جاتے ہیں اور پتا بھی نہیں چلتا' ایک روز اچانک ہی انکشاف ہوتا ہے کہ مٹھی خالی رہ گئی ہے۔"

"ہاں' یہ بات شاید میں نے ہی کسی انشورنس کمپنی کے اشتہار میں لکھی تھی۔" عالیہ نے کرسی کے پشتے پر ٹیک لگاتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

"شکر ہے' آپ کو اپنی یہ بات یاد ہے۔" وہ اپنے مخصوص اداس سے انداز میں مسکرایا۔ "میں آپ کو یہی بتانا چاہتا تھا کہ لکھنے والے عموماً عملی زندگی میں اپنے لفظوں کا پاس نہیں رکھتے۔"

عالیہ خاموشی اور سنجیدگی سے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگائے اسے دیکھتی رہی۔

ہمایوں میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے بولا۔ "ماہ و سال ہم لوگوں کے ہاتھوں سے بھی پھسلے جا رہے ہیں اور ہم ان کے بارے میں کبھی نہیں سوچتے۔" دفعتاً اس نے اپنے ایک کان کے قریب انگلی رکھی اور چہرہ قدرے ترچھا کرتے ہوئے بولا۔ "یہ دیکھ رہی ہیں آپ؟ قلموں میں اِکا دُکا سفید بال نمودار ہونے لگے ہیں۔"

"یقین کیجئے' اگر آپ کے بالوں میں سفیدی نمودار ہونے لگی ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔" عالیہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

ہمایوں نے مجروح سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا گویا کہہ رہا ہو۔ "کبھی تو کسی بات کو سیدھی طرح سن لیا کرو اور سیدھی طرح جواب دے دیا کرو۔ یہ زندگی بڑا سنگین معاملہ ہے۔ ہر بات طنز و مزاح میں ٹالنے والی نہیں ہوتی۔"

وہ بدستور تھکے تھکے سے انداز میں چہرے پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "ویسے اگر میں چاہوں تو اس موضوع پر بھی بحث کر سکتا ہوں' دلیل دے سکتا ہوں کہ میرے بال سفید کرنے میں آپ کا بھی ہاتھ ہے۔ مجھے اتنی جلدی اپنے بال سفید ہونے کی توقع نہیں تھی لیکن خیر' آج میں بے کار قسم کی بحث کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں کیونکہ جو انسان قائل ہونے کے لئے تیار ہی نہ ہو اس سے بحث فضول ہوتی ہے اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ

اس دنیا میں کوئی بھی انسان دوسرے کی بات کا قائل ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔"

"مجھے لفظوں کے ہیر پھیر والی باتیں زیادہ اچھی نہیں لگتیں۔" عالیہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ویسے بھی یہ کمپنی ہمیں جو بھاری تنخواہیں دیتی ہے وہ اس لئے نہیں دیتی کہ ہم یہاں بیٹھ کر بے کار کی باتیں کریں یا ذاتی نظریات پر بحث کریں۔"

"ہم نے بارہا دفتری اوقات کے بعد بھی یہاں بیٹھ کر گھنٹوں کمپنی کے کاموں میں سر کھپایا ہے۔ ہمیں حق پہنچتا ہے کہ کبھی کبھی دفتری اوقات میں ذاتی بات بھی کر لیا کریں۔ ویسے بھی آپ سے کہیں اور تو ملاقات ہو ہی نہیں سکتی نا۔" وہ بولا۔

عالیہ خاموش رہی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ اچانک بولا۔ "عالیہ! کیا میں بہت بُرا آدمی ہوں۔"

عالیہ گویا ذہن پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی آپ کے بارے میں اس قسم کا کوئی ریمارک دیا ہو۔"

"پھر وہی تجاہل عارفانہ۔" وہ یاسیت زدہ لہجے میں بولا۔ "اگر میں بُرا آدمی نہیں ہوں تو مجھ سے یہ خاموش عداوت کیسی؟"

"عداوت.........!" عالیہ نے مصنوعی حیرت سے دہرایا اور آنکھیں کچھ پھیلا لیں۔

"ہاں' عداوت......... یوں لگتا ہے' جیسے آپ میرا دل دُکھا کر' مجھے نفرت کا احساس دلا کر خوشی محسوس کرتی ہیں۔"

اس کے لہجے میں تیزی سی آگئی۔

"دیکھئے مسٹر ہمایوں!" عالیہ نے ایک خوب صورت قلم انگلیوں میں گھماتے ہوئے یک دم بڑی سرد مہری سے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم آپ اچھے آدمی ہیں یا بُرے۔ میں نے کبھی یہ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ بالفرض آپ اچھے آدمی ہیں......... تو پھر میں کیا کروں؟ دنیا میں بے شمار آدمی اچھے ہوتے ہیں۔ انسان ان سب سے تو محبت نہیں کر سکتا نا اور جہاں تک نفرت کا تعلق ہے تو نفرت بھی انسان انہی سے کر سکتا ہے جن سے کوئی تعلق یا واسطہ رہا ہو اور جن سے کوئی دکھ پہنچا ہو۔ ہمارے درمیان ایسا کوئی ناتا نہیں۔ میں آپ کا یا آپ میرا دل کیوں دُکھانے لگے؟ ہم دو الگ الگ انسان ہیں اور اپنی

اپنی جگہ اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ ہمیں اپنی جگہ خوش رہنا چاہیے۔"

ہمایوں نے ایک بار پھر مجروح سی نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔

"کبھی تو دل پر خراشیں ڈالنے سے باز آجایا کرو' کبھی تو لہجے کا زہر تھوک دیا کرو' کبھی تو آنکھوں میں سرد مہری کے پیچھے چھپے ہوئے ستاروں کو جھلملانے دیا کرو۔"

عالیہ کو معلوم تھا کہ ہمایوں ایک تیز و تند آدمی ہے۔ اس کے مزاج میں جارحیت ہے۔ وہ فتح حاصل کرنا جانتا ہے۔ ردِعمل ظاہر کرنا بھی اسے آتا ہے مگر اس وقت اس کے انداز میں بڑی شکست خوردگی تھی جیسے وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہو۔

"کیا محبت انسان کو ایسا بنا دیتی ہے؟" وہ حیرت سے سوچ رہی تھی۔

ہمایوں جیسے سنبھل کر بولا۔ "یہ کیسے ممکن ہے کہ اس بھری پری دنیا میں کوئی تنہا رہے اور خوش رہے؟"

"آپ کو کسی نے سزا تو نہیں دی تنہا رہنے کی۔" عالیہ قدرے ملائمت سے بولی۔

"اتنے لوگ ہیں دفتر میں' دوستیاں کیجیے۔ لڑکیاں بھی ماشاء اللہ تسلی بخش تعداد میں آپ کے گرد منڈلاتی ہیں۔ ان میں سے کسی سے تنہائی کا علاج دریافت کیجیے۔"

"ضرور کر لیتا' اگر دل چاہتا تب۔" وہ بولا۔ "جب سے آپ اس دفتر میں آئی ہیں' کیا آپ نے مجھے کسی لڑکی میں دلچسپی لیتے دیکھا؟"

"میں کبھی دوسروں کے معاملات پر نظر نہیں رکھتی۔" عالیہ نے لاپروائی سے کہا۔

"اتنی لاتعلقی بھی اچھی نہیں ہوتی۔"

"میرے خیال میں تو تعلق داری بھی کوئی ایسی قابلِ رشک چیز نہیں۔"

"آپ سمجھتی کیوں نہیں مس عالیہ!"

"میرا خیال ہے مجھے جو کچھ سمجھنا چاہیے وہ میں خوب سمجھتی ہوں۔"

"آج اس کا فیصلہ بھی ہو ہی جانا چاہیے کہ آپ کیا سمجھتی ہیں اور میں کیا سمجھتا ہوں' میرا صبر و ضبط جواب دے چکا ہے۔"

"فیصلہ!" عالیہ نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

"ہاں فیصلہ۔" ہمایوں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کیا ہمارے درمیان کوئی جھگڑا چلا آرہا ہے جس کا فیصلہ ضروری ہے۔" وہ بڑے معصوم لہجے میں بولی۔

"ہاں' میرا خیال ہے کوئی جھگڑا ضرور ہے اور اس فساد کی جڑ آپ کے دل میں کہیں پیوست ہے۔" ہمایوں پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

عالیہ خاموش رہی اور اسے گھورتی رہی۔

"مجھے لگتا ہے کہ آپ کے اندر کی لڑکی کچھ اور کہتی ہے مگر آپ کچھ اور کرتی ہیں۔ خدا کے لیے مجھے اس کشمکش' اس جنگ کی وجہ بتا دیجئے۔" ہمایوں نے کہا۔

"اگر آپ کو میرے اندر کی لڑکی کے بارے میں کوئی خوش فہمی ہے تو اسے دل سے نکال دیجئے۔ میں ظاہر اور باطن میں بالکل ایک ہوں۔" عالیہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

"ہر انسان اپنے بارے میں یہی سمجھتا ہے مگر ایسا ہوتا نہیں۔" ہمایوں بولا۔ وہ عالیہ کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ دفعتاً اس کا لہجہ فیصلہ کن سا ہو گیا۔ اس نے یک دم گویا غیر ضروری تکلفات کو بالائے طاق رکھ دیا۔ عالیہ اس کے چہرے کی بدلتی کیفیات کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔

"دیکھو عالیہ.........!" ہمایوں نہایت دھیمی آواز میں بولا۔ "ہم اب عمر کی اس منزل میں نہیں ہیں جہاں ہم بچگانہ باتوں اور انا کے بے وقوفانہ جھگڑوں میں ماہ و سال ضائع کرنے کے متحمل ہو سکیں۔ ہم نہ تو ٹین ایج میں ہیں اور نہ ہی اس کلاس سے ہیں کہ پہلے تو برسوں تک میں پتھر میں رقعے باندھ کر تمہارے گھر کی چھت پر پھینکتا رہوں اور تم چھپ چھپ کر چق کی اوٹ سے مجھے دیکھتی رہو۔ پھر برسوں بعد ایک روز دوپٹا انگلی پر لپیٹے تم اٹک اٹک کر مجھ سے کہو کہ میں اپنی امی کو تمہارے گھر رشتے کی بات کرنے بھیجوں۔ ہم پختہ العمر' خود مختار اور برسرِ روزگار افراد ہیں۔ ہمارا رویہ عاقل اور بالغ لوگوں والا ہونا چاہیے۔ تم اتنی نادان نہیں ہو کہ اس آگ کی تپش سے بے خبر رہو جس میں' میں ایک عرصے سے جل رہا ہوں اور مجھے اپنے آپ میں کوئی ایسی قابلِ نفرت بات بھی نظر نہیں آتی جس کی بنا پر تم مستقل مجھ سے ایسا سلوک کرتی رہو۔"

ہمایوں نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا کر ایک گہری سانس لی اور تھکے تھکے سے لہجے میں بولا۔ ”بہرحال‘ بعض اوقات نفرتیں بلاوجہ بھی ہوا کرتی ہیں لیکن میں تم سے اس نفرت کا اقرار سننا چاہتا ہوں۔ مرد عام طور پر کسی سے محبت کا اقرار سننا چاہتے ہیں۔ میں تم سے نفرت کا اقرار چاہتا ہوں۔ اگر مَیں اتنا ہی بُرا ہوں‘ مَیں کسی بھی طرح تمہاری محبت کے لائق نہیں ہوں تو ایک بار واضح انداز میں‘ اپنی زبان سے یہ بات مجھے بتا دو......... تاکہ میں خاموشی سے ہمیشہ کے لیے اپنی تنہائیوں کی دنیا میں لَوٹ جاؤں اور پھر کبھی منتظر نظروں سے تمہاری طرف نہ دیکھوں۔“

وہ خاموش ہو گیا پھر اس نے بدستور عالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے ایک سگریٹ سلگائی۔ وہ شاذو نادر ہی سگریٹ پیتا تھا۔ شاید صرف اس وقت جب وہ نروس ہوتا تھا یا پھر اس وقت جب حد سے زیادہ مضطرب ہوتا تھا۔ کسی پروجیکٹ پر کام کرتے کرتے کسی نکتے پر اٹک جاتا تھا۔ اس کی انگلیوں میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

عالیہ ساکت بیٹھی تھی اور ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بالکل ایسے ہی وقار اور تمکنت کے ساتھ‘ جیسے کوئی ملکہ اپنے تخت پر براجمان ہو اور اپنے سامنے پیش ہونے والے کسی سائل کے مقدمے پر غور کر رہی ہو۔

آخرکار وہ سرگوشی نما لیکن پہلے ہی جیسے پُرتکلف لہجے میں بولی۔ ”اگر آپ کو اس سے کچھ اطمینان ہو سکتا ہے تو میں آپ کو بتا دیتی ہوں کہ مجھے آپ سے نفرت نہیں ہے مسٹر ہمایوں! اور آپ نے یہ بھی درست کہا کہ ہم ٹین ایج کے لوگ نہیں ہیں۔ عمر کی بہت سی ریت ہماری مٹھیوں سے پھسل چکی ہے۔ عورتیں اپنی عمر نہیں بتاتیں لیکن میں آپ کو بتا دیتی ہوں کہ دو ماہ پہلے میں پورے تیس سال کی ہو چکی ہوں۔ اس عمر میں جذبے کے تحت نہ سہی تو ضرورت کے تحت بھی بہت سی چیزوں کو قبول کر لیا جاتا ہے لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ جب چق کے پیچھے کھڑے ہو کر چوری چوری کسی کو دیکھنے کی عمر تھی‘ میں نے اس وقت بھی کسی کو نہیں دیکھا۔ شاید اس لیے کہ میں بیشتر لڑکیوں کی طرح رومینٹک نہیں ہوں۔ شاید میرے اجزائے ترکیبی میں کوئی جز کم رہ گیا ہے۔ میں نے کبھی عشق و محبت سے شرابور افسانے بھی نہیں پڑھے اور کبھی اپنی ڈائری میں دردناک

قسم کے شعر بھی جمع نہیں کیے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس وقت کسی نے اتنی توجہ سے میری طرف دیکھا ہی نہیں۔ شاید میں بہت بے کشش اور غیر دلچسپ لڑکی تھی۔ میں آپ کو بتا رہی ہوں بلکہ یوں سمجھیے کہ خبردار کر رہی ہوں کہ میں اب بھی کوئی زیادہ قابلِ محبت لڑکی نہیں ہوں.........“

”میں اس کا فیصلہ تم پر نہیں چھوڑ رہا۔“ ہمایوں جلدی سے اس کی بات کاٹ کر بولا۔

عالیہ گویا اس کے الفاظ پر توجہ دیے بغیر خواب زدہ سے انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”اگر آپ مجھے یہ احساس دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس عمر کی مناسبت سے ہمیں کسی کو محبت کے تحت نہ سہی تو ضرورت کے تحت ہی قبول کر لینا چاہیے تو اس ضمن میں بھی میری کچھ مجبوریاں ہیں۔“

”وہ کیا؟“ ہمایوں پُرتجسس انداز میں کچھ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”اس کے لیے میں یہ ضروری نہیں سمجھتی کہ پہلے آپ مجھ سے اظہارِ محبت کریں......... پھر ہم ہوٹلوں میں کھانا کھانے اور سینماؤں میں فلمیں دیکھنے جائیں پھر شادی کی بات چلے‘ پھر شرطیں طے ہوں اور آخرکار خوب صورت لفظوں کے لبادوں میں لپٹا ہوا یہ سودا اختتام کو پہنچے۔“ عالیہ نے ایک بے کار کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت اپنے دل کے دھڑکنے کی دھمک کنپٹیوں میں محسوس کر رہی تھی مگر بظاہر اس نے اپنے سکون اور ٹھہراؤ میں فرق نہیں آنے دیا تھا۔

”تو پھر آپ کیا چاہتی ہیں؟“ ہمایوں گویا زچ ہو کر بولا۔

”آپ مجھے مختصر ترین اور آسان ترین لفظوں میں بتائیے کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟“ عالیہ نے بوجھل سی پلکیں بمشکل اٹھا کر بظاہر بڑی جرأت مندی سے اس کی طرف دیکھا۔

ہمایوں نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر گویا سارے فسانۂ دل کو چند لفظوں میں سمیٹتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

عالیہ کو اپنے کانوں کی لویں تپتی ہوئی محسوس ہوئیں‘ لیکن بظاہر وہ لاپروائی سے ایک بار پھر کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے بولی۔ ”اس کے لیے بہتر طریقہ یہی ہے

کہ آپ کا کوئی بزرگ یا آپ خود میرے والد صاحب سے بات کریں۔"

ہمایوں کی آنکھوں میں یک بیک جیسے ستارے جھلملانے لگے۔ اسے جیسے کسی نے بھنور سے نکال لیا تھا۔ اس کی زندگی کا سنگین ترین مسئلہ جیسے کسی نے چٹکی بجاتے ہی حل کر دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہفت رنگ روشنیوں کا پرَتو نظر آنے لگا تھا۔ اسے جیسے کسی نے نئی زندگی دے دی تھی۔

لیکن دوسرے ہی لمحے گویا سب روشنیاں بجھ گئیں' سب رنگ اُڑ گئے۔ جب عالیہ نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ "مگر مجھے امید نہیں کہ ہماری شادی ہو سکے گی۔"

"کیوں؟ کیا تمہارے والد صاحب مجھے ناپسند کریں گے؟" اس کے لہجے میں اس کا اپنا مخصوص جارحانہ سا انداز آگیا اور وہ جواب کا انتظار کئے بغیر بولا۔ "کیا نقص یا عیب ہے مجھ میں؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" عالیہ تحمل سے بولی۔ "انکار شاید مجھے ہی کرنا پڑے۔"

"میں ایک بار پھر پوچھنا چاہوں گا کیوں؟" اس بار وہ بھی بڑے تحمل سے بولا لیکن اس کی آنکھوں میں اذیت تھی جیسے مسلسل کچھ برداشت کرتے کرتے وہ نیم جاں ہو گیا ہو۔

"اس کیوں کا جواب ذرا طویل ہے۔" عالیہ گہری سانس لے کر بولی۔ اب اس آنکھ مچولی سے گویا وہ خود بھی تھک گئی تھی۔

"میں یہ "طویل جواب" ضرور سننا چاہوں گا مس عالیہ!" ہمایوں نے کہا۔ "میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ آج فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ بہرحال' کیا میں آپ کی طرف سے انکار کی وجہ جان سکتا ہوں۔"

وہ منتظر نگاہوں سے ایک ٹک عالیہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"بات یہ ہے ہمایوں صاحب!" ایک لمحے کے توقف کے بعد عالیہ دھیرے سے بولی۔ "میں وہ نہیں ہوں جو نظر آتی ہوں۔ میں کسی امیر کبیر گھرانے کی لاڈوں میں پلی بیٹی نہیں ہوں۔ میں ایک بہت ہی غریب سے باپ کی بیٹی ہوں گو کہ میں ایسی نظر نہیں آتی۔ میں فر فر انگلش بولنے لگی ہوں لیکن میں اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھی ہوں۔ میں اپنے والد

صاحب کے ساتھ اب بھی بس اوسط درجے کے ایک فلیٹ میں رہتی ہوں۔ اپنا کیریئر بہتر بنانے کے بعد میں نے خاصی رقم پس انداز ضرور کرلی ہے اور گاڑی بھی رکھی ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود..........میں سمجھتی ہوں کہ میرا سوشل اسٹیٹس وہ نہیں ہے جو نظر آتا ہے اور جو شاید آپ کے بھی ذہن میں ہو۔"

"اوہ.........." ہمایوں نے ایک طویل سانس لی۔ "میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ معلوم نہیں آپ کون سا انکشاف کرنے لگی ہیں۔ آپ جو کچھ مجھے بتا رہی ہیں' کیا آپ کے خیال میں یہ بہت شرمناک باتیں ہیں؟"

"نہیں' شرمناک تو نہیں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "پھر بھی میں بہتر سمجھتی ہوں کہ میرے بارے میں جو شخص زندگی کا اہم ترین فیصلہ کرنے جا رہا ہو وہ ذرا بھی اندھیرے میں نہ رہے۔ کل کو میری کوئی بات اس کا پچھتاوا نہ بن جائے۔"

"یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔" اس نے لاپروائی سے سر جھٹکا۔

"آپ کے لیے ہوں گی لیکن میں سمجھتی ہوں کہ.........."

ہمایوں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "دیکھو عالیہ! ہم کوئی کاروبار نہیں کر رہے کہ بیٹھ کر چیزوں کی ویلیوایشن کا حساب ہو۔ یہ تو دلوں کے سودے ہیں اور یہ سودے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس میں عقل و ہوش کا عمل دخل بالکل نہیں ہوتا۔ بغیر کسی سود و زیاں کے خیال سے جان کی بازی ہار بھی بازی مات نہیں سمجھی جاتی۔ بے شک یہ شاعرانہ تخیل کی باتیں ہیں لیکن محبت کے سلسلے میں صرف دل کے احکامات چلتے ہیں' عقل کی بالکل نہیں چلتی۔ میں تین سال سے اس محبت کی دل ہی دل میں پرورش کرتا رہا۔ میں یہ نہیں مان سکتا کہ چاہت کی آگ جو میرے سینے میں دہک رہی ہے اس کی تپش تم نے محسوس نہ کی ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ میں اٹھتے بیٹھتے' وقت بے وقت اس کا اظہار نہ کر سکا۔

ہم سے محبتوں کی نمائش نہ ہو سکی
بس اتنا جانتے ہیں تمہیں چاہتے ہیں ہم"

عالیہ گم صم اس کے باوقار اظہارِ محبت کو سنتی رہی۔ اس کا دل اس کے قابو میں نہیں رہا تھا۔ اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار

دل کو اس انداز میں رقصِ کناں محسوس کیا تھا۔

"بہرحال........." ہمایوں ایک گہری سانس لے کر دوبارہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "آپ کی طرف سے چاہے نہ ہو لیکن کم از کم میری طرف سے یہ دل کا سودا ہے۔ اگر مجھے باقی باتوں سے دلچسپی ہوتی تو پہلے میں ان کے بارے میں جاننے کی فکر کرتا۔ اب ذکر چل ہی نکلا ہے تو آپ کی اطلاع کے لیے بتاتا چلوں کہ میں بھی کسی جاگیردار یا سرمایہ دار فیملی سے نہیں ہوں۔ میں بھی ایک سیلف میڈ انسان ہوں۔ آپ اردو میڈیم اسکولوں کی بات کرتی ہیں' میں نے تو ان سکولوں میں پڑھا ہے جہاں ڈیسک بھی میسر نہیں ہوتے' بچوں کو ٹاٹ پر بٹھا کر پڑھایا جاتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں ایک ایسے باپ کا بیٹا ہوں جو آخرکار اپنی صلاحیتوں اور حد درجہ ایمان داری کے باعث بڑے اونچے عہدے تک پہنچ گئے تھے۔ یہ غلط ہے کہ جس ادارے میں رشوت خوری عام ہو' اوپر سے نیچے تک اور چھوٹے سے بڑے تک سب لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہوں تو ایسے گندے تالاب میں کوئی صاف ستھری مچھلی زندہ نہیں رہ سکتی۔ ڈیڈی نے اس تصور کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ انہوں نے زندگی بھر رشوت کے طور پر ایک پیسہ نہیں لیا' بعد میں ہمارے حالات بہتر تو ہو گئے تھے لیکن اس حد تک بھی نہیں جیسا کہ ڈیڈی کا منصب تھا۔ وہ تنخواہ کے علاوہ ایک پیسہ قبول نہیں کرتے تھے۔ ہم چھوٹے مگر صاف ستھرے بنگلے میں رہنے لگے۔"

ہمایوں نے سر جھٹک کر دھیرے سے مسکرا کر کہا۔ "بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ بات صرف یہ ہے کہ انسان میں اگر صلاحیتیں ہوں تو اس کے لیے اپنی کایا پلٹنا کوئی زیادہ مشکل بات نہیں ہے۔ بہرحال یہ جو ظاہری ٹپ ٹاپ اور منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی بولنے والا معاملہ ہے' اسے میں مجبوراً اور کاروباری ضرورت کے تحت ٹھیک ٹھاک سمجھتا ہوں ورنہ میری نظر میں یہ کوئی زیادہ قابلِ فخر چیزیں نہیں ہیں۔ اندر سے میں بڑا سادہ اور دیسی آدمی ہوں۔ میں ایک بات اور واضح کر دوں' میرا خیال ہے روپیہ پیسہ ہم دونوں کا ہی پرابلم نہیں ہے۔ ہم لوگوں کو اس وقت بھی خدا کا شکر ہے کہ زندگی کی ہر آسائش میسر ہے لیکن اگر کبھی ہمیں بہت زیادہ پیسے کی ضرورت' خواہش یا ہوس محسوس بھی ہوئی تو مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں مل کر بہت پیسہ بھی کما سکتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے کوئی مشکل

کام نہیں۔ اب تو آپ کے خدشات دور ہو گئے۔ جو کچھ آپ واضح کرنا چاہتی تھیں وہ آپ نے واضح کر دیا اور میں نے تو وہ کچھ واضح کر دیا جو میرے خیال میں کوئی ضروری نہیں تھا اور کوئی بات؟"

"ایک مسئلہ اور ہے۔" عالیہ گویا آج ہی سارے مسائل کی پٹاری کھولنے پر تلی ہوئی تھی۔

"وہ بھی بتا دیجیے۔"

"میرے والد ٹی بی کے مریض ہیں۔ میں انہیں نوکرانی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر شادی کر کے دوسرے گھر نہیں جا سکتی اور اگر وہ میرے ساتھ رہتے ہیں تو شاید میری ازدواجی زندگی خوشگوار نہ گزر سکے۔"

"یہ خیال آپ کو کیوں آرہا ہے کہ یہ مسئلہ ہماری ازدواجی زندگی پر اثر انداز ہو گا؟"

"میرا مشاہدہ ہے کہ شادی کے بعد شاید مرد اتنا فراخ دل نہیں رہتا۔ کون جانے کہ کوئی ٹی بی کے ایک مریض کو کب تک گھر میں برداشت کر سکے؟ اس کا حل مجھے یہی نظر آتا ہے کہ میں شادی نہ کروں۔ مجھے ان سے اتنا پیار ہے کہ میں ان کی خاطر اپنی زندگی تج سکتی ہوں' وہ ایک آئیڈیل باپ ہیں۔"

ہمایوں چند لمحے تک عجیب سی نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی نظروں میں ستائش اور الجھن کا ملا جلا رنگ تھا۔ بالآخر وہ بولا۔ "میں آپ کی باتوں سے الجھن سی محسوس کرنے لگا ہوں........"

"ابھی سے۔" عالیہ اس کی بات کاٹ کر حیرت سے بولی۔ "ابھی تو شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"آپ نے تو شادی کو ایک مسرت بھرے ملاپ کے بجائے ایک سنگین مسئلہ بنا کر رکھ دیا ہے۔" وہ قدرے جھنجلا کر بولا۔

"میں ہر بات واضح کر دینا مناسب سمجھتی ہوں۔" عالیہ نے کہا۔ "میں نہیں چاہتی کہ........"

ہمایوں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "مانا کہ آپ نے کبھی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی مگر اب مجھے اتنے چھوٹے دل کا بھی مت سمجھئے کہ جس سے میں محبت کروں اس کے سر پر اس کے بزرگوں کا سایہ بھی برداشت نہ کر سکوں۔ میں اس دنیا میں اکیلا ہوں شاید تمہارے والد کی موجودگی میرے لیے بھی تقویت کا باعث ہو۔ چراغ اگر ٹمٹما رہا ہو تب بھی اس کی روشنی دل کو سہارا دیتی ہے۔"

"ایک بار پھر سوچ لو۔" عالیہ نے گویا اسے ڈرایا۔ "میں نے جو کچھ کہا ہے ان سب باتوں پر اچھی طرح غور کر لو۔"

"محبت کرنے والے زیادہ سوچا نہیں کرتے۔" ہمایوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عالیہ نے گردن جھکا دی۔

"تم نے بہت ستایا ہے عالیہ' بہت تڑپایا ہے۔" ہمایوں اٹھ کر اس کی میز پر دونوں ہاتھ ٹکا کر قدرے جھکتے ہوئے بولا۔ "بہرحال' تم نے ایک قیمتی انسان کو برباد ہونے سے بچا لیا۔ تمہارا بہت شکریہ عالیہ! میری محبت کی تپش نے بالآخر تمہارے وجود پر جمی سرد مہری کی برف کو پگھلا دیا ہے۔ میری چاہت ثمربار ہوئی۔" اس کی آواز شدتِ جذبات سے لرز رہی تھی۔

وہ نسیم سحر کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گیا۔ جانے کیوں عالیہ کا دل بھر آیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس نے کہیں پڑھا تھا۔

"عورتیں بھی عجیب ہوتی ہیں' زیادہ خوشی ملے تب بھی رونے لگتی ہیں۔"

آج وہ بھی انہی "عجیب عورتوں" میں شامل ہو گئی تھی۔ اس کا رواں رواں مسرت سے معمور تھا مگر وہ رو رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

اس رات عالیہ اپنے والد کو کھانا کھلا کر دوا پلانے کے بعد اپنے کمرے میں جانے کے بجائے ان کے بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر تذبذب اور کشمکش کے تاثرات دیکھ کر وہ بولے۔ "عالیہ بیٹی! کیا بات ہے؟ کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

"جی ابو! مم.......... میں.........." وہ محض ہکلا کر رہ گئی اور گود میں رکھے ہاتھوں کی

انگلیاں مڑورنے لگی۔

"کہو بیٹی!" اس کے والد نے عالیہ کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ کہنا ہے' کھل کر کہو۔" پھر انہیں کوئی خیال آیا اور پھر چونک کر عالیہ کا چہرہ دیکھنے لگے۔ جہاں تذبذب اور کشمکش کے تاثرات کے ساتھ ساتھ حیا کی سرخی بھی لہریں لے رہی تھی۔ وہ کچھ کچھ سمجھتے ہوئے کہنیوں کے بل اوپر اٹھے اور تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ان کے نحیف اور لاغر چہرے پر مسرت کی کرنیں سی جھلملانے لگی تھیں۔

"عالیہ.......... ! بیٹی' کہیں تم نے وہ فیصلہ تو نہیں کر لیا جسے تم ایک عرصے سے ٹالتی آ رہی ہو؟" ان کے لہجے سے بھی خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

عالیہ کی گردن کا خم مزید بڑھ گیا۔

عالیہ کے بیمار والد کے نحیف و نزار جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ "اللہ تیرا شکر ہے! ورنہ میں تو سمجھا تھا' تم میری خاطر.........." وہ جملہ پورا نہ کر سکے اور رو پڑے۔

عالیہ تڑپ کر اٹھی اور ان سے لپٹ گئی۔ "ابو! آپ رو کیوں رہے ہیں؟ اگر میرا یہ فیصلہ آپ کو.........."

"نہیں بیٹی' میں رو کہاں رہا ہوں۔" وہ عالیہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے مسکرا کر بولے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

"زندگی نے ایک عرصے کے بعد ایک خوشی عطا کی ہے' میں بہت خوش ہوں بیٹی۔ تم نے بالآخر شادی کا فیصلہ کر لیا۔ میں وہ بدنصیب باپ ہوں جو اپنی اکلوتی بچی کو کوئی خوشی نہ دے سکا' بلکہ اس کی خوشیوں کی راہ میں ایک چٹان کی طرح حائل رہا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ عالیہ بھی خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس کی آنکھوں سے بھی اشک رواں ہو گئے۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں سنبھلے تو عالیہ نے عزیز صاحب کو لٹا کر ان کے سینے تک کمبل اوڑھا دیا اور خود کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کون ہے وہ.........." انہوں نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"وہ.......... ہمایوں سرور.......... اسی دفتر میں کری ایٹو ڈائریکٹر ہیں جس میں' میں کام

کرتی ہوں.........."

"میں اس کا بھی احسان مند ہوں۔ کیا نام بتایا تم نے' ہمایوں سرور جس نے میری مشکل حل کر دی۔"

"آپ ہمارے ساتھ رہیں گے ابو!" عالیہ نے دھیرے سے کہا۔ "ہم دونوں اس سلسلے میں بات کر چکے ہیں۔"

عزیز صاحب کی نظروں میں بے بسی' اپنی لاچاری اور بیٹی کی محبت سے نمی سی تیر آئی لیکن انہوں نے اس نمی کو چھلکنے نہیں دیا۔

☆======☆======☆

شادی بڑی سادگی سے ہوئی تھی۔ مقامی ہوٹل میں چند دوستوں کی موجودگی میں نکاح ہوا۔ اس وقت عزیز صاحب چاق چوبند نظر آرہے تھے۔ وہ بالکل صحت مند تو نہیں ہوئے تھے لیکن بیٹی کی شادی کے دن گویا انہوں نے تمام کمزوری اور بیماری کو شکست دے دی تھی۔ وہ چھڑی کے سہارے سیاہ شیروانی میں ملبوس مہمانوں کے درمیان چلتے پھرتے رہے۔

عالیہ اور ہمایوں ہنی مون پر سوات آئے ہوئے تھے اور ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

اس روز وہ سیر و تفریح کے لیے باہر جانے کو تیار ہو رہے تھے۔ عالیہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی میک اپ کر رہی تھی اور ہمایوں سرور اس کے عقب میں کھڑا شیو بنا رہا تھا۔

دفعتاً ہمایوں برش روکتے ہوئے بولا۔ "اسے کہتے ہیں کفایت شعاری' ایک ہی آئینے سے میاں بیوی کام چلا رہے ہیں۔"

"اسے کفایت شعاری نہیں' کاہلی کہتے ہیں۔" عالیہ نے گویا تصحیح کی۔

"کاہلی.........!"

"جی ہاں کاہلی۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ باتھ روم میں جاکر شیو بناؤ مگر تمہیں ڈھائی قدم چلنے کی توفیق نہیں ہوئی۔"

"ارے' اب تم سے ڈھائی قدم دور جانا کس بدبخت کو گوارا ہے۔" ہمایوں ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"بس شروع ہو گئیں مجنوؤں والی باتیں۔" عالیہ مصنوعی خفگی سے بولی۔ ابھی اس نے بلش نہیں لگایا تھا لیکن اس کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔

ہمایوں آئینے میں اس کا عکس دیکھتے ہوئے شریر لہجے میں بولا۔ "بڑا شوق تھا تمہیں پختہ عمر کی بردبار لڑکی نظر آنے کا' مگر اب اسکول کی ٹین ایجر لڑکیوں کی طرح شرمانے لگی ہو۔"

عالیہ کے رخساروں کی تپش بڑھ گئی حالانکہ موسم بے حد خنک تھا۔ اس نے جلدی جلدی چہرے پر فاؤنڈیشن ملنی شروع کر دی۔

دفعتاً وہ ہاتھ روک کر شرمیلے سے لہجے میں بولی۔ "میں تمہیں ایک اہم بات بتاؤں؟"

"کیا اب بھی کوئی بات باقی رہ گئی ہے؟"

"ہاں' ایک خاص اور اہم بات تو بتانے سے رہ گئی تھی۔" عالیہ نے کہا۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ تم ساری باتیں مجھے بتا چکی ہو۔ اچھا.......... خیر' بتاؤ۔" ہمایوں نے گہری سانس لی۔

"تمہیں معلوم ہے' جس روز ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں میرا اپائنٹ منٹ ہوا ہے اس روز درحقیقت.........."

ہمایوں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے معلوم ہے۔"

"تمہیں کچھ نہیں معلوم! میری بات مت کاٹو' پوری بات سنو۔" عالیہ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"تم یہ بتانے لگی ہو ناکہ جس روز تمہارا تقرر ہوا ہے اس روز درحقیقت تم دوبارہ آئی تھیں۔ اس سے پچھلے روز بھی تم خاصے دقیانوسی حلیے میں آچکی تھیں' میں نے تمہارا خوب مذاق اڑایا تھا اور تم بے حد دل برداشتہ ہو کر چلی گئی تھیں۔" اس نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ "یہی بتانے لگی تھیں نا تم؟"

عالیہ اسٹول پر ایک دم اس کی طرف گھوم گئی تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

"تو.......... تو.......... تمہیں یہ بات معلوم تھی..........؟ تم نے مجھے پہچان لیا تھا؟" وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

"دوسرے دن ہی پہچان لیا تھا محترمہ! اب مابدولت اتنے چغد بھی نہیں ہیں۔ آپ کے خیال میں آپ کے حسن کی چکاچوند دیکھ کر میری عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی۔ شاید آپ بھول گئی ہیں کہ مابدولت کو دفتر میں مسٹر جینیئس کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ یہ خطاب یونہی تو نہیں مل گیا۔" ہمایوں بڑے اطمینان سے ٹھوڑی پر برش گھماتے ہوئے بولا۔

"لیکن تم نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔" عالیہ تھوک نگل کر بولی۔

"ارے' تم نے ہمیں کسی بھی بات کا اظہار کرنے کا موقع ہی کب دیا۔" ہمایوں آہ بھر کر بولا۔ "اور ویسے میرے خیال میں یہ کچھ ایسا ضروری بھی نہیں تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ تمہاری اسی کایا پلٹ نے مجھے جس حیرت میں مبتلا کیا وہی حیرت بڑھتے بڑھتے محبت بن گئی۔ باصلاحیت لوگ مجھے ہمیشہ متاثر کرتے ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر مبہوت ہو جاتا ہوں' تم نے بھی مجھے مبہوت کر دیا تھا اور میں آج تک مبہوت ہوں' دم بخود ہوں کہ کیا تم وہی گھبرائی ہوئی سی' بے وقوف سی' بدلباس سی.......... اور دقیانوسی سی لڑکی ہو جسے میں نے پہلے دن ڈانٹ کر بھگا دیا تھا۔"

عالیہ آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔ "کاروباری حلقوں میں تمہیں بیمار کمپنیوں کا مسیحا کہا جاتا ہے نا' میں جب پہلی بار تمہارے سامنے آئی تو میں بھی ایک بیمار اور فلاپ کمپنی کی طرح تھی۔ تمہاری نظر پڑی تو ایک کامیاب کمپنی بن گئی۔ تمہاری تحقیر' تمہاری ڈانٹ پھٹکار میرے لیے تریاق بن گئی۔ تمہارے لفظوں سے تین برس تک میرا دل زخمی رہا مگر آج میں ان سارے لفظوں کے لیے تمہاری شکر گزار ہوں۔ بہت زیادہ ممنون ہوں' تم نے ایک معمولی لڑکی کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔"

عالیہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہمایوں کے لیے محبت'

عقیدت' ستائش اور شکر گزاری کے سمندر کروٹیں لے رہے تھے۔ ہمایوں نے اسے کھینچ کر اپنے سے لپٹا لیا۔

☆======☆======☆

ہمایوں اور عالیہ پورا ایک مہینہ سوات اور شمالی علاقہ جات میں ہنی مون گزار کر لوٹے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی رفاقت پا کر بالکل بچے بن گئے تھے۔ یہ ایک مہینہ انہوں نے اس طرح گزارا تھا کہ زندگی کی البم میں یہ مناظر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گئے تھے۔

جس دن وہ دونوں لوٹے تھے اسی دن شام کو آرڈی صاحب کا فون آیا تھا لیکن ہمایوں نے انہیں اپنا فیصلہ سنا دیا کہ وہ مزید ایک مہینہ دفتر کا رُخ نہیں کریں گے اور ارادہ ظاہر کیا کہ وہ کراچی جائیں گے۔ گھومیں گے' پھریں گے۔ اس کے بعد واپسی پر آ کر کچھ دن آرام کرنے کے بعد ہی دونوں دفتر آئیں گے۔ اس میں ایک ماہ سے زیادہ بھی لگ سکتا ہے۔ آرڈی صاحب نے بخوشی انہیں اس کی اجازت دے دی تھی۔

تیسرے دن ہمایوں' عالیہ کے ساتھ بیٹھا کراچی جانے کے پروگرام پر گفتگو کر رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ جب وہ فون سن کر لوٹا تو عالیہ نے اس میں کچھ تبدیلی سی محسوس کی۔

"کس کا فون تھا؟"

"رمیز کا۔" وہ صوفے پر بیٹھ کر بولا۔

"کیا بات ہے ہمایوں؟ تم کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔" عالیہ اس کے قریب بیٹھ کر قدرے تشویش سے بولی۔ "یہ رمیز صاحب کون ہیں؟"

"یہ وہ شخص ہے جسے میں جنون میں آکر قتل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔"

"ک.......... کیا؟" عالیہ دم بخود رہ گئی۔

"ہاں۔" ہمایوں کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔ "جب انسان ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے تو ایسے ہی الٹے سیدھے فیصلے کرتا ہے۔"

"آخر ہوا کیا تھا؟"

"میں اسے ثمینہ کا قاتل سمجھنے لگا تھا۔"

ثمینہ' ہمایوں سرور کی بڑی بہن تھی۔ شادی کے بعد ہمایوں نے اپنے متعلق بتاتے ہوئے اس کے بارے میں صرف اتنا کہا تھا کہ وہ ایک حادثے میں مرگئی تھی۔ بعد میں عالیہ نے محسوس کیا کہ وہ اپنی بہن کی موت کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔ عالیہ نے زیادہ کرید بھی نہیں کی تھی۔

"ثمینہ سے میں بہت محبت کرتا تھا۔" ہمایوں بتانے لگا۔ "وہ مجھ سے صرف چھ سال بڑی تھی لیکن ماں کے فوت ہونے کے بعد اس نے میرا اس طرح سے خیال رکھا کہ جیسے ماں کے بعد اس نے خود کو ماں کی جگہ فائز کرلیا تھا۔ اس کی محبت میں' مَیں نے کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں کی' حالانکہ اس کی عمر ہی کیا تھی۔ اس کی نسبت بچپن میں ہی تایا زاد بھائی عامر سے طے کر دی گئی تھی۔ میرے تایا لندن میں رہتے ہیں۔ وہ ایک بار اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان آئے تو جاتے جاتے ثمینہ کی منگنی اپنے بیٹے کے ساتھ کر گئے۔ اس وقت عامر بمشکل بارہ سال کا تھا۔ ڈیڈی اور تایا اس منگنی پر بہت خوش تھے لیکن وہ جو ایک مقبولِ عام شعر ہے ؎

نا عقل آرائی و تدبیر سے کیا ہوتا ہے'
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

ثمینہ ایم اے کر چکی تھی۔ ڈیڈی لندن سے اپنے بڑے بھائی کے اشارے کے منتظر تھے مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تین مہینے بعد تایا اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان آنے والے تھے۔ انہوں نے ڈیڈی کے کان میں یہ بات بھی ڈال دی تھی کہ اس بار وہ ثمینہ کو اپنی بہو بنا کر ساتھ لے جائیں گے۔ ڈیڈی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ میں ثمینہ کے اتنی دور جانے پر بہت رنجیدہ سا رہنے لگا تھا۔"

ہمایوں نے ایک گہری سانس لی اور سگریٹ سلگا کر چند کش لینے کے بعد سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "ایک رات میں اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ آہستگی سے دروازہ کھلا اور ثمینہ اندر داخل ہوئی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر وال کلاک کی طرف۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ مجھے سخت حیرت ہوئی۔"

"باجی! خیریت تو ہے۔" میں نے کتاب رکھ کر اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں' پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس نے جواب دیا تھا۔ "ڈیڈی تمہیں اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔"

میری حیرت دوچند ہو گئی تھی' اوپر سے ثمینہ کا پُراسرار سا انداز بھی مجھے پریشان کر گیا۔ میں تیزی سے اپنے کمرے سے نکلا اور ڈیڈی کے کمرے میں پہنچا۔ ڈیڈی اس وقت کسی فائل کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر انہوں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ "کیا بات ہے ہمایوں.........؟ تم سوئے نہیں اب تک؟"

"ڈیڈی! آپ نے مجھے بلوایا تھا؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"میں نے.........! نہیں تو۔" اب ان کی باری تھی حیران ہونے کی۔

"لیکن باجی نے........." میری بات ادھوری رہ گئی تھی۔ میں نے اپنے عقب میں دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی اور پلٹ کر دیکھا تو ثمینہ گردن جھکائے شرمندہ سی کھڑی تھی۔

ڈیڈی نے چشمہ اتار کر فائل کے اوپر رکھا اور اٹھ کر ہم دونوں کے قریب آگئے۔ وہ بھی پریشان ہو گئے تھے کہ رات کے گیارہ بجے ہم دونوں بہن بھائی ان کے کمرے میں آخر کیوں آئے ہیں۔ مجھے بھی کم حیرت اور پریشانی نہیں تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر ثمینہ نے ایسا کیوں کیا۔ ڈیڈی نے مجھے نہیں بلوایا تھا لیکن اس نے مجھ سے کہا کہ ڈیڈی اپنے کمرے میں میرے منتظر ہیں اور خود بھی پیچھے پیچھے چلی آئی تھی۔

"ڈیڈی! میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے آپ کو بے وقت ڈسٹرب کیا اور ہمایوں سے بھی جھوٹ بولا۔" ثمینہ نے لرزتی آواز میں کہا۔ "میں چاہتی تھی کہ ہمایوں بھی موجود ہو تو بہتر ہے........."

ڈیڈی تڑپ کر ثمینہ کی طرف بڑھے اور بڑی محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "ایسی کیا بات ہے بیٹی! تم تو مجھے خاصی نروس معلوم ہو رہی ہو۔ آؤ' شاباش۔ بتاؤ کیا پریشانی ہے تمہیں۔"

جب ہم تینوں صوفے پر بیٹھ چکے تو گردن جھکائے جھکائے اچانک ثمینہ نے کہا۔

"ڈیڈی! میں عامر کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

یہ الفاظ میری سماعت پر بم بن کر گرے۔

میں دم بخود بیٹھا ثمینہ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ گردن جھکائے ہاتھ کی انگلیاں مروڑنے میں مصروف تھی جس سے ایک ذہنی انتشار کا پتا چلتا تھا۔ اس کے جسم پر بھی میں نے ہلکی سی لرزش محسوس کی تھی۔ ڈیڈی غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ ڈیڈی نے کوئی سخت ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ بولے تو ان کے لہجے میں مَیں نے غصے یا طیش کا تاثر بالکل محسوس نہیں کیا۔

"کیوں بیٹی، اس کی وجہ بتانا پسند کرو گی؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

"ڈیڈی! مجھے معاف کر دیجئے گا۔ میری اس بات سے آپ کو یقیناً دکھ پہنچا ہو گا لیکن خدارا، اسے میری نافرمانی یا اپنے فیصلے سے بغاوت تصور مت کیجئے گا۔ میں آپ سے نافرمانی کا سوچ بھی نہیں سکتی، بغاوت تو دور کی بات ہے۔ میں نے صرف اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ میں عامر کے ساتھ شادی کر کے خوش نہیں رہ سکوں گی۔ مم.......... میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔ رمیز نام ہے اس کا۔ اس نے کئی بار میرے رشتے کے لئے اپنے ڈیڈی کو بھیجنے کی بات کی لیکن میں نے ہمیشہ اسے ٹال دیا۔ پہلے میں آپ سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اب آپ جو بھی فیصلہ کریں مجھے منظور ہے۔ آپ نے میرے مستقبل کے بارے میں بہتر ہی سوچا ہو گا۔ ہر والدین اپنی اولاد کی بہتری سوچتے ہیں۔ اب آپ کا جو بھی فیصلہ ہو گا میں اسے بے چوں و چرا قبول کر لوں گی۔ اگر آپ یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ میری شادی عامر سے ہو تو یقین کیجئے ڈیڈی میں زندگی بھر حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاؤں گی۔ کل ہی رمیز سے کہہ دوں گی کہ وہ میرا خیال دل سے نکال دے۔ اگر.......... اگر آپ.........."

ثمینہ نے اٹک اٹک کر بے ربط سے انداز میں یہ سب کچھ کہہ دیا اور پھر ڈیڈی نے اسے سینے سے لگا کر بڑی شفقت اور محبت سے کہا کہ ہم دونوں اپنے کمروں میں جا کر آرام کریں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

پوری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ دوسرے دن ناشتے کی میز پر مجھے اندازہ ہوا کہ

گزشتہ رات کوئی بھی نہیں سو سکا۔ ہم تینوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ ناشتے کے دوران میں ڈیڈی نے پوچھا۔ "ثمینہ بیٹی! یہ رمیز کون ہے؟ کس کا بیٹا ہے؟"

باجی نے کپکپاتی آواز میں رمیز کے بارے میں انہیں بتایا۔ "وہ ایک بہت بڑے صنعت کار سیٹھ سہیل کا بیٹا ہے جو میرے ساتھ.......... کالج میں پڑھتا تھا۔"

"اس سے کہہ دینا بیٹی کہ اپنے باپ کو تمہارے رشتے کے لیے بھیج دے۔" ڈیڈی کی اس بات نے میرے سر سے بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا تھا۔ ثمینہ باجی کے چہرے پر قندیلیں سی روشن ہو گئیں۔

ہمایوں نے ایک نظر عالیہ کو دیکھا اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ "اسی دن کی شام کو ثمینہ کی لاش گھر پہنچی۔"

عالیہ کو یوں لگا جیسے ہمایوں نے بولتے بولتے اچانک اس کے سر پر ٹھنڈے یخ پانی کی بالٹی انڈیل دی ہے۔ وہ دم بخود بیٹھی ہمایوں کو دیکھتی رہی۔ یہ تو اس کے علم میں تھا کہ ہمایوں کی بڑی بہن ثمینہ کسی حادثے کا شکار ہو گئی تھی لیکن وہ اس سے لاعلم تھی کہ قدرت نے اس کے ساتھ اس طرح سنگین مذاق کیا ہو گا۔ عالیہ سوچنے لگی انسان کیا کیا سوچتا ہے، کیسی تدبیریں کرتا ہے۔ لیکن تقدیر کے فیصلے سے بے خبر اپنی تدبیر پر خوش ہوتا ہے اور اس خوشی سے نہال اپنے مقدر پر نازاں ہوتا ہے کہ اس نے جو چاہا اسے پا لیا۔

"ڈیڈی نے ثمینہ کی خوشی کو مقدم جانا اور اس کے مستقبل کے لیے کیے جانے والے فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا تھا۔ وہ ثمینہ کو بہت چاہتے تھے۔ وہ تھی بھی چاہے جانے کے قابل۔" ہمایوں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔

"انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ انور بھائی کو اس بات کی اطلاع دینا ان کے لیے بہت مشکل ہے۔ بچوں کی کم عمری میں منگنی تو کیا نکاح بھی کیا جا سکتا ہے لیکن بلوغ کو پہنچ کر اگر لڑکی اس نکاح سے انکار کر دے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے مجبور نہیں کر سکتی.......... اور میں ثمینہ کو کبھی اس کی مرضی کے خلاف عامر کے عقد میں نہیں دے سکتا۔ مجھے اس کی خوشی عزیز ہے۔ میں ایک دو دن میں فون پر انور بھائی کو مطلع کر دوں گا.......... لیکن ہمایوں! وہ بہت ناراض ہوں گے۔"

عالیہ نے دھیمے سے لہجے میں ہمایوں کو ٹوکا۔ "وہ حادثہ کس طرح ہوا تھا؟" وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ ہمایوں، ثمینہ کے حادثے کی تفصیل بتانے سے گریز کر رہا ہے اور اس کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔

ہمایوں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "وہ اسی دن رمیز کو یہ خوش خبری سنانے چلی گئی تھی۔ رمیز فلائنگ کلب کا ممبر تھا اور اسے فلائنگ کا بہت شوق تھا۔ وہ لائسنس یافتہ پائلٹ تھا۔ اس روزہ وہ کلب کے ڈکوٹا طیارے میں ثمینہ کو بٹھا کر اس خوشی کو یادگار بنانا چاہتا تھا.........نیو کیمپس کے قریب طیارہ گر گیا۔ ثمینہ موقعے پر ہی ہلاک ہو گئی اور رمیز صرف زخمی ہوا۔"

ہمایوں کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ وہ رو نہیں رہا تھا لیکن آنسو اندر ہی اندر روح کو انگارے بن کر جلا رہے تھے۔ عالیہ نے اس کے ہاتھ کی پشت سہلاتے ہوئے گویا اسے تسلی دی۔

"ثمینہ کی لاش دیکھ کر میں گویا دیوانہ ہو گیا۔" ہمایوں نے دھیرے سے کہا۔ "میں چیخ چیخ کر رمیز کو قتل کرنے کے عزم کا اظہار کرتا رہا۔ جب دیوانگی کا زور ٹوٹا اور میں ہوش و حواس کی دنیا میں دوبارہ داخل ہوا تو تین دن گزر چکے تھے۔ ثمینہ منوں مٹی تلے دفن کی جا چکی تھی۔ اس وقت مجھے ڈیڈی کے حوصلے اور ان کے اعصاب پر حیرت ہوئی۔ وہ خود کو بڑی استقامت سے سنبھالے ہوئے تھے۔ شاید اس خیال سے انہوں نے خود کو سنبھالا ہوا تھا کہ بیٹی کے بعد بیٹے کو کچھ ہو نہ جائے۔ میں کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھوں۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی میں دیوانگی کی باتیں کرتا رہا کہ اس حادثے میں رمیز خود کیوں نہیں مر گیا۔ میری بہن ہی کیوں مری؟ اگر میری بہن کو مرنا ہی تھا تو رمیز کیوں بچ گیا۔ ڈیڈی نے رفتہ رفتہ میری دیوانگی کا رخ موڑ دیا اور قدرت کے اس فیصلے پر صبر کی تلقین کرتے رہے۔ وہ مجھے اسپتال لے گئے جہاں رمیز زیرِ علاج تھا۔ تب میں نے جانا کہ اس کی حالت مجھ سے زیادہ ابتر ہے۔ وہ ڈیڈی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا.......... پھر.......... پھر ایک مہینے بعد ڈیڈی بھی مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ وقت بڑا مسیحا ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دکھ کا احساس ایسے مٹ جاتا ہے جیسے پنسل سے

لکھی عبارت کو ربر سے گھس کر مٹا دیا جائے۔ اس کا عکس ہلکا پڑ جاتا ہے اور دوسری عبارت کے نیچے دب جاتا ہے مگر ختم تو نہیں ہوتا نا..........!"

ہمایوں خاموش ہوا تو عالیہ کا دل چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے، لیکن وہ بمشکل خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ ہمایوں اندر سے کتنا دکھی ہے۔ ہر انسان اپنے دل میں غموں کے کتنے سمندر سمیٹے زندگی کی راہ گزر پر ہنستے مسکراتے گزرتا ہے۔

"عالیہ! اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سخت اور مضبوط بنایا ہے۔ وہ بڑے سے بڑے غموں کے پہاڑ ڈھو کر بھی زندہ رہتا ہے۔ دیکھو، میں بھی زندہ ہوں، رمیز بھی زندہ ہے۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے گھر بسا لیے ہیں۔ رمیز نے مجھے اپنی شادی کا دعوت نامہ بھی بھیجا تھا لیکن میں خود میں اتنی جرأت نہ پا سکا کہ اس کی شادی میں شریک ہو سکتا۔ ثمینہ کی جگہ کسی اور کو اس کی دلہن کے روپ میں دیکھ کر نہ جانے میں خود پر قابو رکھ سکتا یا نہیں۔ بہرحال، رمیز نے پہلے بھی ایک بار فون کیا تھا لیکن میں ٹال گیا تھا۔ اس نے آج پھر فون کیا ہے اور ہم دونوں کو اپنے ہاں مدعو کیا ہے۔ میں نے کل شام وہاں جانے کی ہامی بھر لی ہے، تم بھی تیار رہنا۔"

☆======☆======☆

دوسرے دن شام پانچ بجے ہمایوں اور عالیہ تیار ہو کر اپنی گاڑی میں رمیز کے ہاں روانہ ہو گئے۔ ہمایوں کی کل جو کیفیت تھی اسے دیکھ کر عالیہ ڈر رہی تھی کہ رمیز کے سامنے جا کر اس کی نہ جانے کیا جذباتی حالت ہو، لیکن گھر سے روانہ ہوتے وقت ہمایوں خوب ہنس بول رہا تھا۔ راستے میں اس نے عالیہ سے کہا کہ وہ اب تک خواہ مخواہ رمیز سے.........بدظن رہا۔ اس حادثے میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ حادثہ تو کسی کے ساتھ کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ رمیز تو ثمینہ کو بہت چاہتا تھا۔

جب گاڑی لاہور کے مضافات سے گزر کر شیخوپورہ روڈ پر دوڑنے لگی تو عالیہ نے حیرت سے کہا۔ "یہ کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

ہمایوں نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "میں تمہیں اغوا کر کے نہیں لے جا رہا، ویسے بھی مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے اگر ہوتی تو شادی سے پہلے ہی تمہیں اغوا کر لیتا۔ یوں بھی کوئی

شوہر اپنی بیوی کو..........“

”میرا مطلب تھا کہ کیا رمیز صاحب شہر سے باہر رہتے ہیں؟“ عالیہ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

”ہاں‘ انہوں نے لاہور سے باہر ایک چھوٹا سا شہر آباد کیا ہوا ہے۔ صنعتی علاقے میں بہت بڑی گارمنٹ فیکٹری ہے ان کی اور وہاں ورکرز کی رہائش کے لیے ایک بہت بڑی کالونی کسی چھوٹے سے شہر کی طرح آباد ہے۔ وہیں بنگلے میں خود بھی رہتے ہیں۔“ ہمایوں نے بتایا۔

جب وہ گاڑی مین روڈ سے اس سڑک پر اتری جو رانا گارمنٹ فیکٹری تک جاتی تھی تو عالیہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ”ارے..........!“ اس کے منہ سے نکلا۔

کیا ہوا‘ کچھ بھول آئیں کیا؟ ہمایوں نے مسکرا کر پوچھا۔

”رمیز صاحب‘ سیٹھ سہیل کے بیٹے تو نہیں ہیں؟“

”ہاں‘ وہ سیٹھ سہیل کے بیٹے ہیں لیکن تم انہیں کیسے جانتی ہو؟“

”یہ میں بعد میں بتاؤں گی۔“ عالیہ اس اتفاق پر حیران تھی۔ وہ تقریباً تین سال قبل اسی فیکٹری میں چیکر کے طور پر ملازمت کر چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے تصور میں ماہم کا چہرہ گھوم گیا۔ اس نے سوچا کاش اس کی ماہم سے ملاقات ہو جائے۔

اس کی گاڑی گیٹ سے گزر کر بنگلے کی پختہ روش میں داخل ہوئی تو دائیں طرف بنے لان پر نظر پڑتے ہی اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ لان میں پڑی کرسیوں سے ماہم استقبالیہ مسکراہٹ لیے ایک وجیہہ اور پختہ العمر شخص کے ساتھ ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ وجیہہ شخص یقیناً رمیز تھا۔ عالیہ کو ان کی صورت بھی کچھ شناسا سی معلوم ہو رہی تھی۔ ممکن ہے‘ فیکٹری میں کام کرتے ہوئے کبھی ان سے سامنا ہوا ہو۔

گاڑی سے اتر کر ہمایوں نے مصافحے کے لیے رمیز کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے ہمایوں کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ وہ دفعتاً مسرت بھری زنانہ چیخیں سن کر چونک پڑے۔

”ارے‘ عالیہ..........!“

”ماہم‘ تم..........!“

دونوں نے حیرت سے خواتین کو دیکھا جو مسلسل بول رہی تھیں اور کمال یہ تھا کہ سن بھی رہی تھیں۔

”کیا ہماری بیگمات پہلے سے ایک دوسرے کو جانتی ہیں؟“ رمیز نے ہمایوں سے پوچھا۔

”میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ ہمایوں نے نیم سنجیدگی سے کہا۔ ”ممکن ہے فلمی اتفاق کے طور پر یہ بچپن سے بچھڑی ہوئی بہنیں ہوں اور آج یہاں ان کا ملاپ ہوا ہو۔ ایسے اتفاقات تو ہوتے ہی رہتے ہیں نا۔“

ماہم اور عالیہ نے بیک وقت شوہروں کی طرف رُخ کر کے کہا۔ ”رمیز! یہ ہیں عالیہ..........!“

اور عالیہ نے ہمایوں سے یہی الفاظ ماہم کے لیے کہے‘ لیکن پھر دونوں خاموش ہو گئیں۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ وہ دونوں بیک وقت بول رہی ہیں۔

”بہت خوب!“ رمیز نے ہنستے ہوئے کہا اور انہیں لان میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”میری بیوی مجھ سے تمہاری بیوی کا تعارف کرا رہی ہے اور آپ کی بیگم میری بیوی کا تعارف آپ سے کرا رہی ہیں۔ میرا خیال ہے اب ہم اپنا بھی تعارف کرا دیں۔“

”ضرور۔“ ہمایوں نے ہنستے ہوئے کہا پھر ماہم کی طرف متوجہ ہو کر قدرے جھک کر بولا۔ ”مجھے ہمایوں سرور کہتے ہیں اور میں محترمہ عالیہ کا شوہر ہوں۔“

”میں رمیز رانا! ماہم کا شوہر۔“

اس طرزِ تعارف پر لان قہقہوں سے گونج اٹھا۔

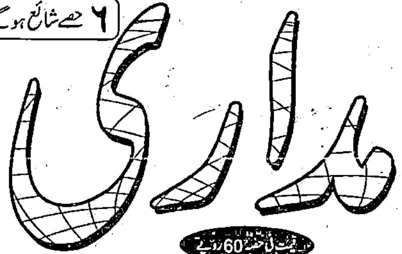
☆======ختم شد======☆

Mutahar Saleem

داستان گوئی میں ایک نئی طرز کا آغاز

احمد اقبال کے شعلہ بار قلم سے وطن کے پرآشوب حالات
کے پس منظر میں لکھی جانے والی ہوشربا داستان

۶ حصے شائع ہوگئے ہیں



قیمت فی حصہ 60 روپے

- اس شہید کا قصہ جس نے اپنی لاش اپنے ہاتھوں دفن کی تھی۔
- اسے اس ملک کی اعلیٰ ترین کرسی کی خواہش تھی اور اسے حاصل کرنے کیلئے وہ کسی بھی حد سے گزرنے کو تیار تھا۔
- خواہشوں کا مداری ڈگڈگی بجارہا تھا اور وہ اس کی تال پر بندر کی طرح ناچ رہا تھا۔
- دنیا کے سٹیج پر آتے جاتے رہنے والے کرداروں کی داستان ہوشربا۔
- چہرہ پر چہرہ چڑھائے اور بیک وقت کئی کئی زندگیاں گزارنے والوں کے فسانے۔

اپنے قریبی بک سٹال یا ہاکر سے طلب فرمائیں یا براہ راست منگوانے کے لئے
کتاب کی قیمت اور ڈاک خرچ ادارہ کے نام منی آرڈر یا ڈرافٹ بنا کر ارسال کریں

ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور ©7247414

علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

علیم الحق حقی

- عشق کا عین ۱۴۰/=
- مٹی سے عشق ۸۰/=
- شناخت ۲۰۰/=
- اماوس کا دیا ۱۵۰/=
- بول ۱۵۰/=
- پرماتما ۱۶۰/=
- تاش کے پتے ۱۵۰/=
- ہٹلر کی واپسی ۱۲۰/=
- آنکھوں میں دھنک ۸۰/=
- میر کارواں ۸۰/=
- کلاکار ۱۰۰/=
- برف کے باٹ ۱۰۰/=
- انسانی قیامت ۱۰۰/=
- زنداں نامہ ۱۰۰/=
- طوفان کے بعد ۱۵۰/=
- اچھوت ۸۰/=
- ہزاروں خواہشیں ۱۰۰/=
- لہو کے تاجر ۱۲۰/=
- نسلوں کا قرض ۸۰/=
- شب احتساب ۸۰/=
- چوتھی سمت ۱۰۰/=
- چار درویش ۱۰۰/=
- کار مسلسل ۱۰۰/=
- تحریک مزاحمت ۸۰/=
- پس نقاب ۱۰۰/=
- شفتالو کا پیڑ ۱۰۰/=
- فساد قامت ۱۰۰/=
- حساب دشمناں ۸۰/=
- شاہ چور ۱۰۰/=
- خوابوں کے عذاب ۱۲۵/=

- تنگ آمد ۱۰۰/=
- آکاش بیل ۱۰۰
- نقاب چہرے =

کمانڈو سیریز پر ابو جواد کے بہترین ناول

- جودھ پور کا راکھشس ۱۵۰/=
- دیوا سنگھ کا سپوت ۱۲۵/=
- جے پور کے پوتر پاپی ۸۰/=

محمود احمد مودی

- لہو کا سراغ ۸۰/=
- سمندر ۱۵۰/=
- کنارہ ۱۵۰/=
- ہیرو ۸۰/=

طاہر جاوید مغل

- تاوان (۱۴ حصے) ۸۴۰/=
- اباقہ (دو جلدیں) ۵۰۰/=
- پرستش ۱۵۰/=
- الاؤ انگارے آنچ (انسپکٹر نواز خان) ۴۰/=
- آندھی (دو جلدیں) ۳۰۰/=
- نور کی یلغار (دو جلدیں) ۳۰۰/=
- تاباں ۲۰۰/=
- جستجو ۱۰۰/=
- فیصلہ ۱۰۰/=

ایم الیاس

- آفت ۱۸۰/=
- پراسرار شکاری ۱۰۰/=
- دشمن ۱۰۰/=

علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون: ۷۲۴۷۴۱۴